بازارِ حُسن

حصہ دوم



یہ کہنا غالباً صحیح نہیں ہے۔ کہ خدا سب کو کسی نہ کسی حیلہ سے رزق بھیجتا ہے، پنڈت اُما ناتھ بغیر کسی حیلہ کے دُنیا کی نعمتوں کا لطف اُٹھاتے تھے۔ اُن کے گھر میں بھینسیں اور گائیں نہ تھیں لیکن بچے دودھ کی کُلیاں کرتے تھے۔ وہ کھیتی باری نہ کرتے تھے۔ لیکن گھر میں غلہ کا انبار لگا رہتا تھا۔ گاؤں میں کہیں مچھلی مرے کہیں بکرا ذبح ہو۔ کہیں آم ٹوٹے۔ کہیں بھوج ہو۔ پنڈت اُما ناتھ کا حصہ بلا مانگے پوچھے آپ ہی آپ پہنچ جاتا تھا۔ امولا بہت بڑا موضع تھا۔ ڈھائی تین ہزار کی آبادی تھی۔ لیکن سارے گاؤں میں اُن کے مشورہ اور مدد کے بغیر کوئی کام انجام نہ پاتا تھا۔ عورتوں کو اگر زیور بنوانے ہوتے تو وہ اُما ناتھ سے کہتیں

لڑکے لڑکیوں کی شادیاں اُما ناتھ کی معرفت طے ہوتیں۔ رہن نامے و بیعنامے اُما ناتھ ہی کی صلاح سے لکھے جاتے۔ معاملے مقدمے اُنہیں کے توسل سے دائر ہوتے اور طرہ یہ کہ ان کا یہ رسوخ اور وقار انکی زمانہ سازی یا بھل منسی کی بدولت نہ تھا۔ گاؤں والوں کے ساتھ ان کا برتاؤ خشک اور روکھا ہوتا تھا۔ انکی زبان کی تلخی مشہور تھی۔ لیکن انکی تلخیوں کو لوگ دودھ کی طرح پیتے تھے۔ معلوم نہیں اُنکی شخصیت میں کیا راز۔ کیا جادو تھا۔ کوئی کہتا تھا۔ یہ اُن کا اقبال ہے۔ کوئی کہتا انہیں مہابیر کا ایشٹ ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ اُنکی قیافہ شناسی کا نتیجہ تھا، وہ جانتے تھے۔ کہ کہاں جھکنا اور کہاں تننا چاہیئے، گاؤں والوں سے تننے میں اپنی بہبود سمجھتے تھے۔ حکام سے جھکنے میں۔ تھانہ اور تحصیل کے عمال چپراسی سے لیکر افسر اعلیٰ تک سب ان پر مہربان تھے، تحصیلدار صاحب کیلئے وہ برش پھل بناتے، ڈپٹی صاحب کو آنیوالی ترقی کی خبر دیتے تھے۔ قانونگو، قرق امین، اور سیاہہ نویس تو ان کے دروازے پر بن بلائے مہمان بنے رہتے کسی کو تعویذ۔ اور جن لوگوں کو ان ڈھکوسلوں پر اعتقاد نہ تھا۔ انکی خاطر نورتن چٹنی اور میٹھے اچار سے کرتے تھے، تھانہ دار صاحب اُنہیں اپنا داہنا بازو خیال کرتے تھے۔ جہاں انکی دال نہ گلتی ہو۔ وہاں انکی بدولت پانچوں گھی میں ہو جاتی تھیں۔ بھلا ایسے ہمہ صفت موصوف آدمی کی گاؤں والے کیوں نہ پوجا کرتے!

اُما ناتھ کو گنگا جلی سے بہت محبت تھی۔ لیکن گنگا جلی کو میکے آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد معلوم ہو گیا۔ کہ بھائی کی محبت بھاوج کی سردمہری کی تلافی

نہیں کر سکتی، اُمانا تھ بہن کو اپنے گھرانے پر دل میں بہت بچھتاتے۔ وہ بیوی کو خوش رکھنے کے لئے اسکی ہاں میں ہاں ملا دیا کرتے تھے۔ گنگا جلی کو اب صاف کپڑے پہننے کا کیا حق ہے؟ شانتا کی پرورش پہلے چاہے کتنی ہی ناز و نعمت سے ہو۔ اب اُسے اُمانا تھ کی لڑکیوں سے برابری کرنے کا کیا مجاز تھا؟ اُمانا تھ بیوی کی ان کدورت آمیز باتوں کو سنتے اور اُنکی تائید کرتے۔ گنگا جلی اپنے غصہ و غم کا بخار بھائی ہی پر اُتارتی۔ وہ سمجھتی تھی۔ کہ یہ اپنی بیوی کو بڑھاوے دے کر میری یہ دُرگت کرا رہے ہیں۔ یہ اگر اس کو سختی سے ڈانٹ دیتے۔ تو مجال تھی۔ کہ وہ یوں میرے پیچھے پڑ جاتی، اُمانا تھ کو جب موقع ملتا۔ تو وہ گنگا جلی کو تخلیہ میں صورت حال سمجھا دیا کرتے۔ مگر ایک تو جاتھوی ایسے موقع ہی نہ آنے دیتی دوسرا گنگا جلی کو بھی ان کی بے اثر ہمدردی پر اعتبار نہ ہوتا۔

اس طرح ایک سال گزر گیا۔ گنگا جلی فکر غم اور یاس سے گھل گھل کر بیمار پڑ گئی۔ اُسے بخار آنے لگا۔ اُمانا تھ نے پہلے تو معمولی ادویات کا استعمال کرایا۔ لیکن جب اُن سے کچھ افاقہ نہ ہوا۔ تب انہیں فکر ہوئی۔ ایک روز جاتھوی کسی پڑوسن کے گھر گئی ہوئی تھی۔ اُمانا تھ بہن کے کمرہ میں گئے۔ وہ بیہوش پڑی ہوئی تھی۔ سینہ پھیپھڑا ہو رہا تھا۔ ساڑی پھٹ کر تار تار ہو گئی تھی۔ شانتا اس کے پاس بیٹھی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی، یہ دردناک نظارہ دیکھ کر اُمانا تھ رو پڑے۔ یہی عورت ہے۔ جسکی خدمت کے لئے دو دو لونڈیاں تھیں۔ آج اس کی یہ حالت ہو رہی ہے انہیں اپنی بے اعتنائی پر سخت افسوس ہوا، گنگا جلی کے سرہانے بیٹھ کر روتے ہوئے بولے "بہن یہاں لا کر میں نے تمہیں بہت تکلیف دی۔ میں نہیں جانتا

تھا۔ کہ اس کا یہ نتیجہ ہوگا۔ میں آج کسی وید کو لاتا ہوں۔ ایشور چاہیں گے تو تم جلد اچھی ہو جاؤ گی۔"

اتنے میں جاھنوی بھی آگئی۔ یہ باتیں اس کے کان میں پڑ گئیں۔ بولی" ہاں ہاں دوڑو۔ بید کو بلاؤ۔ نہیں تو قیامت آجائیگی۔ ابھی پچھلے دنوں مجھے مہینوں بخار آتا رہا۔ تب بید کے پاس نہ دوڑے تھے۔ میں بھی لحاف اوڑھ کر پڑ رہتی تو تمہیں معلوم ہوتا۔ کہ اسے کچھ ہوا ہے۔ لیکن میں کیسے پڑ رہتی۔ گھر کی چکی کون پیستا؟ میرے نصیب میں یہ سکھ کہاں"؟

اُمانا تھ کا حوصلہ پست ہوگیا۔ وید کو بلانے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر وید کو نہ بلایا۔ تو گنگا جلی جو دو چار مہینے میں مرنیوالی ہو۔ تو دو چار دن ہی میں چل بسے گی۔

گنگا جلی کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی۔ یہانتک کہ اُسے اسہال کا مرض ہوگیا۔ زندگی کی اُمید منقطع ہوگئی۔ جس معدہ میں ساگو دانہ ہضم کرنیکی بھی طاقت نہ ہو۔ سوجو کی روٹیاں کیونکر ہضم کرتا بالآخر اس کا تن زار ان تکلیفوں کو اور نہ برداشت کرسکا۔ چھ مہینہ بیمار رہ کر وہ دُکھیا مرگ مفاجات کا لقمہ بن گئی۔

شانتا کا اب دنیا میں اپنا کوئی نہ تھا سُمن کے پاس اُس نے دو خط لکھے۔ پر وہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔ شانتا نے سمجھا۔ بہن نے ناتا توڑ دیا۔ مصیبت میں کون کس کا ہوتا ہے؟ جب تک گنگا جلی زندہ تھی۔ شانتا اُس کے آنچل میں مُنہ چھپا کر رو لیا کرتی تھی۔ اب وہ سہارا بھی نہ رہا۔ اندھے کے ہاتھ سے لکڑی چھن جاتی رہی۔ شانتا اب اپنے کمرہ کی دیواروں سے لپٹ کر روتی۔ لیکن دیوار ... اور

ماں کے آنچل میں بڑا فرق ہے۔ ایک ٹھنڈی ہواؤں سے لہراتی ہوئی ندی ہے دوسرا آتشیں غبار سے بھرا ہوا ریگستان!

شانتا کو اب کہیں تسکین نہیں۔ اس کا دل آگ کی طرح جلا کرتا ہے۔ وہ اپنے ماموں اور ممانی کو اپنی ماں کا قاتل سمجھتی ہے۔ جب گنگا جلی زندہ تھی تب شانتا اُسے ممانی کے کلام تیز سے بچانے کے لئے کوشاں رہتی تھی۔ وہ باغدوئی کے ذرا سے اشارے پر دوڑتی تھی۔ کہ کہیں وہ اماں کو کچھ کہہ نہ بیٹھیں ایک بار گنگا جلی کے ہاتھوں سے گھی کی ہانڈی گر پڑی شانتا نے ممانی سے کہا یہ میرے ہاتھوں سے چھوٹ پڑی۔ اس پر اُس نے خوب گالیاں کھائیں وہ جانتی تھی۔ کہ ماں کا دل طعنہ کی چوٹ نہیں سہہ سکتا +

لیکن اب شانتا کو وہ خوف نہیں ہے۔ وہ بیکس ہو کر دلیر ہو گئی ہے اس میں اب وہ تحمل نہیں ہے۔ اُسے جلد غصہ آ جاتا ہے وہ جلی کٹی باتوں کا اکثر جواب بھی دے دیتی ہے۔ اس نے اپنے دل کو سخت سے سخت تعزیر کے لئے تیار کر لیا ہے۔ ماموں سے وہ دبتی ہے لیکن ممانی سے مطلق نہیں دبتی۔ اور ممیری بہنوں کو ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہے + اس کی حالت اب اُس گائے کی سی ہے۔ جو گئو ہتیا کے خوف کے بل پر دوسروں کا کھیت چرتی ہے +

اس طرح ایک سال اور گزر گیا۔ اُما ناتھ نے بڑی دوڑ دوش کی کہ اس کی شادی کر دیں۔ لیکن جتنا سستا سودا وہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہیں طے نہ ہوا۔ انہوں نے تھانہ اور تحصیل سے دو سو روپیہ کا چندہ فراہم کر لیا تھا۔ مگر

اتنے سستے بر کہاں ہے؟ جو تھوی کا بس چلتا۔ تو وہ شانتا کو کسی نکھٹو کے گلے مڑھ کر قضیہ پاک کرتی۔ لیکن اُما ناتھ نے ابکی اپنی متاہل زندگی میں پہلی بار اس سے اختلاف کیا۔ اور شانتا کے لئے ایک لائق اور موزوں بر تلاش کرتے رہے۔ گنگا جلی کو اپنی کمزوری پر قرباں کر کے اب وہ کچھ جری ہو گئے تھے ٭



رفاہ عام کی تحریکیں بھی ممتاز آدمیوں کی محتاج ہوتی ہیں۔ اگرچہ بیٹھل داس کے پیرووں کی کمی نہ تھی۔ لیکن ان میں زیادہ تر عوام تھے۔ خواص ان سے محترز رہتے تھے۔ پدم سنگھ کے شریک ہوتے ہی اس تحریک میں جان سی پڑ گئی۔ ندی کی پتلی دھار امڈ پڑی۔ معززین میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ لوگ اس پر کچھ کچھ اعتبار کرنے لگے ٭

پدم سنگھ تنہا نہ آئے۔ اکثر کسی کام کو مفید سمجھ کر بھی ہم اس میں ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ نکو بن جانے کا خوف دامنگیر رہتا ہے۔ ہم بڑے آدمیوں کے آ ملنے کا انتظار کیا کرتے ہیں۔ جوں ہی کسی نے راستہ کھولا۔ ہماری ہمت بندھ جاتی ہے۔ ہم کو تضحیک یا انگشت نمائی کا خوف نہیں رہتا۔ اکیلے ہم اپنے گھر میں بھی ڈرتے ہیں۔ دو ہو کر جنگل میں بھی بے خوف ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر رمیش دت۔ لالہ بھگت رام اور مسٹر رستم بھائی خفیہ طور پر بیٹھل داس کی اعانت کرتے رہتے تھے۔ اب وہ کھل پڑے۔ معاونین کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی ٭

بیٹھل داس اصلاح تمدن کے معاملے میں نرم گوئی کو بالکل بے موقع سمجھتے تھے

اس لئے انکی باتیں لوگوں کو ناگوار گزرتیں۔ میٹھی نیند سونے والوں کو انکی صدا تلخ زہر معلوم ہوتی تھی۔ پر بھٹل داس کو اس کی پروانہ تھی۔

پدم سنگھ دُھن کے پورے آدمی تھے۔ اُنہوں نے بڑے جوش سے بازار حُسن کے اخراج کی تحریک شروع کی۔ میونسپلٹی کے اراکین میں دو چار اصحاب بھٹل داس کے معتقد بھی تھے۔ لیکن ان میں اس تحریک کو عملی صورت میں لانیکی جرأت نہ تھی۔ مسئلہ اتنا مشکل اور پیچیدہ تھا۔ کہ اس کا خیال ہی لوگوں کے حوصلے توڑ دیتا تھا۔ وہ سوچتے اس تجویز کو زیر بحث لانے سے معلوم نہیں شہر میں کیا کہرام مچے۔ شہر کے کتنے ہی رئوسا۔ کتنے ہی حکام۔ کتنے ہی تجار بازار حُسن سے تعلق رکھتے تھے۔ کوئی قدردان تھا۔ کوئی گاہک۔ کوئی جوہری۔ کوئی دلّال۔ اس جم غفیر سے بیر مول لینے کی کون جرأت کرتا۔ میونسپلٹی کے اراکین اُن کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔

پدم سنگھ نے ممبروں سے مل مل کر انکی توجہ اس مسئلہ کی طرف معطوف کی۔ پربھاکر راؤ کی جادو نگاریوں کا خاص اثر ہُوا۔ پمفلٹ نکالے گئے۔ اور عوام کو بیدار کرنے کے لئے تقریروں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ رمیش دت اور پدم سنگھ فن تقریر میں مشاق تھے۔ اس کا بار انہوں نے اپنے سر لے لیا۔ تحریک نے باقاعدہ منضبط صورت اختیار کی۔

پدم سنگھ نے یہ مسئلہ چھیڑ تو دیا۔ پر وہ اس پر جتنا بھی غور کرتے تھے اتنے ہی اور مایوس ہو جاتے تھے۔ اُنہیں یقین نہ آتا تھا۔ کہ کسبیوں کے اخراج سے مطلوبہ نتائج پیدا ہوں گے۔ ممکن ہے۔ فایدہ کی جگہ نقصان ہو۔ وہ سوچتے۔

کہ بُرائیوں کا بہترین سدباب انسان کا اخلاقی احساس ہے۔ اس کے سوا، اور کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کبھی کبھی سوچتے سوچتے انہیں وحشت سی ہونے لگتی۔ لیکن اس تحریک کے ایک رُکن خاص بنکر وہ اپنے شکوک کا اظہار نہ کر سکتے تھے۔ عوام کے روبرو تو اُنہیں اصلاح قوم کا چرچا کرتے ہوئے کوئی تکلف نہ تھا۔ لیکن اپنے احباب اور ہمجنسوں کے سامنے آتے ہوتے اُنہیں بہت جھجھک ہوتی تھی۔ یہ ان کے لئے سخت امتحان تھا۔ کوئی کہتا "اجی کس پھیر میں پڑے ہو۔ کیا بھلا اس کے چکر میں تم بھی آگئے کیا۔ چین سے زندگی کا لطف اُٹھاؤ۔ ان جھمیلوں میں پڑکر کیوں مٹی خراب کرتے ہو۔ کوئی کہتا یار معلوم ہوتا ہے۔ کسی حسینہ نے تمہیں چرکا دیا ہے۔ تبھی تم اُن کے پیچھے اس طرح پڑے ہو۔ ایسے دوستوں کے سامنے فلاح اور رفاہ کی گفتگو کرنا اپنے تئیں نشانۂ ظرافت بنانا تھا۔ دوران تقریر میں بھی جب شرما جی جذبات کو متحرک کرنے کی کوشش کرتے۔ تو انہیں الفاظ نہ ملتے۔ اور ملتے بھی تو انہیں زبان سے نکالتے ہوئے شرما جی کو بہت تامل ہوتا۔ فی الواقع ابھی تک شعلۂ درد اُن کے دل تک نہ پہنچا تھا۔ وہ جب اپنی بےحسی پر غور کرتے۔ تو انہیں معلوم ہوتا تھا۔ کہ میرا دل ابھی تک اس نشہ میں سرشار نہیں ہوا۔

کوئی تقریر ختم کر چکنے کے بعد شرما جی کو یہ جاننے کی اتنی خواہش نہ ہوتی تھی۔ کہ حاضرین پر اس کا کیا اثر ہوا۔ جتنی یہ جاننے کی کہ تقریر مدلل۔ فصیح۔ اور پُرجوش تھی یا نہیں۔

لیکن ان خیالوں کے باوجود یہ تحریک روز بروز پھیلتی جاتی تھی۔ یہ کامیابی شرما جی کے لئے یقین اور سوز باطن سے کچھ کم ہمت افزا نہ تھی۔

سدن سنگھ کی شادی کو ابھی دو ماہ تھے۔ خانگی تفکرات سے آزاد ہو کر شرما جی اس تحریک میں دل وجان سے منہمک ہو گئے۔ کچہری کے کاموں میں اُن کا جی نہ لگتا تھا۔ وہاں بھی وہی چرچے رہتے۔ ایک ہی مسئلہ پر متواتر غور و خوض کرتے رہنے سے اس سے ایک عشق سا ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ شرما جی کے دل میں شعلہ محبت روشن ہونے لگا۔

لیکن جب شادی کے دن قریب آ گئے تو پدم سنگھ کو ایک ضعف کا احساس ہونے لگا۔ دل میں سوال پیدا ہوا۔ کہ بھائی صاحب شادی کے لئے طائفوں کو طے کرنے کا بار مجھی پر رکھیں گے۔ اسوقت میں کیا کروں گا؟ ناچ کے بغیر مجلس بے رونق ہو گی۔ دور دور سے لوگ ناچ دیکھنے کیلئے آئیں گے۔ اُنکی ضیافت طبع کیلئے کوئی سامان ہونا ضروری ہے۔ لوگ ایسے موقع پر ناچ کے عادی ہیں۔ یہ نہ ہُوا۔ تو کچھ بھی نہ ہُوا۔ ایسی حالت میں میرا کیا فرض ہے؟ بھائی صاحب کو اس مذموم رسم کی پیروی سے روکنا چاہئے۔ لیکن کیا میں اس امر محال میں کامیاب ہو سکونگا؟ بزرگوں کے روبرو اصول اور اخلاق کی تقریر بے موقع معلوم ہوتی ہے اُن کے دل میں بڑے بڑے حوصلے ہیں۔ ان کے پورے ہونے میں کچھ بھی کسر رہ گئی۔ تو انہیں ملال ہو گا۔ لیکن کچھ بھی ہُوا۔ میرا فرض تو یہی ہے۔ کہ اپنے اصول پر ثابت رہوں۔

اگرچہ شرما جی کو معلوم تھا۔ کہ میری اصول پسندی کے قدردان بہت کم ہوں گے بیشتر لوگ میرے مخالف ہی نکلیں گے۔ لیکن اُنہیں جذبہ عام کے سامنے سر جھکانا

غایت درجہ کی کمزوری معلوم ہوئی۔ انہوں نے طے کر لیا۔ کہ ناچ کا انتظام نہ کروں گا۔ جب اپنے گھر ہی میں اصلاح نہ کر سکا۔ تو دوسروں کے اصلاح کی سعی ابلہ فریبی سے کم نہیں۔

دل میں یہ مصمم ارادہ کر کے شرما جی مجلس کے اور سامان جمع کرنے لگے۔ وہ ایسے خوشی کے موقع پر بخل کو بالکل غیر مناسب سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اُن کا منشا یہ بھی تھا۔ کہ آرائش اور نفاست کے سامان اسقدر جمع کر دوں۔ کہ ناچ کی کمی پوری ہو جائے اور کسی کو یہ گمان نہ ہو۔ کہ کفایت کے خیال سے یہ روش اختیار کی گئی ہے۔ ایک روز بٹھل داس نے آکر فرش فروش اور آلات نادرہ کا ایک انبار لگا ہوا دیکھا۔ تو حیرت میں آ گئے۔ پوچھا۔ "ان تیاریوں میں آپ کا کیا صرف ہوا ہو گا؟"

شرما۔ اس کا حساب واپسی پر ہو گا۔

بٹھل۔ تب بھی دو ہزار سے کم تو نہ ہوں گے۔

شرما۔ ہاں شاید کچھ اس سے زیادہ ہی ہو۔

بٹھل۔ اتنے روپے آپ نے پانی میں ڈال دیئے۔ کسی کار خیر میں صرف کرتے۔ تو اس سے قوم کو کتنا فایدہ ہوتا۔ جب آپ جیسے روشن خیال اصحاب اس صرف بیجا کو روا رکھتے ہیں۔ تو دوسروں سے کیا اُمید کی جائے؟

شرما۔ اس معاملہ میں مَیں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ جسے پرماتما نے توفیق دی ہو۔ اُسے خوشی کی تقریبوں میں دل کھول کر صرف کرنا چاہیئے۔ ہاں قرض لیکر نہیں۔ گھر بیچکر نہیں۔ صرف اپنی حیثیت دیکھ کر۔ دل کی امنگ ایسے موقع پر بھی نہ نکلے گی۔ تو کب نکلے گی!

بٹھل۔ آپکے قیاس میں ڈاکٹر شیاما چرن کی حیثیت دس پانچ ہزار روپے صرف کرنے کی ہے یا نہیں؟

شرما۔ اس سے بہت زیادہ ÷

بٹھل۔ مگر ابھی اپنے بڑے لڑکے کی شادی میں انہوں نے کتنی کفایت کی۔ ناچ۔ تماشہ۔ باجا۔ گاجا۔ باغ بغیچہ کسی کا پتہ نہ تھا ÷

شرما ہاں ان فضول کاریوں میں انہوں نے بڑی کفایت کی۔ لیکن اسکی کسر دعوتوں میں نکل گئی۔ بلکہ اُس سے کہیں زیادہ صرف ہوگیا۔ انکی کفایت کا کیا نتیجہ ہُوا؟ عوام کو اس سے کوئی فیض نہ پہنچا۔ بلکہ جو روپے غریب باجے والے۔ آتشباز۔ گُل تراش اور فراشوں کے ہاتھ لگتے۔ وہ "مری کمپنی" اور "ہوائٹ وے لیڈ لا کمپنی" کے نذر ہوگئے۔ میں اسے کفایت نہیں کہتا۔ یہ غربا کی حق تلفی ہے ÷



رات کے ۹ بجے تھے۔ پدم سنگھ اپنے بھائی کیساتھ بیٹھے ہوئے شادی کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔ کل بارات جائیگی۔ دروازہ پر شہنائی بج رہی تھی۔ اور اندر منگل گانا ہو رہا تھا۔ برامدے میں چارپائیوں کی لمبی قطار بچھی ہوئی تھی اُن پر اہل نوید پڑے خراٹے لیتے تھے ÷

مدن سنگھ نے پوچھا "تم نے جو گاڑیاں بھیجی ہیں۔ وہ کل شام تک امولا پہنچ جائینگی؟"

پدم سنگھ۔ جی نہیں دوپہر تک ہی پہنچ جائینگی۔ امولا بندھیاچل کے قریب ہے آج میں نے دوپہر کے قبل ہی انہیں روانہ کر دیا ÷

مدن۔ تو یہاں سے کیا کیا سامان لے چلنے کی ضرورت ہے؟

پدم۔ میرے خیال میں مجلسی سامان کی آپ کو مطلق ضرورت نہ ہوگی۔ ہاں کچھ کھانے پینے کی چیزیں لیتے چلئے۔ ممکن ہے وہاں کے ملنے میں دیر ہو۔ تو ناحق تکلیف ہوگی۔

مدن۔ ناچ کتنے پر طے ہوا؟ دو ہی طائفے ہیں نہ؟

پدم سنگھ کا رنگ فق ہوگیا۔ ناطقہ بند ہوگیا، وہ ڈر رہے تھے۔ کہ یہ سوال ہوا ہی چاہتا ہے۔ شرم سے سر جھکا لیا۔ اور دبی زبان سے بولے۔ "جی ناچ تو میں نے نہیں طے کیا"۔

مدن سنگھ چونک پڑے۔ جیسے کسی نے زور سے چٹکی کاٹ لی ہو۔ اور بولے خوب! تم نے تو ڈونگا ہی ڈبا دیا۔ پھر تم نے جنواسے کا کیا انتظام کیا ہے؟ کیا فرصت ہی نہیں ملی۔ یا خرچ سے ہچک گئے؟ میں نے تو اس لئے چار دن پہلے سے تمہیں اطلاع دیدی تھی۔ جو شخص برا ہمن کو نیوتہ دیتا ہے۔ وہ اُسے دکشنا دینے کا بھی بوتا رکھتا ہے۔ اگر تمہیں خرچ کا خیال تھا۔ تو مجھے صاف صاف لکھ دیتے۔ میں یہاں سے روپے بھیجدیتا۔ ابھی نارائن کی دیا سے کسی کا محتاج نہیں ہوں۔ اب بھلا بتاؤ کیا انتظام ہو سکتا ہے؟ منہ میں کالکھ لگی یا نہیں؟ ایک بھلے مانس کے دروازے پر جا رہے ہو۔ وہ اپنے دل میں کیا کہے گا؟ اسکے عزیز واقربا دور دور سے نویدمیں آتے ہونگے۔ دور دور کے گاؤں کے لوگ بارات میں شریک ہونے کے لئے آئیں گے۔ وہ سب اپنے دل میں کیا کہیں گے؟ رام رام!!

منشی بیجناتھ گاؤں میں ۳ کے حصہ دار تھے۔ مدن سنگھ کی طرف پُر معنی انداز

مے دیکھ کر بولے" دل میں نہیں جناب کھول کھولکر کہیں گے۔ تالیا دیں گے۔ مُنہ پر صلواتیں سُنائیں گے۔ کہیں گے۔ نام بڑے۔ درشن تھوڑے۔ سارے قرب جوار میں ناموس ہو جائیگی۔ ناچ کے بغیر بھی کہیں مجلس ہوتی ہے۔ کم سے کم میں نے تو کبھی نہیں دیکھی۔ شاید بھیا کو خیال ہی نہیں رہا۔ یا ممکن ہے لگن کی تیزی سے انتظام نہ ہو سکا ہو"۔

پدم سنگھ نے ندامت سے کہا "جی نہیں یہ بات تو نہیں ہے . . . "

مدن۔ تو پھر کیا بات ہے؟ تم نے اپنے دل میں بھی سوچا ہوگا۔ کہ سارا بار مجھی پر پڑے گا۔ پر میں تم سے از روئے ایمان کہتا ہوں۔ کہ میں نے اس خیال سے نہیں نہیں لکھا تھا۔ میں دوسروں کے ماتھے پھلوڑیاں کھانے کا شوق نہیں کرتا"

پدم سنگھ بھائی کی یہ ملامت آمیز باتیں نہ برداشت کر سکے۔ آنکھیں بھر آئیں۔ بولے "بھیا۔ ایشور کے لئے آپ میری نسبت ایسا خیال نہ کریں۔ اگر میری جان بھی آپکے کام آسکے۔ تو مجھے اُس کے دیدینے میں مطلق دریغ نہ ہوگا۔ مجھے اسکی دلی تمنا ہے۔ کہ آپ کی کوئی خدمت کر سکوں۔ یہ خطا مجھ سے محض اسلئے ہوئی ہے۔ کہ آج کل شہر میں لوگ ناچ کے رواج کو معیوب سمجھنے لگے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں اس رواج کی سخت مخالفت ہو رہی ہے۔ اور میں بھی اس تحریک میں شریک ہو گیا ہوں۔ اپنے اصول کے خلاف عمل کرنیکی مجھے ہمت نہ ہوئی"۔

مدن۔ اچھا یہ بات ہے! بھلا کسی طرح لوگوں کی آنکھیں تو کھلنے لگیں میں بھی ذاتی طور پر اس رسم کو معیوب سمجھتا ہوں۔ لیکن بھئی نکّو نہیں بننا چاہتا۔

جب سب لوگ چھوڑ دیں گے۔ میں بھی چھوڑ دوں گا۔ مجھی کو ایسی کیا غرض پڑی ہے۔ کہ سب کے آگے آگے ہوں۔ میرے ایک ہی لڑکا ہے۔ اسکی شادی میں دل کا کوئی حوصلہ باقی نہیں رکھنا چاہتا۔ شادی کے بعد میں بھی تمہاری تحریک میں شامل ہو جاؤں گا۔ اسوقت مجھے اپنے پرانے طریق پر چلنے دو۔ جب ایشور تمہیں لڑکا دے۔ اور اسکی شادی کا موقع آئے۔ تو تم ان نئے رواجوں پر عمل کرنا۔ میں ذرا بھی کان نہ ہلاؤں گا۔ اگر بہت زیادہ تکلیف نہ ہو۔ تو صبح کی گاڑی سے چلے جاؤ۔ اور دونوں طائفے ساتھ لئے ہوئے امولا چلے آؤ۔ تم سے اس لئے کہتا ہوں۔ کہ تمہاری وہاں لوگوں سے شناسائی ہے۔ کفایت سے کام ہو جائے گا۔ دوسرے جائیں گے۔ تو لُٹ جائیں گے۔

پدم سنگھ نے سر جھکا لیا۔ اور سوچنے لگے۔ انہیں خاموش دیکھ کر مدن سنگھ نے تیور بدلے اور کہا "چُپ کیوں ہو؟ کیا جانا منظور نہیں؟"

پدم سنگھ نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے نہایت انکسار کے ساتھ کہا "بھیا اگر مجھے معاف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مدن سنگھ۔ نہیں نہیں میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ نہیں جانا چاہتے۔ تو مت جاؤ۔ منشی بیجناتھ۔ آپ کو تکلیف تو ہو گی۔ لیکن میری خاطر سے آپ ہی چلے جایئے۔

بیجناتھ۔ مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔

مدن سنگھ۔ صبح کی گاڑی سے جایئے شام تک امولا پہنچ جایئے۔ آپکا بہت ممنون ہوں گا۔

بیجناتھ۔ آپ اطمینان رکھیں۔ میں چلا جاؤں گا۔"
کچھ دیر تک تینوں آدمی خاموش بیٹھے رہے۔ مدن سنگھ اپنے بھائی کو احسان فراموش سمجھ رہے تھے۔ اسے اپنے لڑکے کی طرح پالا۔ اور آج ذراسی بات پر یہ نکل کھڑا ہوا۔ بیجناتھ کو اندیشہ ہو رہا تھا۔ کہ مدن سنگھ کی حمایت پدم سنگھ کو ناگوار تو نہ گزرے گی۔ اور پدم سنگھ اپنے بھائی کے عتاب کے خوف سے دبے ہوئے تھے۔ سر اُٹھانیکی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایک طرف بھائی کی ناراضگی کا خوف تھا۔ دوسری جانب حق اور اخلاق اور اصول کا خون۔ ایک طرف اندھیری گھاٹی تھی۔ اور دوسری جانب سیدھی چٹان۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ برادرانہ سعادتمندی اور قومی فرض میں کشمکش ہو رہی تھی۔ میں بھائی صاحب کی گود میں کھیلا ہوں۔ ان کے ہاتھوں پلا ہوں۔ یہ جسم ان کا ہے ضمیر کا خون کرنا میرے امکان سے باہر ہے۔ لیکن ضمیر کیا ہے؟ محض حالات گرد و پیش کا مرقعہ۔ ان اثرات کے قبول کرنیکی صلاحیت مجھ میں کہاں سے آئی! یہ اس تعلیم کی برکت ہے۔ جو بھائی صاحب ہی کے طفیل مجھے حاصل ہوئی ہے انکی رضامندی کے مقابلہ میں میرے ضمیر کی کیا ہستی ہے؟ میرا نام میری شہرت، میری اصول پسندی کیا چیز ہے؟ یہ میری کم ظرفی ہے۔ جو اصول کی آڑ لے رہی ہے۔ یہ کلنک اپنے اوپر نہ لگاؤں گا۔ انکی خاطر مجھے اصول اور ضمیر سے زیادہ عزیز ہے۔ لیکن ایکبار کیوں نہ پھر انہیں سمجھانیکی کوشش کروں؟ اگر مان گئے۔ تو فبہا۔ ورنہ بے عذر ان کے حکم کی تعمیل کروں گا۔"
یوں دل میں فیصلہ کر کے انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ بھائی صاحب!

آپ نے میری بہت سی نادانیاں معاف کی ہیں۔ میری ایک گستاخی لِلّٰہ معاف کیجئے۔ آپ جب ناچ کی رسم کو معیوب سمجھتے ہیں۔ تو اس پر اس قدر زور کیوں دیتے ہیں؟"

مدن سنگھ جھنجھلا کر بولے "تم تو ایسی باتیں کرتے ہو۔ گویا اس دیس میں پیدا ہی نہیں ہوئے۔ کسی غیر ولایت سے آئے ہوئے ہو۔ ایک یہی کیا کتنے ہی ایسے رسوم ہیں جنہیں معیوب سمجھ کر بھی انکی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ نہ کرو تو عزت میں بٹہ لگتا ہے۔ گالی گانا کونسی اچھی بات ہے؟ جہیز لینا کونسی اچھی بات ہے؟ لیکن لوگ ریت پر نہ چلو۔ تو لوگ ہنسی اُڑاتے ہیں۔ ناچ نہ لیجاؤں تو لوگ یہی کہیں گے۔ کہ کنجوسی کے مارے نہیں لائے۔ میری نیت کو کون دیکھتا ہے؟"

پدم سنگھ۔ اچھا اگر اِسی رقم کو کسی دوسرے مناسب طریق پر خرچ کر دیجئے تب تو کسی کو کنجوسی کی شکایت نہ رہے گی۔ آپ دو طائفے لے جانے چاہتے ہیں۔ آج کل لگن تیز ہے۔ تین سو روپیہ سے کم صرفہ نہ ہو گا۔ اگر آپ تین سو کی جگہ پانچسو کے کمبل لیکر اموا کے غربا کو بانٹ دیجئے۔ تو کیسا ہو؟ کم سے کم دو سو آدمی آپ کو دُعائیں دیں گے۔ اور جب تک کمل کا ایک دھاگا بھی باقی رہے گا۔ آپ کا جس گائیں گے۔ اگر یہ منظور نہ ہو۔ تو اُس جوار میں اسی روپے سے ایک پختہ کنواں بنوا دیجئے۔ اس سے آپ کا نام ہمیشہ کے لئے برقرار رہے گا۔ اِس کا بار میرے اوپر رہے گا۔

مدن سنگھ نے بدنامی کا جو سہارا لیا تھا۔ وہ ان تجویزوں کے سامنے

قائم نہ رہ سکا، وہ اس کا کوئی جواب سوچ رہے تھے۔ کہ منشی بیج ناتھ جو اس وقت باوجود پدم سنگھ کی ناراضگی کے خوف کے اپنی جودت و فراست کے اظہار سے باز نہ رہ سکتے تھے بولے "بھیّا۔ ہر ایک کام کے لئے موقع اور محل ہوتا ہے جشن کے موقعہ پر جشن۔ خیرات کے موقعہ پر خیرات۔ بے موقعہ بات کبھی بھلی نہیں لگتی اور پھر شہر کے واقف کار آدمی ہوں۔ تو ایک بات بھی ہے، دیہات کے اُجڈ کندۂ ناتراش زمینداروں کے سامنے آپ کمّل تقسیم کرنے لگیں گے۔ تو وہ تعجب سے آپ کا منہ دیکھیں گے۔ اور ہنسیں گے"۔

مدن سنگھ لاجواب ہوگئے تھے۔ منشی بیجناتھ کی اس باموقعہ امداد سے بہت خوش ہوئے۔ انکی طرف احسان مندانہ نگاہ سے دیکھ کر بولے "ہاں اور کیا ہوگا؟ بسنت میں ملار گانیوالے کو کون اچھا کہیگا؟ بے وقت کی راگنی کبھی بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ اسی سے تو کہتا ہوں۔ کہ آپ سویرے چلے جایئے۔ اور دونوں ڈیرے طے کر آیئے"۔

پدم سنگھ نے سوچا۔ یہ لوگ اپنے من کی تو کریں ہی گے۔ پر دیکھوں کن دلیلوں سے اپنے دعوے کو ثابت کرتے ہیں۔ انہیں یہ ملال بھی ہوا۔ کہ بھائی صاحب منشی بیجناتھ پر مجھ سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ دلیر ہو کر بولے "تو یہ کیونکر مان لیا جائے۔ کہ شادی جشن ہی کا موقعہ ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں ثواب اور خیرات کا اس سے بہتر اور کوئی موقعہ نہ ہوگا۔ شادی ایک مقدس فرض ہے۔ ایک روحانی معاہدہ ہے۔ جب ہم دنیاوی ذمہ داریوں میں قدم رکھتے ہیں۔ جب ہمارے پیروں میں علائق دنیا کی بیڑی پڑتی ہے۔ جب ہم فرائض اور پابندیوں کے آگے اپنے سر جھکاتے

ہیں۔ ایسی پاک رسم کا احترام کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس موقعہ پر ہم کو متانت سے کام لینا چاہئے۔ یہ کتنی بیرحمی ہے۔ کہ جبوقت ہمارا ایک عزیز ایسا اٹل برتتے رہا ہو۔ ہم جشن منانے بیٹھیں۔ وہ ان فرائض کے بارِ عظیم سے دباجاتا ہو۔ اور رقص و سرود کی مجلس آراستہ کریں۔ اگر آج کل بد قسمتی سے یہ اُلٹی بات رائج ہوگئی ہے۔ تو کیا یہ ضروری ہے۔ کہ ہم بھی اسی لکیر کے فقیر بنیں۔ تعلیم کا کم سے کم اتنا اثر تو ہونا چاہئے۔ کہ مذہبی معاملات میں ہم جہلا کی خوشی کو مقدم نہ سمجھیں!

بیجناتھ زمین کی طرف تاکنے لگے۔ مدن سنگھ نے آسمان کی طرف تاکا۔ پدم سنگھ کی تقریر انہیں بالکل برحق معلوم ہوتی تھی۔ پر رواج کے سامنے سچائی۔ حق اور اصول کسی کی نہیں چلتی۔ انہیں خوف تھا۔ کہ اب بیجناتھ کچھ جواب نہ دے سکیں گے لیکن منشی جی ابھی ہار نہیں ماننا چاہتے تھے۔ بولے۔ "بھیا تم وکیل ہو۔ تم سے بحث کرنے کی لیاقت مجھ میں کہاں ہے؟ لیکن جو بات سناتن سے ہوتی چلی آئی ہے۔ اس کے مٹانے میں بدنامی ضرور ہوتی ہے۔ خواہ وہ مناسب ہو یا غیر مناسب۔ آخر ہمارے بزرگ نرے جاہل جٹ تو تھے نہیں۔ انہوں نے کچھ سمجھ کر ہی اس رواج کی بنیاد ڈالی ہوگی"۔

مدن سنگھ کو یہ دلیل نہ سوجھی تھی۔ بہت خوش ہوئے۔ بیجناتھ کی طرف قدردانہ انداز سے دیکھ کر بولے۔ "ضرور! انہوں نے جو رسمیں نکالی ہیں۔ ان سبھوں میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ چاہے وہ آج ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ آج کل کے نئے خیال والے حضرات اُن رسموں کے مٹانے میں اپنی بڑائی سمجھتے ہیں۔ اپنے سامنے بزرگوں کی کوئی حقیقت ہی نہیں سمجھتے۔ حالانکہ ہمارے پاس

جو عزت و حرمت۔ علم و شعور ہے۔ وہ سب انہیں بزرگوں کی کمائی ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ جنیو پہننے سے کیا فائدہ! کوئی چوٹی کی جڑ کاٹنے پر تلا ہوا ہے۔ کوئی اسی دھن میں ہے۔ کہ شودر اور چانڈال سب چھتری ہو جائیں۔ کوئی ودھواؤں کی شادی کے راگ الاپتا پھرتا ہے اور تو اور کچھ ایسے حضرات بھی ہیں۔ جو ذات اور برن کو بھی مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے۔ کہ جب یہ تفریق نہ رہیگی تو سارے ہندوستان میں اتفاق اور اتحاد کی سلطنت قائم ہو جائیگی۔ تو بھئی یہ سب باتیں ہمارے قابو کی نہیں ہیں جو انہیں ماننا ہو مانے اسے مبارک ہو ہمکو تو وہی اپنی پرانی روش پسند ہے۔ اگر زندہ رہا تو دیکھوں گا۔ کہ یورپ کا پودا یہاں کیا کیا گل کھلاتا ہے، ہمارے بزرگوں نے کھیتی کو سب سے اعلیٰ پیشہ کہا ہے۔ لیکن آج کل یوروپ کی دیکھا دیکھی لوگ مل اور مشینوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ پر دیکھ لینا ایسا کوئی دن آئیگا۔ کہ یوروپ والے خود چیتیں گے۔ اور مل کھود کر کھیت بنائیں گے۔ آزاد کاشتکار کے سامنے کارخانہ کے مزدوروں کی کیا ہستی ہے؟ وہ بھی کوئی ملک ہے۔ جہاں باہر سے کھانے کی چیزیں نہ آئیں۔ تو لوگ بھوکوں مریں۔ جن ملکوں میں زندگی کے ایسے الٹے طریق رائج ہوں۔ وہ ہمارے لئے کبھی نمونہ نہیں بن سکتے۔ صنعت اور حرفت کی یہ قدر اسی وقت تک ہے جب تک دنیا میں کمزور اور غیر محفوظ قومیں موجود ہیں۔ اُن کے گلے سستا مال مڑھ کر یوروپ والے چین کرتے ہیں۔ سنگین کی نوک پر اپنی جنسیں بیچتے ہیں۔ پر جونہی یہ قومیں بیدار ہونگی۔ یوروپ کا اقتدار خاک میں مل جائے گا۔ اسکی ثروت اور حشمت تحت الثریٰ میں پہنچ جائیگی، ہم یہ نہیں کہتے۔ کہ یوروپ والوں سے کچھ

مت سیکھو۔ نہیں وہ آج دنیا کے مالک ہیں۔ اور ان میں بہت سی خوبیاں ہیں اُنکی خوبیوں کو لے لو۔ بُرائیوں کو چھوڑ دو۔ اُن سے جفاکشی سیکھو۔ پر تکلف پسندی نہیں۔ اُن سے مستقل مزاجی سیکھو۔ پر رعونت نہیں۔ انکی تقلید کر کے زندگی کی ضرورتیں مت بڑھاؤ۔ نفس کے غلام مت بنو۔ خود غرضی کا کلمہ مت پڑھیے غریبوں کو مت کچلو۔ ہمارے اپنے رسم و رواج ہمارے حالات اور ضروریات کے موافق ہیں۔ اُن میں پیوند لگانے کی ضرورت نہیں"۔

مدن سنگھ نے یہ باتیں کچھ ایسی اہمیت کی شان سے کیں۔ گویا کوئی عالم اپنے علمی انکشافات بیان کر رہا ہے۔ حالانکہ ان کا ماخذ سُنی سُنائی باتوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جن کا مطلب وہ خود بھی نہ سمجھتے تھے۔ پدم سنگھ نے فلسفیانہ صبر کے ساتھ سُنا۔ اور اس خوف سے کہ کہیں یہ مباحثہ مجادلہ کی صورت نہ اختیار کرے۔ جسکے آثار نظر آ رہے تھے۔ اسے ختم کرنا ہی مناسب سمجھا۔ بہت ملائمت سے بولے"۔ جی ہاں آپ کا یہ فرمانا بہت صحیح ہے۔ کہ ہم لوگوں کو یورپ کی کورانہ تقلید نہ کرنی چاہیئے۔ لیکن معاف کیجئے گا۔ ہمارے یہاں کا نظام تمدن جس وقت قائم کیا گیا تھا۔ اسوقت سے اب تک تاریخ میں بہت کچھ انقلاب ہو گیا ہے۔ اور اُن انقلابوں کا اثر ہماری معاشرت اور اخلاق پر پڑنا لازمی تھا۔ مگر میں اسوقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اگر آپ کا ارشاد ہے۔ تو میں صبح کی گاڑی سے چلا جاؤں گا۔ اور طائفے طے کر لاؤں گا۔ منشی جی کو کیوں تکلیف دیجیے گا۔ ان کے چلے جانے سے یہاں کتنے ہی کام پڑے رہ جائیں گے۔ آیئے بھائی صاحب۔ ہم دونوں آدمی باہر چلیں۔ مجھے آپ سے ابھی کچھ

باتیں کرنی ہیں ٭

مدن سنگھ۔ تو یہیں کیوں نہیں کرتے ؟ کہو تو میں ہی اُٹھ جاؤں ؟

پدم سنگھ۔ جی نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ پر یہ باتیں ہیں منشی جی سے اپنے اطمینان کے لئے کر رہا ہوں، بھائی صاحب بتائیے۔ امولا میں تماشائیوں کی تعداد کتنی ہوگی ؟ کوئی ایک ہزار ؟

بیجناتھ نے سنبھل کر جواب دیا۔ "اس سے کچھ زیادہ ہی ہوں گے ٭

پدم سنگھ۔ اچھا آپ کے خیال میں ان میں کتنے غریب کسان ہوں گے۔ اور کتنے خوشحال زمیندار ؟

بیجناتھ۔ زیادہ تر کسان ہی ہوں گے لیکن زمیندار بھی دو تین سو سے کم نہ ہوں گے ٭

پدم۔ اچھا آپ یہ مانتے ہیں۔ کہ انسان اپنی بدنی ضرورتیں رفع کر کے تب کھیل تماشے کی طرف مخاطب ہوتا ہے ٭

بیجناتھ۔ ہاں یہ بھی مانتا ہوں۔ بھوکا بھلا کیا تماشہ دیکھے گا ٭

پدم۔ تو آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ اُن کسانوں کو اگر کمبل یا کپڑے دیدیئے جائیں۔ تو وہ ناچ دیکھنے کے مقابلے میں زیادہ خوش ہوں گے ؟

بیجناتھ۔ نہیں میں اسے نہ مانوں گا۔ زیادہ تر کسان ایسے ہوتے ہیں۔ جو خیرات کے نام پر ایک کیا سو کمبل بھی نہ لیں گے، وہ جلسہ دیکھنے آئیں گے۔ اور مجلس ویران دیکھیں گے۔ تو ناکام لوٹ جائیں گے ٭

پدم سنگھ نے سقراطی سوالات کا جو سلسلہ دل میں قائم کر رکھا تھا۔ وہ برہم ہو گیا، سمجھ گئے۔ کہ منشی جی ہوشیار ہیں۔ اب کوئی دوسرا داؤں کھیلنا

چاہئے۔ بولے :۔ اچھا اُسے جانے دیجئے۔ آپ یہ مانتے ہیں۔ کہ بازار میں وہی جنس نظر آتی ہے۔ جس کے خریدار ہوتے ہیں۔ اور خریداروں کی کثرت یا قلّت پر اس جنس کی کمی یا بیشی منحصر ہے ؟

بیجناتھ۔ جی ہاں اس میں کوئی شک نہیں +

پدم سنگھ۔ اس لحاظ سے کسی جنس کے خریدار ہی اُسے بازار میں لانے کے باعث ہوتے ہیں۔ اگر کوئی گوشت نہ کھائے۔ تو بکرے کی گردن پر چھری کیوں چلے؟

بیجناتھ سمجھ رہے تھے۔ کہ یہ حضرت مجھے کسی دوسرے پیچ میں لا رہے ہیں۔ لیکن ابھی تک اسکی تہ تک نہ پہنچے تھے۔ ڈرتے ہوئے بولے۔ ہاں۔ بالکل صحیح ہے"+

پدم سنگھ۔ جب آپ یہ مانتے ہیں۔ تو آپ کو یہ ماننے میں کیا تامّل ہو سکتا ہے۔ کہ جو لوگ طائفوں کو مجلسوں میں بُلاتے ہیں۔ اُنہیں بڑی بڑی رقمیں دیکر ان کے لئے آسائش اور تکلف کے سامان مہیّا کرتے ہیں۔ اور اُنہیں امیرانہ زندگی بسر کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ وہ اس قصاب سے کم گنہگار نہیں ہیں۔ جو بکرے کی گردن پر چھری چلاتے ہیں۔ اگر میں وکیلوں کو شان سے بگھی دوڑاتے نہ دیکھتا۔ تو آج میں ہرگز وکیل نہ ہوتا +

بیجناتھ نے ہنس کر کہا۔"بھیّا تم گھما پھرا کر اپنی بات منوا لیتے ہو۔ لیکن بات جو کہتے ہو وہ سچّی ہے"+

پدم سنگھ۔ تو ایسی حالت میں کیا یہ سمجھنا مشکل ہے۔ کہ یہ سیکڑوں عورتیں جو بالاخانوں پر بیٹھی نظر آتی ہیں۔ جنہوں نے اپنی شرم اور عفت بیچدی ہے۔ انکی

زندگی کو تباہ کرنیوالے ہم ہی لوگ ہیں۔ وہ ساری قومی اور مجلسی بُرائیاں جو اس بے شرمانہ زندگی کا نتیجہ ہیں۔ ان کے ذمہ وار ہمیں لوگ ہیں۔ وہ ہزاروں خاندان جو آئے دن اس نفسانیت کے بھنور میں پڑکر تباہ ہوتے رہتے ہیں ایشور کے دربار میں ہمارا دامن پکڑیں گے۔ اور اسوقت ہم کو کوئی جواب نہ سوجھے گا جس رواج سے ایسے خطرناک اور مہلک نتائج پیدا ہوں۔ اُسے ترک کرنے میں ہم کو مطلق پس و پیش نہ ہونا چاہئے۔ انسان خیال کا پتلا ہے۔ خیال ہی ارادہ اور فعل کا محرک ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ ایسی مجلسوں میں ہمارے خیالات پر کوئی اثر نہیں پڑتا؟ جس فعل کا لازمی نتیجہ تخریب ہو۔ کیا اس سے محترز رہنا اچھی بات نہیں؟

مدن سنگھ بڑے غور سے یہ تقریر سنتے رہے۔ اُنکی معقولیت کا اثر ان کے چہرہ پر نظر آرہا تھا۔ انہوں نے وہ اعلیٰ تعلیم نہیں پائی تھی۔ جب انسان ایک کو دو ثابت کرنے کے لئے بھی دلیلوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ اور علمی آزادخیالیوں کی دھن میں مجلسی پابندیوں کا دشمن اور اخلاقی قیود کا مخالف ہوتا ہے۔ نہیں وہ معمولی عقل اور فہم کے آدمی تھے۔ قایل ہو کر کج بحثی کرتے۔ یہ انکی استعداد سے باہر تھا۔ مسکرا کر منشی بیجناتھ سے بولے "کہو لالہ بیجناتھ۔ اب کیا کہتے ہو؟ ہے کوئی نکلنے کی تدبیر؟"

بیجناتھ۔ مجھے تو کوئی راستہ نہیں نظر آتا۔

مدن سنگھ۔ اجی کچھ کٹھ حجتی ہی کرو۔

بیجناتھ۔ کچھ دنوں وکالت پڑھ لی ہوتی تو وہ بھی کرتا۔ یہاں تو اب کوئی جواب

نہیں سوجھتا۔ کیوں بھیّا پدم سنگھ۔ ہاں تو تم میری جگہ ہوتے تو کیا جواب دیتے؟
پدم سنگھ۔ (ہنس کر) جوابوں کی کیا کمی ہے۔ جس نے فلسفہ پڑھا ہے۔ وہ سیاہ کو سفید ثابت کرسکتا ہے آسمان کو زمین ثابت کرسکتا ہے۔ روشن کو تاریک ثابت کرسکتا ہے۔ فلسفہ کے لئے کوئی امر مشکل نہیں ؀
مدن سنگھ۔ اتنا تو میں بھی کہوں گا۔ کہ ایسے جلسوں سے خیال ضرور خراب ہوجاتا ہے۔ میں جوانی میں جب کسی جلسے سے لوٹتا۔ تو مہینوں تک اس طوائف کی شکل صورت۔ ناز و انداز۔ گانے بجانے کی چرچا کیا کرتا۔ ایک جنون سا سر پر سوار تھا ؀
بیجناتھ۔ تو بھیّا پدم سنگھ ہی کے من کی ہونے دیجئے۔ یہی نہ ہوگا۔ دس پانچ آدمی ہنسیں گے۔ کوئی پرواہ نہیں۔ لیکن کنواں ضرور بنوا دیجئے ؀
پدم سنگھ۔ ادھر منڈپ میں بھانوریں پڑیں۔ اور میں نے کنوئیں کی نیو رکھی ؀



برسات کے دن تھے گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ پنڈت اُما ناتھ چنار گڈھ کے قریب گنگا کے کنارے کھڑے کشتی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کسی موضع کا چکر لگا کر آئے تھے۔ اور اس وقت چنار کے پاس ایک گاؤں میں جانا چاہتے تھے۔ انہیں خبر ملی تھی۔ کہ اس گاؤں میں کوئی لایق بر ہے۔ اُما ناتھ آج ہی امولا لوٹ جانا چاہتے تھے۔ مگر ابھی تک کشتی اُسی پار کھڑی تھی۔ اُما ناتھ کو ملاح پر غصہ آرہا تھا۔ اس سے زیادہ غصہ اُن مسافروں پر آرہا تھا۔ جو اُس پار کشتی پر بیٹھے

کے لئے آہستہ آہستہ آتے جاتے تھے۔ جب کھڑے کھڑے دیر ہو گئی۔ تو اُمانا تھ نے زور سے چلاکر ملاحوں کو پکارا۔ لیکن اُنکی صدا کو ملاحوں کے کان تک پہنچنے کا زیادہ شوق نہ تھا۔ وہ لہروں سے کھیلتی ہوئی۔ ان میں سما گئی ۔

یکایک اُمانا تھ کو ایک سادھو اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ لانبا آدمی تھا۔ چوڑا سینہ۔ سُرخ آنکھیں۔ سر پر جٹا۔ گلے میں بڑے بڑے دانوں کی مالا۔ ایک ہاتھ میں سُلفے کی لمبی چلم۔ دوسرے ہاتھ میں لوہے کا چمٹا پیٹھ پر ایک مرگ چھالا لپیٹے ہوئے۔ آکر ندی کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی اُس پار جانا چاہتا تھا ۔

اُمانا تھ کو ایسا خیال آیا۔ کہ میں نے اس سادھو کو کہیں دیکھا ہے۔ پر یاد نہیں آتا تھا۔ کہ کہاں؟ حافظہ پر ایک پردہ سا پڑا ہوا تھا ۔

اتنے میں سادھو نے اُمانا تھ کی طرف تاکا۔ اور پھر نام کر کے بولا "تمہارا گھر پر تو سب کُشل ہے؟ یہاں کیسے آنا ہوا؟"

اُمانا تھ کی آنکھوں پر سے پردہ ہٹ گیا۔ یاد تازہ ہو گئی۔ ہم صورت بدل سکتے ہیں۔ پر آواز کو نہیں بدل سکتے۔ یہ گجا دھر پانڈے تھے ۔

جب سے سُمن کی شادی ہوئی تھی۔ اُمانا تھ اُس سے ملنے نہیں گئے تھے۔ اُسے مُنہ دکھانیکی جراءت نہ ہوتی تھی۔ اسوقت گجا دھر کو اس صورت میں دیکھ کر اُنہیں تعجب ہُوا۔ انہوں نے سمجھا کہیں مجھے پھر دھوکا نہ ہُوا ہو۔ پوچھا "آپ کا نام؟"

سادھو۔ پہلے تو گجا دھر پانڈے تھا۔ اب گجانند ہے ۔

اُمانا تھ۔ او ہو ابھی تو میں پہچان نہ سکتا تھا۔ یاد آتا تھا۔ کہ آپکو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ پر آپ نے یہ بھیس کیوں لیا۔ بال بچے کہاں ہیں؟

سادھو۔ اُس جنجال سے اب آزاد ہو گیا۔

اُمانا تھ۔ سمن کہاں ہے؟

گجانند۔ دال منڈی میں ایک کوٹھے پر۔

اُمانا تھ نے متحیر ہو کر گجانند کی طرف دیکھا۔ اور تب شرم سے انکا سر جھک گیا۔ ایک لمحہ کے بعد بولے۔ "یہ کیونکر"۔

گجانند۔ بالکل اُسی طرح جیسے سنسار میں عموماً ہُوا کرتا ہے۔ میری بدمزاجی اور بے رحمی سمن کی شوخ طبعی اور شوق آرائش۔ دونوں نے ملکر ہمیں ملیا میٹ کر دیا۔ میں اب اُسوقت کی باتوں کو سوچتا ہوں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک اونچے خاندان کی لڑکی سے شادی کرنے میں میں نے بڑی غلطی کی۔ اور اس سے بڑی غلطی یہ کی۔ کہ شادی ہو جانے پر اسکی نازبرداری نہ کر سکا۔ میں غریب تھا۔ اس لئے ضروری تھا۔ کہ میں اس کمی کو محبت اور دلجوئی سے پورا کرتا میں نے اس کے برعکس اُسے کھانے پہننے کی بھی تکلیف دی۔ وہ چوکے برتن۔ چولھے۔ چکی میں مشاق نہ تھی۔ اور نہ ہو سکتی تھی۔ پر میں اُس سے یہ سب کام لیتا تھا۔ اور ذرا بھی دیر ہو جاتی۔ تو بگڑتا تھا۔ اب مجھے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ میں ہی اس کی تباہی کا باعث ہُوا۔ حُسن اور نفاست میں وہی تعلق ہے۔ جو پھول اور اسکی بو میں ہے۔ سمن کو مجھ سے محبت نہ تھی۔ اور نہ ہو سکتی تھی۔ پر وہ میری خاطر کرتی تھی۔ جس طرح کنگال آدمی دولت پا کر پھول اُٹھتا ہے

اُسی طرح حسین بیوی پاکر وہ وہم اور شک کا شکار ہو جاتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ میں سُمن سے بدگمان رہتا تھا۔ اور علانیہ اس کا اظہار نہ کر کے اُسے جلایا کرتا تھا۔ مہاراج۔ میں نے اُس کے ساتھ جو جو بدسلوکیاں کیں۔ انہیں یاد کر کے آج اتنی کوفت ہوتی ہے۔ کہ جی چاہتا ہے۔ کہ زہر کھا لوں، یہ اُنہیں بیرحمیوں کا پراشچت کر رہا ہوں، جب وہ گھر سے چلی گئی۔ تو مجھے دو چار دن وہی نشہ رہا۔ پر جب نشہ ہرن ہُوا۔ تو وہ گھر کاٹنے لگا۔ میں پھر اندر قدم نہ رکھ سکا۔ ایک مندر کا پوجاری بن گیا۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا پکانے کی تکلیف سے بچا۔ مندر میں دو چار سادھو سنت ضرور ہی آجاتے تھے۔ ان کی صحبت کا موقع مل جاتا تھا۔ ان لوگوں کی گیان کی باتیں سُن سُن کر میری آنکھیں کچھ کچھ کھلنے لگیں۔ اب یہ بھیس لے لیا ہے۔ گاؤں گاؤں گھومتا ہوں۔ اور اپنے سے جو کچھ بن پڑتا ہے۔ غریبوں کی مدد کرتا ہوں۔ آپ کیا بنارس سے آرہے ہیں؟

اُمانا تھ۔ نہیں۔ ایک گاؤں سے آرہا ہوں۔ سُمن کی ایک چھوٹی بہن ہے۔ اس کے لئے بَر کی تلاش ہے +

گجانند۔ لیکن ایکلے اچھا بَر ڈھونڈھئے گا +

اُمانا تھ۔ بر تو کمی نہیں ہے۔ پر اپنے میں اتنی ہمت بھی تو ہو۔ سمن کے لئے کیا میں نے کچھ کم دوڑ دھوپ کی تھی +

گجانند۔ آپ کے خیال میں کتنے روپے درکار ہوں گے +

اُمانا تھ۔ ایک ہزار تو جہیز ہی کے رکھئے۔ اور سب خرچ الگ +

گجانند۔ آپ شادی طے کرلیں۔ ایک ہزار روپیہ کی فکر میں کردوں گا۔ یہ بھیس بدلکر اب لوگوں کو آسانی سے ٹھگ سکتا ہوں۔ میں دو چار دن میں آپ سے امولا ہی میں ملوں گا۔

کشتی آگئی۔ دونوں آدمی سوار ہوئے۔ گجانند تو ملاحوں سے باتیں کرنے لگے۔ لیکن اُماناتھ فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کا دل کہہ رہا تھا کہ سمُن کا قاتل میں ہوں!



پنڈت اُماناتھ سدن سنگھ سے شانتا کی شادی طے کر آتے ہیں، انہوں نے جاہنوی سے گجانند کی امداد کا ذکر نہ کیا تھا۔ ڈرتے تھے۔ کہ وہ کہیں ان روپوں کو اپنی لڑکیوں کے لئے نہ رکھ چھوڑے، جاہنوی پر انکی فہمائش کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا، وہ اُس کے سامنے اسکی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

انہوں نے ایک ہزار کے جہیز پر شادی طے کی تھی۔ پر اب اس فکر میں پڑے ہوئے تھے۔ کہ بارات کے لئے خرچ کا کیا انتظام ہوگا۔ کم سے کم ایک ہزار کی ضرورت تھی۔ اس کے ملنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ہاں اُنہیں اس خیال سے مسرت ہوتی تھی۔ کہ شانتا کا بیاہ ایک اچھے گھر میں ہوگا۔ وہ آرام سے رہے گی۔ اور گنگاجلی کی آتما میرے اس کام سے خوش ہوگی۔

بالآخر جب شادی کو تین ہی ماہ اور رہ گئے۔ اور روپیہ کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ تو انہوں نے اسکی فکر کرنا چھوڑ دی، دل میں فیصلہ کیا۔ کہ بارات کے اخراجات کی مدہی غائب کر دوں گا۔ کسی نہ کسی بات پر باراتیوں سے بگڑ جاؤں گا۔ وہ لوگ آپ ہی ناراض ہو کر لوٹ جائیں گے۔ یہی نہ ہوگا تھوڑی سی بدنامی ہوگی۔ لیکن شادی تو ہو جائیگی۔ لڑکی تو آرام سے رہیگی۔ میں قضیہ ایسی خوبصورتی سے پیدا کروں گا۔ کہ سارا الزام باراتیوں کے سر آئے۔

پنڈت کرشن چندر کو جیلخانہ سے چھوٹ کر آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ لیکن ابھی تک اُمانا تھ کو شادی کے متعلق اُن سے کچھ صلاح و مشورہ کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ وہ کرشن چندر کے سامنے جاتے ہوئے شرماتے تھے!

کرشن چندر کے اطوار میں اب ایک بڑا تغیر نظر آتا تھا۔ اُن میں متانت کی جگہ اب سبکسری پیدا ہو گئی تھی۔ اور پاس وضع نام کو بھی نہ باقی رہا تھا۔ اُن کا جسم لاغر ہو گیا تھا۔ پر اعضا میں ایک خاص تیزی و طراری آگئی تھی، وہ اکثر رات کو لمبی آہیں بھر بھر ہائے ہائے کرتے ہوئے سُنائی دیتے تھے۔ آدھی رات کو اس خوشی کے عالم میں۔ وہ اپنی چارپائی پر کروٹیں بدل بدل کر یہ گیت گایا کرتے تھے۔ ے

اگیا لاگی سُندر بن جر گیو

کبھی کبھی یہ دُہرا پڑھتے۔

لکڑی جل کوئلہ بھئی اور کوئلہ جل بھیو راکھ

میں پاپن ایسی جلی کہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

انکی آنکھوں میں ایک قسم کی شرارت اور مستی جھلکتی تھی۔ جا تھوی اُنکے سامنے کھڑی نہ ہوسکتی۔ اُسے ایک دہشت سی معلوم ہوتی تھی +

جاڑے کے دن تھے۔ کسانوں کی عورتیں کھیتوں میں کام کرنے جایا کرتی تھیں۔ کرشن چندر بھی اُسی طرف نکل جاتے۔ اور وہاں عورتوں سے دل لگی کیا کرتے سسرال کے رشتہ سے اُنہیں عورتوں سے ہنسی مذاق کرنے کا حق تھا۔ لیکن کرشن چندر کی باتیں ایسی بیشرمانہ اور نگاہیں ایسی پُر معنی ہوتی تھیں۔ کہ عورتیں شرم سے مُنہ چھُپا لیتیں۔ اور اگر جا تھوی سے اُلہنے دیتیں + حقیقت یہ ہے۔ کہ کرشن چندر پر شوریدہ سری کا نشہ چڑھا ہُوا تھا +

امولا میں کتنے ہی تعلیم یافتہ۔ شریف آدمی تھے + کرشن چندر انکی صحبت سے محترز رہتے۔ اس کے برعکس وہ ہمیشہ شام کے وقت بدقماش آدمیوں کے ساتھ چرس کے دم لگاتے دکھائی دیتے تھے + اس مجمعٔ جہلا میں بیٹھے ہوئے وہ اپنے جیلخانہ کے تجربات بیان کیا کرتے۔ انکی گفتگو فحش و مکروہ الفاظ سے پُر ہوتی تھی +

اُمانا تھ اپنے گاؤں میں اعزاز کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے + وہ اپنے بہنوئی کی اِن خفیف حرکات کو دیکھ کر کٹ جاتے۔ اور ایشور سے مناتے کہ کسی طرح اِن سے گلا چھوٹے +

اور تو اور۔ اب شانتا کو بھی اپنے والد کے روبرو آنے میں خوف اور لحاظ معلوم ہوتا تھا + گاؤں کی عورتیں جب جا تھوی سے کرشن چندر کی بیباکیوں کی سرگزشت بیان کرنے لگتیں۔ تو شانتا پر گھڑوں پانی پڑ جاتا + وہ فوراً اس



جگہ سے ہٹ جاتا۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ کہ پتاجی کو کیا ہو گیا ہے، وہ کیسے سلیم الطبع کیسے بیدار مغز۔ کیسے با اخلاق کیسے ثقہ آدمی تھے! یہ کایا پلٹ کیونکر ہو گئی ہے؟ قالب تو وہی ہے پر وہ روح کہاں گئی؟

اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ اُمانا تھ دل میں چڑھتے۔ کہ انہیں کی لڑکی کی شادی ہے۔ اور یہی ایسے بے فکر بیٹھے ہیں۔ تو مجھے کیا غرض پڑی ہے۔ کہ خواہ مخواہ درد سر اُٹھاؤں، یہ تو نہیں ہوتا۔ کہ جا کر کہیں چار پیسے کمانیکی فکر کریں۔ اپنی اپنی زندگی خراب کر رہے ہیں۔ اور اپنے ساتھ مجھے بھی لئے جاتے ہیں ۔

ایک روز اُمانا تھ نے کرشن چندر کے ہم جلیسوں کو دھمکا کر کہا۔ "اب کبھی تم لوگوں کو اُن کے ساتھ چرس پیتے دیکھا۔ تو بُری طرح پیش آؤں گا۔ ایک ایک کی خبر لوں گا" ۔

اُمانا تھ کا رعب سارے گاؤں پر تھا۔ سب کے سب ڈر گئے۔ دوسرے دن کرشن چندر اُن کے پاس گئے۔ تو انہوں نے صاف کہدیا۔ "مہاراج آپ یہاں نہ آیا کریں۔ پنڈت اُمانا تھ سے ہمارا بگاڑ نہ کرا دیجئے۔ کہیں کوئی معاملہ کھڑا کر دیں۔ تو ہم کہیں کے نہ رہیں" ۔

کرشن چندر غصّہ سے بھرے ہوئے اُمانا تھ کے پاس آئے۔ اور بولے معلوم ہوتا ہے۔ تمہیں میرا یہاں رہنا اکھرنے لگا!

اُمانا تھ۔ آپ کا گھر ہے۔ جب تک چاہیں رہیں۔ پر میں یہ چاہتا ہوں۔ کہ آپ ذلیل آدمیوں کے ساتھ بیٹھکر اپنی اور میری بے عزتی نہ کرائیں ۔

کرشن چندر۔ تو کس کے ساتھ بیٹھوں؟ یہاں جتنے بھلے مانس کہلاتے ہیں۔ ان میں کوئی میرے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہے؟ سب کے سب مجھے حقیر سمجھتے ہیں میں یہ ذلت نہیں برداشت کر سکتا۔ آپ ان لوگوں میں ایک بھی ایسا آدمی بتلا سکتے ہیں۔ جو نیکی کا پُتلا ہو؟ سب کے سب دغاباز۔ حرامکار۔ غریبوں کا گلا کاٹنے والے ہیں۔ میں اپنے تئیں اُن سے بدتر نہیں سمجھتا۔ میں اپنے کیے کا پھل بھوگ رہا ہوں۔ وہ ابھی تک بچے ہوئے ہیں۔ بس مجھ میں اور اُن میں انتہا ہی فرق ہے۔ وہ ایک گناہ کو چھپانے کے لئے اور بھی صدہا گناہ کیا کرتے ہیں اس لحاظ سے وہ مجھ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ایسے بگلا بھگتوں کے سامنے میں حقیر بنکر نہیں رہ سکتا۔ میں اُن لوگوں کے سامنے بیٹھتا ہوں۔ جو اس حالت میں بھی میری عزت کرتے ہیں۔ جو اپنے کو مجھ سے بہتر نہیں سمجھتے۔ جو کوّے ہو کر ہنس کی نقل نہیں کرتے۔ اگر میرے اس برتاؤ سے آپ کی عزت میں بٹہ لگتا ہے۔ تو میں زبردستی آپ کے گھر نہیں رہنا چاہتا ہوں۔

اُما ناتھ۔ پرماتما میرا گواہ ہے۔ کہ میں نے اس خیال سے اُن آدمیوں کو تنبیہ نہیں کی تھی۔ آپ کو معلوم ہے۔ کہ مجھے اکثر سرکاری ملازموں اور حاکموں سے سابقہ پڑتا ہے۔ آپ کے اِس آزادی سے مجھے اُن کے سامنے آنکھیں نیچی کرنی پڑتی ہیں۔

کرشن چندر۔ تو آپ ان حضرات سے کہہ دیجئے۔ کہ کرشن چندر کتنا ہی گیا گزرا ہے۔ پھر بھی اُن لوگوں سے اچھا ہے۔ میں بھی کبھی سرکاری ملازم تھا۔ اور

ملازموں کے طور وطریق کا کچھ تجربہ رکھتا ہوں۔ وہ سب کے سب شاطر چور ہیں۔ پورے ڈاکو۔ گناہ میں گردن تک ڈوبے ہوئے۔ اور ایسے اسفلوں سے میں اخلاق کا سبق نہیں لینا چاہتا۔

اُمانا تھ۔ آپ کو حکام کی پرواہ نہ ہو۔ لیکن میری تو روزی انہیں کے نگاہ کرم پر منحصر ہے۔ میں کیونکر اُن سے مخالفت کر سکتا ہوں۔ آپ نے تو تھانہ داری کی ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ یہاں کا تھانہ دار آپکی نگرانی کیا کرتا ہے؟ وہ آپ کو رذیلوں کی صحبت میں دیکھے گا۔ تو ضرور اسکی رپورٹ کرے گا۔ اور آپ کے ساتھ میں بھی غارت ہو جاؤں گا۔ یہ لوگ کس کے دوست ہوتے ہیں؟

کرشن چندر۔ یہاں کا تھانہ دار کون ہے؟

اُمانا تھ۔ سید مسعود عالم۔

کرشن چندر۔ اچھا وہ دغاباز! سارے زمانہ کا بے ایمان! اچھا ہُوا بدمعاش وہ میرے ماتحت ہیڈ کانسٹیبل رہ چکا ہے۔ اور ایکبار میں نے ہی اُسے جیل سے بچایا تھا۔ ابکے اُسے یہاں آنے دیجئے۔ ایسی خبر لوں۔ کہ وہ بھی یاد کرے!

اُمانا تھ۔ اگر آپ کو یہ سب طوفان کھڑا کرنا ہے۔ تو براہ کرم مجھے اپنے ساتھ نہ سمیٹئے۔ آپ کا تو کچھ نہ بگڑے گا۔ پر میں پس جاؤں گا!

کرشن چندر۔ اسی لئے کہ آپ صاحب عزت ہیں۔ اور میرا کہیں ٹھکانہ نہیں! مہربان کیوں مُنہ کھلواتے ہو؟ تھانہ داروں کی دلالی کر کے بھی تمہیں اپنی عزت کا غرّہ ہے!

اُمانا تھ۔ میں بے عزت سہی۔ مکّار سہی۔ دغاباز سہی۔ دلال سہی۔ پر آپکے

ساتھ میں نے جو سلوک کئے ہیں۔ اُن کا تقاضا یہ ہے۔ کہ آپ کی زبان سے ایسی باتیں نہ نکلیں۔

کرشن چندر۔ تم نے میرے ساتھ سلوک کئے ہیں۔ یا میرے خاندان کو غارت کر دیا؟ سلوک کا ذکر کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ تمہارے سلوک کی تعریف یہاں خوب سُن چکا۔ تم نے میری بیوی کی جان لی۔ میری ایک لڑکی کو نہ جانے کس فاقہ مست قلاش کے گلے باندھ دیا۔ اور دوسری لڑکی سے مزدوروں کی طرح کام لے رہے ہو؟ یہ تمہارا سلوک ہے! بیچاری بھولی بھالی عورت کو جھانسہ دے کر مقدمہ کی پیروی کرنے کے بہانہ سے سب روپیہ اُڑا لئے۔ اور تب اُسے اپنے گھر لا کر اسکی مٹی خراب کی۔ آج اپنے سلوک کی شیخی بگھارتے ہو!

خود پسند انسان کو دوسروں کی احسان فراموشی سے جتنا صدمہ ہوتا ہے۔ اتنا اور کسی بات سے نہیں ہوتا۔ وہ چاہے اپنی نیکیوں کے لئے احسان کا گرویدہ نہ ہو۔ چاہے اُس نے نیکی کر کے دریا ہی میں ڈال دی ہو۔ پر اپنے حسن عمل کا خیال کر کے اُسے روحانی مسرت ہوتی ہے۔ وہ احسان کا اظہار چاہتے نہ پسند کرے۔ پر یہ ضرور چاہتا ہے۔ کہ دل میں اُسکی تحسین کی جائے۔ اُمانا تھ نے سوچا۔ دُنیا کتنی بدگمان ہے! میں نے اِن کے لئے مہینوں عدالتوں کی خاک چھانی۔ وکیلوں کی کیسی کیسی خوشامدیں کیں۔ عمّال کے کیسے کیسے ناز و نخرے اٹھائے۔ اپنے کتنے رنج کے روپے پھونک دیئے! اُس کا یہ صلہ مل رہا ہے! تین تین عورتوں کی برسوں پرورش کی۔ سمن کی شادی کے لئے مہینوں سرگرداں رہا۔ اور شامیا کی شادی کے لئے مہینوں سے دوا دوش کر رہا ہوں۔ دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھالے

پڑ گئے۔ روپے پیسے کی فکر میں جسم گھل گیا۔ دانہ پانی چھوٹ گیا۔ اُس کا یہ ثمرہ! واہ ری اندھی دُنیا! یہاں بھلائی کرنے میں بھی داغ لگ جاتا ہے۔ یہ سوچ کر انکی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ بولے۔ "بھائی صاحب! میں نے جو کچھ کیا۔ وہ بہتری ہی کے خیال اور ارادہ سے کیا۔ پر میرے ہاتھوں میں جَس نہیں ہے۔ ایشور کو اگر یہی منظور ہے۔ کہ میرا کیا کرایا سارا مٹی میں مل جائے۔ تو یہی سہی۔ میں نے آپ کو لوٹ لیا۔ آپ کی ساری دولت ہضم کر لی۔ اب جو سزا چاہے دیجئے۔ اور کیا کہوں"؟

اُمانا تھ کہنا چاہتے تھے۔ کہ اب تو جو کچھ ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب سے میرا گلا چھوڑ دیجئے۔ شانتا کی شادی کا انتظام کیجئے۔ اپنا گھر بار سنبھالئے۔ پر ڈرے۔ کہ غصّہ کی حالت میں یہ سچ مچ شانتا کو لے کر یہاں سے کسی طرف نکل نہ جائیں۔ اس لئے غم کھا جانا ہی مصلحت سمجھا۔ غصّہ ضعیف نیک دلوں میں رحم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کسی گداگر کی گالیاں سُنکر ایک شریف انسان خاموش رہنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے؟ نہیں بلکہ اُسے اُس پر رحم آ جاتا ہے۔

اُمانا تھ کے تحمل نے کرشن چندر کا غصّہ بھی فرو کیا۔ پر اُن میں زیادہ بات چیت نہ ہوئی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر خیالات میں ڈوبے بیٹھے تھے۔ جیسے دو کُتے لڑنے کے بعد آمنے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔ اُمانا تھ سوچتے تھے۔ بہت اچھا ہُوا۔ کہ میں خاموش ہو گیا۔ ورنہ دُنیا مجھی کو بُرا کہتی۔ کرشن چندر سوچتے تھے۔ میں نے بُرا کیا۔ جو یہ گڑے مُردے اُکھاڑے۔ بیجا غصّہ اکثر بیزاری روح کا باعث ہوتا ہے۔ کرشن چندر کو اب اپنے فرض کا راستہ نظر آنے لگا۔ تمام کیفیت

انہوں نے امانا تھ سے پوچھا۔"شانتا کی شادی تو آپ نے کہیں طے کر رکھی ہے نہ؟"

اُمانا تھ۔ اجی ہاں۔ چنار میں۔ پنڈت مدن سنگھ کے لڑکے سے +

کرشن چندر۔ نام سے تو کوئی معزز آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کتنا جہیز ٹھہرا ہے؟

اُمانا تھ۔ ایک ہزار +

کرشن چندر۔ اور غالباً اتنا ہی اور اوپر خرچ ہوگا؟

اُمانا تھ۔ ہاں اور کیا +

کرشن چندر نے جرأت سے پوچھا۔"اتنے روپوں کا انتظام کیونکر ہوگا؟"

اُمانا تھ۔ ایشور کسی نہ کسی طرح بیڑا پار لگائیں گے۔ ایک ہزار تو میرے پاس ہے صرف ایک ہزار کی اور فکر ہے +

کرشن چندر نے نہایت ندامت آمیز انکسار سے کہا۔"میری حالت تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں....."

اتنا کہتے کہتے اُنکی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے +

امانا تھ نے تسکین آمیز لہجہ میں کہا۔"آپ کچھ اندیشہ نہ کریں۔ میں سب انتظام کر لوں گا" +

کرشن چندر۔ پرماتما آپ کو اس نیکی کا اجر خیر دیں گے۔ بھیّا۔ آج میں غصہ میں تمہیں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔ اس کا بُرا نہ ماننا۔ میں ابھی اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوں۔ اُس دوزخی زندگی نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ اس نے میری روح کو کچل ڈالا ہے۔ میرے جذبات مردہ ہو گئے ہیں۔ اس طلسم میں پڑ کر فرشتہ بھی دیو ہو جائے۔ تو عجب نہیں۔ مجھ میں یہ طاقت کہاں ہے۔ کہ شادی کا اتنا

بھاری بوجھ سنبھال سکوں۔ تم نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا۔ پر یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ کہ میں یہ بوجھ تمہاری گردن پر رکھ کر خود کاہل بنا بیٹھا رہوں، مجھے بھی اجازت دو۔ کہ جاکر کہیں چار پیسے کمانے کی فکر کروں۔ میں کل بنارس جاؤنگا یوں میرے پہلے کے کئی ملاقاتی ہیں۔ پر میں اُن کے یہاں نہیں ٹھہرنا چاہتا سمن کا گھر کس محلہ میں ہے ؟

اُمانا تھ کا چہرہ فق ہوگیا۔ بولے۔ "شادی تک تو آپ یہیں رہئے۔ اس کے بعد جہاں مرضی ہو چلے جائیے گا"۔

کرشن چندر۔ نہیں مجھے کل جانے دو۔ شادی کے ایک ہفتہ قبل لوٹ آؤنگا دو چار دن سمن کے یہاں ٹھہر کر کوئی ملازمت تلاش کر لونگا۔ کس محلہ میں رہتی ہے؟

اُمانا تھ۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ ادہر عرصہ سے اُدھر نہیں گیا۔ شہر والوں کا ٹھکانہ ہی کیا ہے۔ روز مکان بدلتے پھرتے ہیں۔ معلوم نہیں اب کس محلہ میں ہو۔

رات کو کھانا کھانے کے وقت کرشن چندر نے شانتا سے سمن کا پتہ پوچھا شانتا اُمانا تھ کا اشارہ نہ سمجھ سکی۔ پورا پتہ بتا دیا۔



شہر کی میونسپل بورڈ میں کل ۱۸ ممبر تھے۔ اُن میں ۸ مسلمان تھے۔ اور ۱۰ ہندو تعلیمیافتہ ممبروں کی تعداد غالب تھی۔ اس لئے پدم سنگھ شرما کو کامل یقین تھا۔ کہ بورڈ میں ارباب نشاط کے اخراج کی تجویز منظور ہو جائیگی۔ وہ سب ممبروں سے مل چکے تھے۔ اور اس مسئلہ کے متعلق ان کے اعتراضات اور شکوک

کا اظہار کر چکے تھے۔ لیکن ان میں بعض اصحاب ایسے تھے جنکی طرف سے مخالفت کا اندیشہ تھا۔ یہ سب لوگ بہت معزز۔ بارسوخ مہاجن اور تاجر تھے۔ اس لئے شمر حاجی کو یقین کے ساتھ یہ خوف بھی تھا کہ کہیں تعلیم یافتہ احباب بھی اُن کے دباؤ میں نہ آجائیں۔ ہندوؤں میں مخالف جماعت کے سرغنہ سیٹھ بل بھدر داس تھے۔ اور مسلمانوں میں حاجی ہاشم۔ جبتک بھٹل داس کے اہتمام میں تحریک تھی۔ کسی نے اسکی طرف توجہ نہ کی تھی۔ لیکن جب سے پدم سنگھ اور چند دیگر رائیٹ اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ تب سے سیٹھ جی اور حاجی صاحب کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا۔ کہ عنقریب یہ تجویز بورڈ میں پیش ہوگی۔ اس لئے دونوں حضرات اس حملہ کی مدافعت کی پیش بندیاں کر رہے تھے۔ پہلے حاجی صاحب نے مسلمان ممبروں کو جمع کیا۔ حاجی صاحب کا عوام پر بہت اثر تھا۔ اور وہ شہر کے مسلمانوں کے سرغنہ سمجھے جاتے تھے۔ باقی ماندہ ممبروں میں مولانا تیغ علی ایک امام باڑہ کے متولی تھے۔ منشی ابوالوفا عطر اور تیل کے ایک کارخانہ کے مہتمم تھے۔ بڑے بڑے شہروں میں اُنکی کئی دُکانیں تھیں۔ منشی عبداللطیف ایک بڑے زمیندار لیکن بیشتر شہر ہی میں رہتے تھے۔ انہیں شعر وسخن کا ذوق تھا۔ اور خود بھی اچھے شاعر تھے۔ شاکر بیگ اور شریف حسن وکالت کرتے تھے۔ اُن کے تمدنی خیالات بہت اعلیٰ تھے۔ سید شفقت علی پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اور خانصاحب شہرت خان اطبّا میں بہت ممتاز تھے۔ یہ دونوں حضرات گوشہ عافیت کے دلدادہ تھے۔ مگر تنگ خیال نہ تھے۔ دونوں راسخ الاعتقاد آدمی تھے۔ اہل قوم انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حاجی ہاشم نے فرمایا "برادران وطن کی یہ نئی چال آپ لوگوں نے ملاحظہ کی؟ واللہ انکو سوجھتی خوب ہے۔ بغلی گھونسے مارنا کوئی اِن سے سیکھ لے۔ میں تو انکی ریشہ دوانیوں سے اتنا بدظن ہوگیا ہوں۔ کہ اگر انکی نیک نیتی پر ایمان لانے سے نجات بھی ہوتی ہو تو نہ لاؤں"۔

منشی ابوالوفا بولے "مگر اب خدا کے فضل سے ہمیں بھی اپنے نفع نقصان کا احساس ہونے لگا ہے۔ یہ ہماری مجموعی تعداد کو گھٹانیکی صریح کوشش ہے۔ طوائفیں نتّرے فیصدی مسلمان ہیں۔ جو روزے رکھتی ہیں۔ عزاداری کرتی ہیں مولود اور عُرس کرتی ہیں۔ ہم کو اُن کے ذاتی فعلوں سے کوئی بحث نہیں ہے۔ نیک بد کی سزا و جزا دینا خدا کا کام ہے۔ ہم کو تو صرف انکی تعداد سے غرض ہے"۔

تیغ علی۔ مگر انکی تعداد کیا اتنی زیادہ ہے۔ کہ اس سے ہماری مجموعی دوٹ پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے؟

ابوالوفا۔ کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور ہی پڑے گا۔ خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔ برادران وطن کو دیکھئے۔ وہ ڈوموں کو بھی اپنی قوم میں ملانے پر آمادہ ہیں۔ اُن کے سایہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ اُنہیں جانوروں سے زیادہ حقیر سمجھتے ہیں مگر محض اپنے پولٹیکل مفاد کے لئے انہیں اپنے قومی جسم کا ایک عضو بنائے ہوئے ہیں۔ ڈوموں کا شمار جرائم پیشہ فرقوں میں ہے۔ علی ہذا پاسی، بھرہ وغیرہ بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ سرقہ۔ قتل۔ رہزنی یہ اُن کے پیشے ہیں۔ مگر جب انہیں ہندو جماعت سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تو ہمارے

اہل وطن کیسے چراغ پا ہوتے ہیں۔ وید اور شاستر سے سندیں پیش کرتے پھرتے ہیں۔ ہم کو اس معاملہ میں انہیں سے سبق لینا چاہیئے ؛

سید شفقت علی نے متانت سے فرمایا۔ ان جرائم پیشہ اقوام کے لئے گورنمنٹ نے شہروں میں خطے علیحدہ کر دیئے ہیں۔ اُن پر پولیس کی نگرانی ہوتی ہے۔ میں خود اپنے دوران ملازمت میں انکی نقل و حرکت کی رپورٹ لکھا کرتا تھا مگر میرے خیال میں کسی ذمہ دار ہندو نے گورنمنٹ کے اس طرز عمل کی مخالفت نہیں کی۔ حالانکہ میری نگاہ میں سرقہ یا قتل اتنے مکروہ افعال نہیں ہیں۔ جتنی عصمت فروشی، ڈومنی بھی جب درجہ عصمت سے گرجاتی ہے۔ تو وہ اپنی برادری سے خارج کر دی جاتی ہے، اگر کسی ڈوم یا بھر کے پاس کافی دولت ہو۔ تو وہ اس حُسن کے کھلے ہوئے بازار میں من مانا سودا خرید سکتا ہے خدا وہ دن نہ لائے۔ کہ ہم اپنے پولیٹکل مفاد کے لئے اس حد تک ذلیل بننے پر مجبور ہوں، اگر ان طوائفوں کی دینداری کے طفیل میں خدا سارے اسلام کو جنت عطا کرے۔ تو میں دوزخ میں جانا پسند کروں گا، اگر انکی تعداد کی بنا پر ہم کو اس ملک کی بادشاہی بھی ملتی ہو۔ تو میں قبول نہ کروں میری ذاتی رائے تو یہ ہے۔ کہ اِنہیں مرکز شہر ہی سے نہیں۔ حدود شہر سے خارج کر دینا چاہیئے ؛

حکیم شہرت خان۔ جناب میرے امکان میں ہو۔ تو میں انہیں ہندوستان سے نکالدوں، ان سے ایک جزیرہ الگ آباد کروں، مجھے اس بازار کے خریداروں سے اکثر سابقہ رہتا ہے۔ اگر میرے مذہبی عقاید میں فرق نہ آئے۔

تو میں یہ کہوں گا۔ کہ طوائفیں ہیضے اور طاعون کا اُوتار ہیں۔ ہیضہ دو گھنٹوں میں کام تمام کر دیتا ہے۔ پلیگ دو دن میں۔ لیکن یہ جہنمی ہستیاں رُلا رُلا کر اور گھلا گھلا کر جان مارتی ہیں۔ منشی ابوالوفا صاحب اُنہیں جنت کی حوریں سمجھتے ہوں۔ لیکن فی الواقع یہ وہ کالی ناگنیں ہیں۔ جنکی آنکھوں میں زہر ہے۔ یہ وہ چشمے ہیں۔ جن سے جرائم کے دریا نکلتے ہیں۔ کتنی ہی نیک بیویاں اُنکی بدولت زندہ در گور ہیں۔ کتنے ہی شریف زادے اُنکی بدولت خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ کہ بیشرم طوائفیں اپنے تئیں مسلمان کہتی ہیں۔

شریف حسن نے فرمایا۔ "اسمیں تو کوئی بُرائی نہیں ہے۔ کہ وہ اپنے کو مسلمان کہتی ہیں۔ بُرائی یہ ہے۔ کہ اسلام بھی انہیں راہ راست پر لانیکی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی اسلام نے بھی انہیں اپنے دائرہ عمل سے خارج کر دیا ہے۔ بیشک ہمارے مولینا صاحب سبز عمامہ باندھے۔ آنکھوں میں گہرا سُرمہ لگائے۔ گیسو سنوارے۔ اُنکی مذہبی تلقین و تسکین کے لئے جا پہنچتے ہیں۔ اُنکے دستر خوان سے میٹھے لقمے کھاتے ہیں۔ خوشبودار خمیرے کے کش لگاتے ہیں۔ اور انکے خاصدان سے معطر بیڑے اُڑاتے ہیں۔ بس اسلام کی مذہبی قوت اصلاح یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ اپنے بُرے فعلوں پر نادم ہونا انسانی خاصہ ہے۔ یہ گمراہ عورتیں بیشتر نہیں۔ تو شراب کا نشہ اترنے پر ضرور اپنی حالت پر افسوس کرتی ہیں۔ لیکن اسوقت اُنکا پچھتانا بے سود ہوتا ہے۔ اُن کے گزران کی اسکے سوا اور کوئی صورت

نہیں رہتی۔ کہ وہ اپنی لڑکیوں یا نوچیوں سے دوسروں کو دام محبت میں پھنسائیں۔ اور اس طرح یہ سلسلہ دائم و قائم رہتا ہے۔ اگر انکی لڑکیوں کی جائز طور پر شادی ہو سکے۔ اور اسکے ساتھ ہی اُنکی پرورش کی بھی صورت نکل آئے تو میرے خیال میں زیادہ نہیں تو ۷۵ فیصدی طوائفیں ضرور اسے خوشی سے قبول کرلیں۔ ہم چاہے خود کتنے ہی سیاہ کار ہوں۔ پر اپنی اولاد کو نیک اور راستباز دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ طوائفوں کو شہر سے خارج کر دینے سے انکی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس نقطۂ خیال سے تو میں اخراج کی تحریک پہ اعتراض کرنیکی جراءت کر سکتا ہوں۔ پر پولٹیکل مفاد کی بنا پر میں اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ میں کسی فعل کو قومی خیال سے پسندیدہ نہیں سمجھتا تاوقتیکہ وہ اخلاقاً بھی پسندیدہ نہ ہو۔

تیغ علی۔ بندہ نواز سنبھل کر باتیں کیجئے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ آپ کے اوپر کفر کا فتویٰ صادر ہو جائے۔ یہ پولٹیکل مفاد کا دور ہے۔ حق اور انصاف کا نام نہ لیجئے اگر آپ مدرس ہیں۔ تو ہندو لڑکوں کو فیل کیجئے۔ تحصیلدار ہیں۔ تو ہندوؤں پر بیجا ٹیکس لگائیے۔ مجسٹریٹ ہیں۔ تو ہندوؤں کو سخت سزائیں دیجئے۔ سب انسپکٹر پولیس ہیں۔ تو ہندوؤں پر جھوٹے مقدمے دائر کیجئے تحقیقات کرنے جائیے۔ تو ہندوؤں کے بیانات غلط لکھئے۔ اگر آپ چور ہیں۔ تو کسی ہندو کے گھر ڈاکہ ڈالئے۔ اگر آپ کو حسن و عشق کا ذوق ہے۔ تو کسی ہندو نازنین پر ڈورے ڈالئے۔ تب آپ قوم کے خادم۔ قوم کے محسن۔ قومی کشتی کے ناخدا سب کچھ ہیں۔

حاجی ہاشم تلملا گئے۔ منشی ابوالوفا کے تیوروں پر بل پڑ گئے۔ تیغ علی کی تیغ آبدار نے انہیں گھائل کر دیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے۔ کہ شاکر بیگ بول اُٹھے "بھائی صاحب۔ یہ طعن و طنز کا موقع نہیں ہے۔ یہ ہمارا باہمی مشورہ ہے۔ کوئی مناظرہ کی مجلس نہیں۔ زبان تیز مصالحت کے حق میں زہر قاتل ہے۔ میں شاہدان طناز کو نظام تمدن میں بالکل بیکار یا مایۂ شر نہیں سمجھتا۔ جب آپ کوئی مکان تعمیر کراتے ہیں۔ تو اس میں بدررو کا بنا ناضروری سمجھتے ہیں۔ اگر بدررو نہ ہو تو چند سالوں میں دیواروں کی بنیادیں ہل جائیں۔ اس فرقہ کو سوسائٹی کا بدررو سمجھنا چاہئے۔ اور جس طرح بدررو مکان کے نمایاں حصے میں نہیں ہوتی بلکہ نگاہ سے پوشیدہ ایک گوشہ میں بنائی جاتی ہے۔ اُسی طرح اس فرقہ کو بھی شہر کے پُرفضا مقامات سے ہٹا کر کسی گوشہ میں آباد کرنا چاہئے"۔

منشی ابوالوفا اس تقریر کا پہلا حصہ سُنکر بہت خوش ہوئے تھے۔ پر بدررو کی تشبیہ پر اُن کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ حاجی ہاشم نے عبداللطیف کی طرف مایوسانہ انداز سے دیکھ کر کہا "جناب کچھ آپ بھی فرماتے ہیں۔ یا قومی اتحاد کی رَو میں آپ کے قدم بھی اکھڑ گئے ہیں؟"

عبداللطیف نے جواب دیا "جناب رندوں کو کسی کی دشمنی یا دوستی سے کیا واسطہ؟ اپنا مشرب تو صلح کل ہے۔ میں اب تک یہی فیصلہ نہیں کر سکا۔ کہ عالم بیداری میں ہوں یا خواب میں۔ ایسے ایسے لائق و فائق حضرات کو ایک بے سر پیر کی بات کی تائید میں زمین و آسمان کے

قلابے ملا۔ تو دیکھتا ہوں۔ کیونکر باور کروں۔ کہ بیدار ہوں، صابون۔ چمڑے
اور مٹی کے تیل کی دکانوں سے آپکو کوئی اعتراض نہیں۔ کپڑے۔ برتن۔ ادویا
وغیرہ کی دکانیں چوک میں ہیں۔ آپ انہیں مطلق بے موقع نہیں سمجھتے۔ کیا
آپ کی نگاہ میں حسن کی اتنی بھی وقعت نہیں؟ اور کیا یہ ضروری ہے۔ کہ
اسے کسی تنگ و تاریک کوچہ میں بند کر دیا جائے؟ کیا وہ باغ باغ کہلانیکا
مستحق ہے۔ جہاں سرو کی قطاریں ایک گوشہ میں ہوں بیلے اور گلاب
کے تختے دوسرے گوشہ میں۔ اور روشوں کے دونوں طرف نیم اور ببول
کے درخت لگے ہوں۔ وسط میں پیپل کا ایک ٹھونٹھ ہو۔ اور حوض کے
کنارے ناگ پھنی کا کنج؟ چیل اور کوے دونوں طرف درختوں پر بیٹھے اپنا
راگ الاپتے ہوں۔ اور بلبلیں کسی گوشہ تاریک میں درد کے ترانے گاتی
ہوں۔ میں اس تحریک کی سخت مخالفت کرتا ہوں۔ میں اسے اس
قابل ہی نہیں سمجھتا۔ کہ اس پر متانت سے بحث کی جائے۔

حاجی ہاشم مسکرائے۔ ابوالوفا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ دیگر
حضرات نے فلسفیانہ تبسم کے ساتھ یہ مضحک تقریر سنی۔ پر مولنا تیغ علی نے
اتنے متحمل نہ تھے۔ تیز ہو کر بولے "کیوں غریب پرور۔ ایکے بورڈ میں یہ تجویز
کیوں نہ پیش کر دی جائے۔ کہ میونسپلٹی عین چوک میں خاص اہتمام کے ساتھ
ایک مینا بازار آراستہ کرے۔ اور جو حضرات اس بازار کی سیر کو تشریف
لے جائیں۔ انہیں سرکار کی جانب سے خوشنودی مزاج کا پروانہ عطا کیا
جائے۔ میرے خیال میں اس تجویز کی تائید کرنیوالے بہت نکل آئینگے

اور محرک کا نام زندہ جاوید ہو جائے گا۔ اسکی وفات کے بعد اسکے مزار پر عرس ہوں گے۔ اور وہ اپنے گوشۂ لحد میں پڑا ہُوا حُسن کی بہار لوٹے گا۔ اور دلپذیر نغمے سُنے گا"۔

منشی ابوالوفا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ حاجی ہاشم نے دیکھا۔ کہ بات بڑھا چاہتی ہے۔ تو بولے "میں اب تک سُنا کرتا تھا۔ کہ اصول بھی کوئی چیز ہے۔ پر آج معلوم ہُوا۔ کہ وہ محض ایک وہم ہے۔ ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا۔ کہ آپ ہی حضرات اسلامی وظائف کے ڈپوٹیشن لیکر گئے تھے۔ مسلمان قیدیوں کے مذہبی تلقین کی تجویزیں کر رہے تھے۔ اور اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا۔ تو اُن موقعوں پر آپ ہی لوگ پیش پیش نظر آتے تھے۔ مگر آج یکایک یہ انقلاب دیکھ رہا ہوں۔ خیر۔ آپکا تلون آپکو مبارک رہے۔ بندہ اتنا سہل الیقین نہیں ہے۔ میں نے یہ زندگی کا اصول بنا لیا ہے۔ کہ برادران وطن کی ہر ایک تجویز کی مخالفت کروں گا۔ کیونکہ مجھے اُن سے کسی بہبودی کی توقع نہیں ہو سکتی"۔

ابوالوفا نے فرمایا۔ "علیٰ ہذا مجھے رات کو آفتاب کے ظہور کا یقین ہو سکتا ہے۔ پر برادران یوسف کی نیک نیتی پر یقین نہیں آ سکتا"۔

سید شفقت علی۔ حاجی صاحب قبلہ۔ آپنے ہم لوگونکو بے اصول اور زمانہ ساز سمجھنے میں متانت سے کام نہیں لیا۔ ہمارا اصول جو تب تھا وہی اب بھی ہے۔ اور وہی ہمیشہ رہے گا۔ اور وہ ہے اسلامی وقار کا قائم کرنا اور ہر ایک جائز طریق سے برادران ملت کے بہبود کی کوشش کرنا۔ اگر ہماری

فائدے میں برادرانِ وطن کا نقصان ہو۔ تو ہم کو اس کی پروا نہیں۔ لیکن جس تجویز کے نفاذ سے ان کے ساتھ ہمیں بھی فایدہ پہنچتا ہے۔ اور اُن سے کسی طرح کم نہیں۔ اُسکی مخالفت کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے۔ ہم مخالفت کے لئے مخالفت کرنا پسند نہیں کرتے ؞

رات زیادہ جا چکی تھی۔ مجلس برخاست ہوئی۔ اس مباحثہ سے کوئی مفید نتیجہ مرتب نہ ہو سکا۔ لوگ دلوں میں جو خیال قائم کر کے آئے تھے۔ اُسی پر قائم رہے۔ حاجی ہاشم کو اپنی فتح کا جو یقین کامل تھا۔ اس میں اب کچھ کچھ شبہ نظر آنے لگا ؞



اس تجویز کے مخالف ہندو ممبروں کو جب مسلمانوں کے اس جلسہ کا حال معلوم ہوا۔ تو اُن کے کان کھڑے ہوئے۔ انہیں مسلمانوں سے اُمید تھی وہ [illegible] کُل دس ہندو ممبر تھے۔ تیج بل بھدر داس چیرمین تھے۔ ڈاکٹر شیاما چرن وائس چیرمین۔ لالہ چمن لال اور دینا ناتھ بیوپاری اہلِ تجارت کے قائم مقام تھے۔ پرم اور مسٹر ستیم بھائی وکیل تھے۔ رمیش دت کالج کے پروفیسر۔ لالہ بھگت رام ٹھیکیدار پنڈت پربھاکر راؤ ہندی اخبار "جگت" کے ایڈیٹر اور کنور انرودھ بہادر سنگھ ضلع کے سب سے بڑے تعلقہ دار تھے۔ چوک کی دکانوں میں زیادہ تر بل بھدر داس اور چمن لال کی دکانیں تھیں۔ چاول منڈی میں کتنے ہی مکانات دینا ناتھ کے تھے۔ یہ تینوں حضرات اس تجویز کے مخالف تھے۔ لالہ بھگت رام کا کار

بار چمن لال کی مالی امداد سے چلتا تھا۔ اس لئے اُنکی رائے بھی انہیں کی طرف تھی۔ پربھاکر راؤ۔ رمیش دت۔ رستم بھائی اور پدم سنگھ اس تجویز کے معاون تھے۔ ڈاکٹر شیاما چرن اور کنور صاحب کی رائیں ابھی تک غیر معلوم تھیں۔ دونوں فریق ان سے مدد کی اُمید رکھتے تھے۔ اُنہیں پر دونوں کی ہار جیت کا فیصلہ تھا۔ پنڈت پدم سنگھ ابھی بارات سے نہیں لوٹے تھے۔ بل بھدر داس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ اور سب ہندو ممبروں کو اپنی آراستہ کوٹھی میں مدعو کیا۔ اس کا خاص مدعا یہ تھا۔ کہ ڈاکٹر صاحب اور کنور انردھ سنگھ کو اپنا ہم خیال بنا لیا جائے۔ پربھاکر راؤ مسلمانوں کے زبردست مخالف تھے۔ چنانچہ وہ لوگ اسی مسئلہ کو ہندو۔ مسلمان رنگ دیکر انہیں بھی اپنی طرف کھینچنا چاہتے تھے۔

دینا ناتھ تیواری نے فرمایا۔ "ہمارے مسلم بھائیوں نے تو اس معاملہ میں بڑی دلیری سے کام لیا۔ مجھے اُن سے ایسی توقع نہ تھی۔ لیکن اس میں جو راز پوشیدہ ہے۔ غالباً وہ آپ لوگوں پر روشن ہوگا۔ انہوں نے ایک پنتھ دو کاج کی پالیسی برتی ہے۔ ایک طرف تو اصلاح معاشرت کی نیکنامی ہاتھ آتی ہے۔ اور دوسری جانب ہندوؤں کا نقصان پہنچانے کا ایک بہانہ ملتا ہے۔ ایسے موقعے پر بھلا وہ کب خطا کرنے والے تھے"؟

سیٹھ چمن لال۔ مجھے پالٹیکس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور نہ اس کے قریب جاتا ہوں۔ لیکن ہمارے مسلم بھائیوں نے اس وقت ہماری گردن بری طرح پکڑی ہے۔ اُنہیں چپڑیاں مل رہی ہیں۔ اور دو دو۔ چاول منڈی

اور چول میں زیادہ تر مکانات ہندوؤں کے ہیں۔ اگر بورڈ نے یہ تجویز منظور کر لی۔ تو اس کا سارا وبال ہندوؤں کے سر پڑے گا۔ اور انہیں مفت کی نیکنامی حاصل ہوگی۔ میں تو اُنکی دوررسی کا قائل ہوں۔ چھپے حملے کرنا کوئی ان سے سیکھ لے۔ ابھی بہت دن نہیں گزرے۔ کہ سود کے پردے میں ہندوؤں پر حملے کئے۔ اب یہ نئی ترکیب نکالی۔ افسوس ہے۔ کہ ہمارے ہی بھائیوں میں چند حضرات سستی شہرت حاصل کرنے کیلئے برادران وطن کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں جانتے۔ کہ ان کا یہ انحراف ہندو قوم کے لئے کس قدر نقصان کا باعث ہوگا۔

مقامی کونسل میں جب سود کا مسئلہ درپیش تھا۔ تو پربھاکر راؤ نے اسکی خوب مخالفت کی تھی۔ چمن لال نے ان کا ذکر کرکے اور اخراج کی تحریک کو مالی نقطہ نظر سے پیش کرکے پربھاکر راؤ کو مطابقت کی زنجیریں باندھنے کی کوشش کی۔ پربھاکر راؤ نے بیکسانہ انداز سے رستم بھائی کی طرف دیکھا۔ گویا اُن سے کہہ رہے ہیں۔ کہ لوگ مجھ پر دودستی تلوار چلا رہے ہیں۔ آپ مجھے ان سے بچائیے۔ رستم بھائی نہایت بیباک اور صاف گو آدمی تھے۔ وہ چمن لال کا جواب دینے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ اور بولے "مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے۔ کہ اب لوگ ایک تمدنی معاملہ کو ہندو مسلم نزاع کی صورت دے رہے ہیں۔ سود کی تجویز کو بھی یہی رنگ دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایسے قومی معاملات کو امر متنازعہ بنانے سے ممکن ہے۔ چند ہندو ساہوکاروں کو فائدہ ہو۔ لیکن اس سے قومیت کو جو صدمہ ہوتا ہے۔

اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ تجویز زیر بحث کے پاس ہوجانے سے ہندو ساہوکاروں کو زیادہ نقصان ہوگا۔ لیکن مسلمانوں پر بھی اس کا کم و بیش اثر ضرور پڑے گا۔ چوک اور چاول منڈی میں مسلمانوں کے مکانات کم نہیں ہیں۔ ہم کو اختلاف یا تعصب کی دُھن میں اپنے مسلمان بھائیوں کی نیّت کی صفائی پر شک کرنا مناسب نہیں۔ انہوں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ محض بہبود خلق کے خیال سے کیا ہے۔ اگر ہندوؤں کو اس سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ تو یہ حالات کی دوسری صورت ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اگر مسلمانو کے مکانات زیادہ ہوتے۔ تب بھی ان کا یہی فیصلہ ہوتا۔ اس جلسے میں شاید کوئی صاحب ایسے ہونگے۔ جو اُن اخلاقی اور مجلسی خرابیوں سے بیخبر ہوں۔ جنکی اصلاح کے لئے یہ تجویز پیش کی گئی ہے۔ اگر آپ صدق دل سے ان بُرائیوں کو محسوس کرتے ہیں۔ تو آپ کو اس تجویز کے منظور کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہونا چاہئے۔ خواہ اس سے کتنا ہی مالی نقصان ہو۔ اخلاق کے معاملہ میں جان کو بھی سر جُھکانا پڑتا ہے۔ مال کا ذکر ہی کیا۔

پربھاکر راؤ کی جان میں جان آئی۔ بولے۔ "بس یہی میں بھی عرض کرنیوالا تھا۔ یہ ایک اخلاقی اور تمدّنی مسئلہ ہے۔ مالی پہلو ہرگز اس کا اہم ترین پہلو نہیں ہے۔ ہندو قوم اپنی سخت گیریوں کے لئے پہلے ہی بدنام ہے۔ اور اگر اس مسئلہ کے حل کرنے میں بھی اس پہلو کو تفوق دیا گیا۔ تو برادران وطن کو پھر آوازے کسنے کا موقع ملیگا۔ یہ بات آفتاب کی طرح روشن ہے۔ کہ بازار حُسن ہماری سوسائٹی کا ایک نہایت شرمناک حصّہ ہے۔ اور اُسے شہر کے

نمایاں مقامات پر جگہ نہ ملنی چاہیئے"۔
کنور انرودھ بہادر سنگھ نے پربھاکر راؤ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "حضرت آپ تو اپنے اخبار کی ترتیب میں محو رہتے ہیں۔ آپ کے پاس زندگی کے لطف اُٹھانے کے موقع ہی کہاں ہیں، پر ہم جیسے بیفکروں کو تو تفریح کا کوئی نہ کوئی سامان چاہیئے۔ شام کا وقت تو پولو کھیلنے میں کٹ جاتا ہے۔ دوپہر کا وقت سونے میں اور صبح کا وقت حکام کی ملاقات یا سیر سپاٹے میں۔ لیکن شام سے دس بجے رات تک بیٹھے کیا کریں گے؟ آج آپ نے یہ یہ تجویز پیش کی ہے۔ کل آپ کہیں گے۔ کہ میونسپلٹی کے اندر کوئی بغیر اجازت کے ناچ یا مجرا نہ کرے۔ تب تو ہم لوگوں کا شہر میں رہنا ہی محال ہو جائیگا"
پربھاکر راؤ مسکرا کر بولے "کیا پولو اور ناچ گانے کے سوا وقت گزاری کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ کچھ پڑھا کیجئے"
کنور صاحب۔ پڑھنا ہماری شان کے خلاف ہے۔ ہمیں کتابوں کے کیڑے بننے کی ضرورت نہیں۔ ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہے۔ اسکی تعلیم ہمیں مل چکی ہے۔ ہم فرانس اور اسپین کا ناچ جانتے ہیں۔ آپ نے اس کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کا ذکر انگریزی ناولوں میں پڑھا ہوگا۔ پیانو پر بٹھا دیجئے۔ وہ راگ الاپوں کہ بیتھوون[1] اور موزارٹ[2] بھی شرمندہ ہو جائیں۔ انگریزی آداب و اخلاق کے ہم ماہر ہیں ہم جانتے ہیں۔ کہ کس موقع پر سولا ہیٹ پہننا چاہیئے۔ کس موقعہ پر پگڑی ہم

[1]۔ [2] یوروپ کے نامی بیتھوون اور موزارٹ[illegible]

کتابیں بھی پڑھتے ہیں۔ آپ ہمارے کمرے میں کئی الماریاں کتابوں سے سجی ہوئی پائیں گے۔ پر اُن کتابوں میں چمٹتے نہیں، آپ کی اس تجویز کے نفاذ سے ہمارا قلع قمع ہو جائیگا۔ اور پھر میرا تو عقیدہ ہے۔ کہ جب تک انسان مدرسۂ حُسن میں شاگردی نہ کرلے۔ اس کے مزاج میں نفاست اور لطافت نہیں آتی، پُرانے زمانہ میں لوگ اس مدرسہ میں خوش طبعی، خوشگوئی۔ خوش فہمی کی تعلیم پاتے تھے، آج کل کے تعلیم یافتہ حضرات جو بالکل روکھے۔ خشک۔ بے مذاق ہوتے ہیں اِس کا باعث صرف یہی ہے۔ کہ وہ اس مدرسہ سے بے فیض رہتے ہیں۔ تان سین کے تان اور سورداس کے پد بھی اُنکی طبیعت کو گرم نہیں کرسکتے، یہ تجویز اس بداخلاقی اور خشک دلی کا رنگ اور بھی پختہ کردیگی، میں اس سے ہرگز اتفاق نہیں کرسکتا"۔

کنور صاحب کی اس ظریفانہ اور طنز آمیز تقریر نے دونوں فریق کو مطمئن کردیا۔

ڈاکٹر شیاما چرن نے کنور صاحب کی طرف دیکھکر کہا "میں اس مسئلہ کے متعلق کاؤنسل میں چند سوالات پیش کرنے والا ہوں۔ جب تک گورنمنٹ ان کا کوئی جواب نہ دے۔ میں اپنی رائے نہیں ظاہر کرسکتا"۔

یہ کہہ کر انھوں نے اپنے سوالات پڑھ کر سنا دیئے۔

رمیش دت نے کہا "گورنمنٹ ان سوالات کا غالباً کوئی جواب نہ دے سکے گی"۔

ڈاکٹر صاحب۔ جواب ملے یا نہ ملے۔ سوال تو ہو جائے گا۔ اس کے سوا ہم اور کر ہی کیا سکتے ہیں؟

سیٹھ بل بھدر داس کو یقین ہو گیا۔ کہ میدان ہمارے ہاتھ رہے گا۔ انہوں نے ایک مدلل تقریر میں اس تجویز کے ہر ایک پہلو سے بحث کی اور فرمایا "میں تمدنی انقلاب کا موئد نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے۔ کہ سوسائٹی بر وقت ضرورت اپنی ترمیم خود بخود کر لیا کرتی ہے۔ اُسے کسی مصلح کی ضرورت نہیں۔ اور جب تک وہ ترمیم عام طور سے مسلّم نہ ہو جائے۔ کوئی خارجی تحریک اسے پیدا نہیں کر سکتی۔ غیر ملکی سفر کی رُکاوٹیں۔ ذات پات کی تفریق۔ کھانے پینے کے بے معنی قیود۔ سب کے سب حالات روزگار کے سامنے سر جھکاتے چلے جاتے ہیں۔ میں ان معاملات میں سوسائٹی کو بالکل آزاد رکھنا چاہتا ہوں ہم لوگ حُریت پر جان دیتے ہیں۔ کیا ملکی حُریت تمدنی آزادی کے بغیر حاصل ہو سکتی ہے؟ جس وقت قوم ہم آواز ہو کر کہے گی۔ کہ بالاخانوں پر یہ صورتیں دیکھنی ہمیں پسند نہیں۔ تو دنیا میں ایسی کوئی طاقت نہیں ہے جو اس آواز کو اَن سُنی کر سکے۔" سیٹھ جی نے اپنی پُر معنی تقریر کا خاتمہ اِن الفاظ پر کیا:-

"آپ کو اپنے فن موسیقی پر بجا ناز ہے۔ جو لوگ اٹلی اور فرانس کے نغمات کا لطف اُٹھا چکے ہیں۔ وہ بھی ہمارے نغمہ کی لطافت۔ تاثیر اور روحانیت کے قایل ہیں۔ مگر وہی فرقہ جسکی بیخکنی پر ہمارے چند سرگرم احباب تُلے ہوئے ہیں۔ اس پاکیزہ اور بہشتی نعمت کا پاسبان بنا ہُوا ہے۔ کیا آپ اس فرقہ کو نیست و نابود کر کے اپنے بزرگوں کے اس بے بہا ترکہ کو اس بیداری سے خاک میں ملا دیں گے؟ کیا آپ نہیں جانتے۔ کہ ہم میں اسوقت جو کچھ قومی

اور مذہبی جذبات باقی رہ گئے ہیں۔ اور ناموران سلف سے جو کچھ عقیدت ہے۔ وہ خاصتہً اسی فن کا طفیل ہے۔ ورنہ آج کوئی رام اور کرشن۔ شیو اور شنکر کا نام بھی نہ جانتا؟ ہمارا بڑے سے بڑا دشمن بھی ہمارے دلوں سے قومیت کا احساس مٹانے کے لئے اس سے بہتر تدبیر خیال میں نہیں لاسکتا۔ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ یہ فرقہ تخریب اخلاق کا معاون نہیں۔ یہ دعوے کرنا واقعات پر خاک ڈالنا ہے۔ لیکن مرض کا علاج موت نہیں۔ دوا ہے۔ کوئی مذموم رسم تحقیر اور تذلیل سے نہیں مٹتی۔ اُسکی اصلاح تعلیم۔ ہمدردی اور اخلاق سے ہوتی ہے۔ جنت میں پہنچنے کے لئے کوئی سیدھا راستہ نہیں ہے۔ پُل صراط پر سے ضرور گزرنا ہوگا۔ جو لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ وہ کسی پیغمبر کی دُعا اور شفاعت سے کود کر جنت میں جا بیٹھیں گے۔ وہ اُن سے زیادہ قابل خندہ زنی نہیں ہیں۔ جو سمجھتے ہیں۔ کہ چوک سے ارباب نشاط کو خارج کرتے ہی ہندوستان کے روزِ سیاہ کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اور ایک نیا آفتاب روشن ہو جائیگا۔ ہمارے بعض احباب نے اس مسئلہ کے صرف مالی پہلو پر نگاہ ڈالی ہے۔ لیکن میں مسٹر رستم بھائی اور پنڈت پربھاکر راؤ کا ہم خیال ہوں بیشک اخلاق۔ کے مقابلہ میں مالی نقصانات کی کوئی وقعت نہیں۔ تاہم مشتبہ اور مشکوک اخلاقی نتائج کے لئے ہیں خطیر اور کثیر مالی نقصان برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ اگر آپ نے سرمایہ داروں کے جذبات کا لحاظ نہ کر کے بورڈ میں اس تجویز کو پاس کرانا چاہا۔ تو آپ کو اُن سے شکایت کا کوئی موقعہ نہ ہونا چاہئے۔ اگر وہ ہر ممکن ذریعہ سے اپنے اغراض کی محافظت

کریں۔ اپنے سرمایہ دار احباب سے بھی میرا یہ التماس ہے۔ کہ دولت کے ساتھ اُسکی ذمہ واریاں بھی ہوتی ہیں۔ قومی تحریکیں اہل دولت ہی کی فیاضیوں پر نشو و نما پاتی اور زندہ رہتی ہیں + مجھے اُمید ہے۔ کہ وہ مخالفت کی دُھن میں دائرہ اعتدال سے تجاوز نفرمائیں گے"+



جس طرح کوئی آلسی آدمی کسی کے پکارنے کی آواز سُن کر بیدار ہو جاتا ہے۔ مگر پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر نیند میں مست ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پنڈت کرشن چندر غصّہ اور خفت کے جوش کے فرو ہوتے ہی اپنے فرض سے بیخبر ہو گئے۔ انھوں نے سوچا۔ میرے یہاں رہنے سے پنڈت اُمانا تھ پر ایسا کون سا بار پڑ رہا ہے۔ آدھ سیر آٹا ہی تو کھاتا ہوں۔ یا اور کچھ؟ لیکن اُسی دن سے انہوں نے نیچے آدمیوں کے ساتھ بیٹھکر چرس پینا چھوڑ دیا۔ اب وہ اکثر برآمدے میں بیٹھے ہوتے سامنے سے گزرنے والی عورتوں کو گھورا کرتے۔ وہ ہر ایک معاملہ میں اُمانا تھ کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ کھانا کھاتے وقت جو کچھ سامنے آجاتا۔ وہ چپ چاپ کھا لیتے۔ خواہش رہنے پر بھی کچھ اور نہ مانگتے۔ وہ کتنی ہی باتیں محض تملق سازی کے لئے اُمانا تھ سے کہتے۔ اُنکی خودداری غائب ہو گئی تھی +

اُمانا تھ شاننا کی شادی کے بارے میں جب اُن سے کچھ کہتے۔ تو وہ فروتنی سے جواب دیتے "آپ جو چاہیں کریں۔ اس کے آپ ہی مالک ہیں۔" وہ اپنے تئیں سمجھاتے۔ جب ان کے روپے خرچ ہو رہے ہیں تو

ہر ایک کام انہیں کی مرضی کے موافق ہونا چاہئے +

لیکن اُمانا تھ اُنکی دلشگاف باتیں نہ بھولے تھے۔ آبلے پر مکھن لگانے سے ایک لمحہ کے لئے تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر سوزش ہونے لگتی ہے+ کرشن چندر کی ندامت آمیز باتیں اُمانا تھ کو جلد بھول گئیں۔ اور اُن کے احسان فراموشانہ الفاظ کانوں میں گونجتے رہے، جب وہ اندر سونے گئے۔ تو جاہنوی نے پوچھا۔ "آج لالہ جی تم سے کیا بگڑ رہے تھے"؟

اُمانا تھ نے شکوہ آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "میرا جس گا رہے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ تم نے مجھے لوٹ لیا۔ میری بیوی کی جان لی۔ میری ایک لڑکی کو کنوئیں میں ڈال دیا۔ اور دوسری لڑکی کو کوس کوس کر مار ڈالتے ہو+

جاہنوی۔ تو تمہارے منہ میں زبان نہ تھی؟ کہا ہوتا۔ کیا میں کسی کو نیوتہ دینے گیا تھا؟ کہیں تو ٹھکانہ نہ تھا۔ در بدر ٹھوکر یں کھاتی پھرتیں۔ بکرا جی سے گیا۔ کھانے والے کو مزہ ہی نہ آیا۔ یہاں لاج ڈھوتے ڈھوتے مر گئے۔ اس کا یہ پھل! اتنے دنوں تھانہ داری کی۔ ہزاروں کمائے۔ پر گنگا جی نے کبھی بھولکر بھی ایک ڈبیا سیندور نہ بھیجی۔ میرے سامنے کہا ہوتا۔ تو ایسی ایسی سناتی کہ دانت کھٹے ہو جاتے+ دو جوان جوان لڑکیاں گلے پر سوار کر دیں۔ اُس پہ بولنے کو مرتے ہیں۔ اُن کے پیچھے فقیر ہو گئے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے۔ اب سے اپنا پورا نبیکر کہیں کیوں نہیں جاتے؟ کیوں پاؤں میں مہندی رچائے بیٹھے ہیں؟

اُمانا تھ۔ اب تو جانے کو کہتے ہیں۔ اسی لئے تم سے سمدھن کا پتہ پوچھا تھا +

جاہنوی۔ تو کیا اب بیٹی کے گلے پڑیں گے۔ واہ رے بے غیرت +

اُمانا تھ۔ نہیں ایسا کیا کریں گے۔ شاید دو چار دن وہاں ٹھہریں +
جانھوی۔ کہاں کی بات۔ ان سے اب کچھ نہ ہوگا۔ انکی آنکھوں کا پانی مرگیا۔
جا کے اُسی کے سر پڑیں گے۔ مگر دیکھ لینا وہاں ایک دن بھی نباہ نہ ہوگا +

اُمانا تھ نے ابتک سمن کی حیا فروشی کی داستان جانھوی سے چھپائی تھی۔ وہ جانتے تھے۔ کہ عورتوں کے پیٹ میں بات نہیں پچتی۔ یہ کسی نہ کسی سے ضرور ہی کہدیگی۔ اور راز طشت از بام ہوجائے گا۔ جب کبھی وہ جانھوی کی دلجوئیوں سے خوش ہوتے۔ تو اس سے یہ داستان کہنے کی اُنہیں بڑی پُر زور تحریک ہوتی۔ دل میں ایک ہلچل ہونے لگتی۔ لیکن نتیجہ کا خیال کر کے ضبط کر جاتے تھے + پر آج کرشن چندر کی ناشناسی اور جانھوی کی ہمدردانہ دمسازیوں نے انہیں رام کر لیا۔ پیٹ میں بات نہ رُک سکی جیسے کسی نالی میں رُکی ہوئی چیز اندر سے پانی کا زور پاکر باہر نکل پڑے۔ اُسی طرح سمن کی رام کہانی ان کے مُنہ سے نکل پڑی۔ انہوں نے سارا قصّہ بیان کر دیا۔ رات کو جب آنکھ کھُلی تو انہیں اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ پر تیر کمان سے نکل چکا تھا +

جانھوی نے شوہر سے وعدہ تو کیا تھا۔ کہ یہ راز کسی سے نہ کہونگی۔ پر اب اُسے اپنے سینہ پر ایک بوجھ سا رکھا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ کسی کام میں اُس کا جی نہ لگتا۔ وہ اُمانا تھ پر جھنجھلاتی۔ کہ کہاں سے کہاں انہوں نے مجھ سے یہ بات کہی۔ اُسے سمن سے نفرت نہ تھی۔ ہمدردی نہ تھی۔ غصّہ نہ تھا۔ محض ایک عبرت خیز تذکرہ کا۔ انسان کی اخلاقی پستی پر رائے زنی کرنے کا مسالہ ملتا تھا۔ عورتوں کی تعلیم کے خلاف کیسی پُر زور دلیل تھی! جانھوی اس لذّت افشا سے اپنے تئیں بہت دنوں تک محروم نہ رکھ سکی۔ یہ محال تھا۔ یہ ان

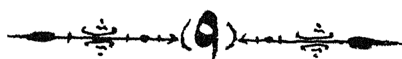
چند نیک سرشت عورتوں کے ساتھ بیوفائی تھی۔ جو اپنے گھر کا رتی رتی حال اس سے کہدیا کرتی تھیں۔ ماسوا اس کے جاھنوی کو یہ جاننے کی خواہش بھی کچھ کم نہ تھی۔ کہ دوسری عورتیں اس معاملہ پر کیا گل فشانیاں کرتی ہیں، وہ کئی دنوں تک اپنے دل کو روکتی رہی۔ ایک دن کُنبیر پنڈت کی بیوی سُبھاگی نے آکر کہا۔ "بہن آج ایکادشی ہے۔ گنگا نہانے چلوگی"؟

جاھنوی کا سبھاگی سے بہت میل تھا۔ بولی "چلتی تو پر یہاں تو دروازہ پر ایک جم دوت بیٹھا ہُوا ہے۔ اُس کے مارے کہیں ہلنے پاتی ہوں"۔

سبھاگی۔ بہن انکی باتیں تم سے کیا کہوں شرم آتی ہے۔ میرے گھر والے سُن لیں تو سر کاٹنے پر آتارو ہوجائیں، کل میری بڑی لڑکی کو سُنا سُنا کر نہ جانے کون گیت گا رہے تھے۔ آج سویرے میں نے اُسے اُن کے ساتھ کنوئیں پر ہنستے دیکھا، بہن تم سے کون پردہ ہے۔ کوئی نیک و بد ہو گیا۔ تو سارے گاؤں کی ناک کٹ جائے گی، یہ بوڑھے ہوئے۔ انہیں ایسا چاہئے، میری لڑکی سمن سے دو ایک سال بڑی ہوگی۔ اور کیا۔ بھلا سالی ہوتی، تو ایک بات تھی۔ وہ تو انکی بھی بیٹی ہی ہوتی ہے، انکو اتنا بھی بچار نہیں ہے کہیں میرے پنڈت جی سُن لیں۔ تو خون خرابہ ہو جائے۔ تم سے کہتی ہوں کسی طرح آڑے بُلا کر انہیں سمجھا دو"۔

اب جاھنوی سے نہ ضبط ہو سکا۔ اُس نے سمن کی ساری کتھا سبھاگی سے خوب نمک مرچ لگا کر بیان کی۔ جب کوئی ہم سے اپنے راز کہدیتا ہے۔ تو ہم اُس سے اپنے راز پوشیدہ نہیں رکھ سکتے۔

دوسرے ہی دن کبیر پنڈت نے اپنی لڑکی کو سسرال بھیجدیا۔ اور دل میں عہد کیا۔ کہ اس ذلت کا بدلہ ضرور لوں گا +



سدن سنگھ کی شادی کا روز سعید آپہنچا۔ چنار سے برات امولا چلی۔ اسکی تفصیل لکھنی تضیع اوقات ہے۔ جیسی اور براتیں ہوتی ہیں۔ ویسی ہی یہ بھی تھی۔ وحشیانہ تکلف اور دردانگیز پریشان حالی کا عجیب اجتماع۔ پالکیوں پر زربفت کی جھولیں پڑی ہوئی۔ لیکن کہاروں کی وردیاں بوسیدہ اور کرم خوردہ + گنگا جمنی کے عصا۔ اور علم نیم برہنہ مزدوروں کے ہاتھ میں +

امولا یہاں سے کوئی دس کوس تھا۔ راستہ میں ایک ندی پڑتی تھی۔ بارات کشتیوں پر اُتری۔ ملاحوں سے مزدوری کے لئے گھنٹوں سر مغزن ہوا۔ تب کہیں جا کر انہوں نے ناویں کھولیں۔ مدن سنگھ نے بگڑ کر کہا۔ "نہ ہوتے تم لوگ ہمارے گاؤں میں۔ نہیں تو اتنی بیگار لیتا۔ کہ یاد کرتے"۔ لیکن پدم سنگھ ملاحوں کی اس جرأت پر خوش تھے۔ اُنہیں اس میں ملاحوں کی حریت پسندی کی جھلک دکھائی دیتی تھی +

شام کے وقت برات امولا پہنچی۔ پدم سنگھ کے محرر صاحب نے پہلے ہی سے شامیانہ نصب کر رکھا تھا۔ کئی چھولداریاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ چھولداریوں کے سامنے گیس کی لالٹینیں تھیں۔ شامیانہ شیشہ و آلات سے آراستہ تھا۔ کارچوبی مسند۔ گاؤ تکئے۔ خاصدان۔ گلاب پاش وغیرہ سب موقع سے رکھے

ہوئے تھے۔ دھوم تھی۔ کہ ناچ کے کئی ڈیرے آ رہے ہیں ۔

دوار پوجا ہوئی۔ اُمانا تھ کندھے پر ایک انگوچھا ڈالے براتیوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ گاؤں کی عورتیں سائباں میں کھڑی منگلاچرن گا تی تھیں۔ براتیوں کی نظر انتخاب بہترین حُسن کی تلاش میں سرگرم تھی۔ اُدھر سے بھی آنکھوں کی کٹاریں براتیوں کا سنتھراؤ کئے دیتی تھیں۔ جاھنوی اُداس تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کہ یہ دولھا میری چندرا کو ملتا۔ تو اچھا ہوتا۔ سبھاگی یہ جاننے کے لئے بیقرار تھی۔ کہ سمدھی کون ہے۔ کرشن چندر سدن سنگھ کے پیر دھو رہے تھے۔ اور دل میں کہہ رہے تھے۔ یہ کیسا بیہودہ رواج ہے۔ مدن سنگھ دھیان سے دیکھ رہے تھے۔ کہ تھال میں کتنے روپے ہیں ۔

برات جنواسے چلی۔ رسد سامان تقسیم ہونے لگا۔ وہ ہڑبونگ مچا کہ الاماں! ایک طرف سے اَور کے لئے اصرار۔ دوسری طرف صاف انکار۔ کوئی کہتا تھا۔ مجھے گھی کم ملا۔ کوئی فریاد کرتا تھا۔ مجھے اپلے نہیں ملے۔ لالہ بیجنا تھ شراب کے لئے پُر بضد تھے۔ براتسے روٹھے جاتے تھے۔ کئی آدمی ایسے نہیں منا رہے تھے ۔

سامان تقسیم ہوگیا۔ تو لوگوں نے اُپلے جلائے۔ اور ہانڈیاں چڑھائیں۔ دھوئیں سے آسمان سیاہ ہوگیا۔ گیس کی روشنی زرد پڑگئی ۔

سدن مسند لگا کر بیٹھا۔ محفل آراستہ ہوئی۔ عطر و پان سے تواضع ہونے لگی۔ سانگیت و دِیالہ کے کلاونتوں نے طنبورے سنبھالے۔ شیام کلیان کی دلاویز دھن گونجنے لگی۔ ہزاروں آدمی شامیانے کے چاروں طرف جمع تھے۔

کچھ لوگ مرزائیاں پہنے۔ پگڑیاں باندھے ہاتھ میں تنباکو اور چھالیہ کا بٹوا لئے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے۔ ڈیرے کہاں ہیں؟ کوئی اس چھولداری میں جھانکتا تھا۔ کوئی اُس چھولداری میں اور حیرت سے کہتا تھا۔ کیسی بارات ہے۔ کہ ایک ڈیرا بھی نہیں۔ کہاں کے کنگلے ہیں۔ یہ بڑا سا شامیانہ کاہے کو کھڑا کر رکھا ہے۔ شیام کلیان کی دھن انہیں بے مزہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ نغمے کے نہیں۔ دیدار کے رسیا تھے۔ ناز و ادا کے بھوکے۔ مدن سنگھ یہ باتیں سُن سُنکر دل میں پدم سنگھ پر کُڑ بڑا رہے تھے۔ اور پدم سنگھ شرم اور خوف کے مارے انکے روبرو آتے ہوئے ڈرتے تھے۔

اتنے میں لوگوں نے شامیانے پر پتھر پھینکنے شروع کئے۔ لالہ بیجناتھ اُٹھکر چھولداری میں بھاگے۔ کچھ لوگ ان مفسدوں کو گالیاں دینے لگے۔ ایک ہلچل مچگئی۔ کوئی اِدھر بھاگا۔ کوئی اُدھر۔ کوئی گالی بکتا تھا۔ کوئی مار پیٹ پر آمادہ تھا۔ دفعتہً ایک تناور۔ قوی ہیکل سادھو سر منڈائے۔ بھسم لگائے۔ ہاتھ میں ایک ترشول لئے آکر شامیانہ میں کھڑا ہو گیا۔ اسکی لال لال آنکھیں چراغ کی طرح جل رہی تھیں۔ چہرہ سے رعب اور جلال برستا تھا۔ محفل پر سناٹا چھا گیا۔ سب لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سادھو کو دیکھنے لگے۔ یہ کون ہے؟ کہاں سے آگیا؟

سادھو نے ترسول جھنکار کر ملامت آمیز انداز سے کہا:-

”ہائے افسوس! یہاں کوئی ناچ نہیں۔ کوئی رنڈی نہیں! سب بادا

لوگ اُداس بیٹھے ہیں۔ شیام کلیان کی دُھن کیسی منوھر ہے۔ پر کوئی نہیں سُنتا۔ کسی کے کان نہیں۔ سب ناچ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یا تو انہیں ناچ دکھاؤ۔ یا اپنے سر تڑواؤ۔ چلو میں ناچ دکھاؤں۔ دیوتاؤں کا ناچ دیکھنا چاہتے ہو؟ دیکھو سامنے درخت کی پتیوں پر نرمل چاند کی کرنیں کیسی ناچ رہی ہیں؟ دیکھو تالاب میں کمل کے پھول پر پانی کی بوندیں کیسی ناچتی ہیں۔ جنگل میں جاکر دیکھو۔ مور پر پھیلائے کیسا ناچ رہا ہے۔ کیا یہ دیوتاؤں کا ناچ پسند نہیں ہے؟ اچھا چلو بھوتوں کا ناچ دکھاؤں۔ تمہارا پڑوسی غریب کسان زمیندار کے جوتے کھاکر کیسے ناچ رہا ہے۔ تمہارے بھائیوں کے یتیم بچے بھوک سے باولے ہوکر کیسے ناچ رہے ہیں۔ اپنے گھر میں دیکھو۔ تمہاری بیوہ بھاوج کی آنکھوں میں درد اور غم کے آنسو کیسے ناچتے ہیں۔ یہ ناچ بھی پسند نہیں؟ تو اپنے من میں دیکھو کپٹ اور چھل کیسا ناچ رہا ہے۔ مَد اور موہ کیسا تھرک رہا ہے۔ سارا سنسار رنگ بھوم ہے۔ اُس میں سب اپنا اپنا ناچ ناچ رہے ہیں۔ کیا یہ دیکھنے کے لئے تمہاری آنکھیں نہیں ہیں؟ آہ! گیان کے مورکھو، شہوت کے غلامو! تمہیں ناچ کا نام لیتے لاج نہیں آتی۔ اپنی بھلائی چاہتے ہو۔ تو اس ریت کو مٹاؤ۔ نفس پرستی چھوڑو۔ اس گندے کیچڑ سے نکلو۔"

ساری محفل پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لوگ صورت تصویر بنے ہوئے سادھو کی مجذوبانہ تقریر سُن رہے تھے۔ کہ دفعتہً وہ غائب ہوگئے۔ اور سامنے والے آم کے درختوں کی آڑ سے اُن کے نغمۂ شیریں کی صدا سُنائی دینے

مدن سنگھ - تم نے وہ کام کیا ہے۔ کہ اگر تمہارا گلا کاٹ لوں۔ تو عین ثواب ہو۔ جس لڑکی کی بہن آوارہ ہو جائے۔ اُس کے لئے تمہیں میرا ہی گھر تاکنا تھا؟

اُمانا تھ نے دبی زبان سے کہا۔ "مہاراج! دوست دشمن کس کے نہیں ہوتے۔ اگر کسی نے مجھ پر کوئی تہمت لگائی ہو۔ تو آپ کو اس پر یقین نہ کرنا چاہئے اس آدمی کو بلوایئے۔ جو کچھ کہنا ہو۔ میرے مُنہ پر کہئے"۔

پدم سنگھ - ہاں بہت ممکن ہے۔ کہ یہی بات ہو۔ اس آدمی کو بُلوانا چاہئے۔

مدن سنگھ نے بھائی کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "تم کیوں بیچ میں بولتے ہو جی؟ (اُمانا تھ سے) ممکن ہے۔ تمہارے کسی دشمن نے ہی کہی ہو۔ لیکن یہ بات سچی ہے یا نہیں؟"

اُمانا تھ - کون بات؟

پدم سنگھ - یہی کہ سمن اس لڑکی کی سگی بہن ہے۔

اُمانا تھ کا چہرہ زرد ہو گیا۔ شرم سے سر جھک گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بولے۔ "مہاراج ....."

مدن سنگھ نے گرج کر کہا۔ "صاف کیوں نہیں کہتے۔ یہ بات سچ ہے یا جھوٹ؟"

اُمانا تھ نے پھر جواب دینا چاہا۔ لیکن "مہاراج" کے سوا اور زبان سے کچھ نہ نکلا۔

مدن سنگھ کو اب کوئی شبہ نہ رہا۔ غصہ کی آگ دہک اٹھی۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ جسم کانپنے لگا۔ اُمانا تھ کی طرف آتشیں نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ "اب اپنی خیریت چاہتے ہو۔ تو میری نگاہوں سے دور ہو جاؤ۔ کمبخت

دغاباز۔ بے ایمان کہیں کا۔ تیلک لگا کے پنڈت بنا پھرتا ہے۔ اب تیرے دروازے پر پانی نہ پیوں گا۔ اپنی لڑکی کو جنتر بنا کے گلے میں پہن"۔

یہ کہہ کر مدن سنگھ جھلا اٹھے۔ اور اس چھولداری میں چلے گئے۔ جہاں سدن پڑا سو رہا تھا۔ اور زور سے چلا کر کہاروں کو پکارا۔

ان کے جانے کے بعد اُما ناتھ نے پدم سنگھ سے کہا "وکیل صاحب! کسی طرح پنڈت جی کو منائیے۔ میں کہیں مُنہ دکھانے کے لائق نہ رہوں گا۔ سمن کا حال تو آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ اُس ابھاگنی نے ہمارے مُنہ میں کالکھ لگا دی۔ ایشور کی یہی مرضی تھی۔ پر اب گڑے مردے اُکھاڑنے سے کیا فایدہ۔ آپ ہی انصاف کیجیے۔ میں اس معاملے کو چھُپانے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا؟ اِس لڑکی کی شادی تو کرنی ہی تھی۔ بلا چھپائے کیونکر کام چلتا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ مجھے یہ بات آپ کے یہاں شادی طے ہو جانے کے بعد معلوم ہوئی"۔

پدم سنگھ نے متفکرانہ انداز سے جواب دیا "بھائی صاحب کے کانوں میں بات نہ پڑی ہوتی۔ تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ دیکھئے میں اُن کے پاس جاتا ہوں۔ پر اُن کا راضی ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے"۔

مدن سنگھ کہاروں سے چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔ کہ جلد یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ سدن بھی اپنے کپڑے سمیٹ رہا تھا۔ مدن سنگھ نے اُس سے ساری حقیقت بیان کر دی تھی۔ اتنے میں پدم سنگھ نے آکر واعظانہ انداز سے کہا "بھیا اتنی عُجلت نہ کیجیے۔ ذرا سوچ سمجھ کر کام کیجیے۔ دھوکا تو ہو ہی گیا۔ پر یوں دا پس جانے سے تو اور بھی جگ ہنسائی ہو گی"۔

سمن نے چچا کی طرف نگاہ ملامت سے دیکھا۔ اور مدن سنگھ نے استعجاب سے۔ پدم سنگھ نے پھر کہا" دوچار آدمیوں سے پوچھئے۔ اُنکی صلاح لیجئے۔ دیکھئے اُنکی کیا رائے ہے"؟

مدن سنگھ۔ کیا کہتے ہو۔ کیا جان بوجھ کر مکھی نگل جاؤں؟

پدم سنگھ۔ اس میں کم سے کم جگ ہنسائی تو نہ ہوگی +

مدن سنگھ۔ تم ابھی لڑکے ہو۔ یہ باتیں کیا جانو۔ جاؤ واپسی کا سامان کرو۔ اس وقت کی جگ ہنسائی اچھی ہے۔ خاندان میں تو داغ نہ لگے گا +

پدم سنگھ۔ لیکن یہ تو خیال کیجئے۔ کہ اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا۔ اس بیچاری نے کیا خطا کی ہے +

مدن سنگھ نے جھڑک کر کہا" تم تو ہو بڑے احمق۔ چل کر ڈیرے لدواؤ۔ کل کو کوئی بات پڑ جائیگی۔ تو تمہیں طعنے دوگے۔ کہ روپوں پر پھسل پڑے۔ ان معاملات میں وکالت کام نہیں دیتی" +

پدم سنگھ نے خفت آمیز لہجہ میں کہا" مجھے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں مطلق عذر نہیں ہے۔ لیکن افسوس یہی ہے۔ کہ اس لڑکی کا کیا حال ہوگا۔ بیچاری کی زندگی خراب ہو جائے گی" +

مدن سنگھ۔ تم خواہ مخواہ غصّہ دلاتے ہو۔ لڑکی کا میں نے ٹھیکہ لیا ہے۔ جو کچھ اسکی تقدیر میں ہے ہوگا۔ مجھ سے مطلب؟

پدم سنگھ نے مایوسانہ انداز سے کہا" سمن بائی کی تو یہاں مطلق آمد رفت نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اُسے ترک کر دیا ہے +

مدن سنگھ۔ میں نے تم سے کہہ دیا۔ کہ مجھے غصہ نہ دلاؤ۔ تمہیں ایسی باتیں زبان سے نکالتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ بڑے رفارمر کی دُم بنے ہو۔ ایک ہرجائی کی بہن سے اپنے بیٹے کا بیاہ کر لوں؟ چھی چھی! تمہاری عقل پر پردہ پڑ گیا ہے کیا؟

پدم سنگھ نے خفیف ہو کر سر جھکا لیا۔ ان کا دل کہہ رہا تھا۔ کہ بھائی صاحب اسوقت جو کچھ کر رہے ہیں۔ وہی شاید ایسی حالت میں میں بھی کرتا۔ لیکن نتائج کا خیال کر کے انہوں نے ایکبار پھر بولنے کی جرأت کی۔ جس طرح کوئی طالب علم نتیجہ کے گزٹ میں اپنا نام نہ پا کر مایوس ہوتے ہوئے بھی غلط نام کی طرف لپکتا ہے۔ اسی طرح پدم سنگھ اپنے تئیں دھوکا دے کر بھائی سے دبی زبان سے بولے "سُمن بائی بھی تو اب بدھوا آشرم میں داخل ہو گئی ہے"۔

پدم سنگھ سر نیچا کئے باتیں کر رہے تھے۔ بھائی سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ یہ الفاظ مُنہ سے نکلے ہی تھے۔ کہ دفعتہً مدن سنگھ نے انہیں اتنے زور سے دھکا دیا۔ کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ چونک کر سر اٹھایا۔ مدن سنگھ کھڑے غصہ سے کانپ رہے تھے۔ نفریں اور ملامت کے وہ سخت الفاظ جو اُن کے مُنہ سے نکلنے والے تھے۔ پدم سنگھ کو زمین پر گرتے دیکھ کر ندامت اور تاسف سے دب گئے۔ اُنکی اس وقت وہی حالت تھی۔ جب انسان غصہ میں اپنا ہی گوشت کاٹنے لگتا ہے۔

یہ آج زندگی میں پہلا موقعہ تھا۔ کہ پدم سنگھ نے بھائی کے ہاتھوں یہ ذلت اُٹھائی۔ سارا لڑکپن گزر گیا۔ بڑی بڑی شرارتیں کیں۔ مگر بھائی نے کبھی ہاتھ نہ اُٹھایا۔ کبھی تیز نگاہوں سے نہ دیکھا۔ سخت صدمہ ہوا۔ بچوں کی طرح سسکنے لگے۔

ہچکیاں لیتے تھے۔ آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ مگر دل میں غصہ کا شائبہ بھی نہ تھا۔ صرف یہی خیال دل کو مسوس رہا تھا۔ کہ جس نے ہمیشہ پیار کیا کبھی کوئی سخت بات نہیں کہی۔ اُسے آج میری ضد سے اتنا ملال ہُوا۔ یہ مار نہیں ہے۔ یہ مایوسی اور غرورِ شکستہ اور حسِ شرم کا عملی ثبوت ہے! یہ دل پر غم کا نالۂ درد ہے۔ یہ سوزِ نہاں کا شعلہ ہے۔ یہ مقیاس الحرارت ہے۔ تپِ دروں کا۔ سدن نے جلدی سے پدم سنگھ کو اُٹھایا۔ اور اپنے باپ کی طرف غضبناک نظروں سے دیکھ کر بولا "آپ تو جیسے باولے ہو گئے ہیں"+

اتنے میں کئی آدمی آگئے۔ اور پوچھنے لگے۔ مہاراج کیا بات ہوئی؟ بارات کو لوٹنے کا حکم کیوں دیتے ہیں؟ ایسا کچھ کیجئے۔ کہ دونوں طرف کی آبرو قائم رہے۔ اب انکی اور آپ کی عزت ایک ہے۔ لین دین میں اگر کچھ کمی بیشی ہو تو آپ ہی دب جائیے۔ نارائن نے آپ کو کیا نہیں دیا ہے؟ انکی دولت سے آپ کے پاس تھوڑے ہی دولت ہو جائیگی۔ مدن نے کسی کو کچھ جواب نہ دیا+

محفل میں کھلبلی پڑ گئی۔ ایک دوسرے سے پوچھتا تھا۔ کیا ماجرا ہے؟ چھولداری کے سامنے آدمیوں کا ہجوم بڑھتا جاتا تھا+

محفل میں لڑکی کی طرف کے کتنے ہی آدمی تھے۔ وہ اُمانا تھ سے پوچھنے لگے "بھیا یہ لوگ بارات لوٹانے پر کیوں آمادہ ہیں؟" جب اُمانا تھ نے کوئی قابلِ اطمینان جواب نہ دیا۔ تو وہ سب آکر مدن سنگھ سے منتیں کرنے لگے ہم لوگوں سے کیا خطا ہوئی ہے۔ اور جو سزا چاہے دیجئے۔ پر بارات نہ

لوٹلیے نہیں تو سارا گاؤں بدنام ہو جائے گا۔ مدن سنگھ نے اُن سے صرف اتنا کہا۔ اُس کا سبب جا کر اُمانا تھ سے پوچھو۔ وہی بتائیں گے ۔

پنڈت کرشن چندر نے جب سے مدن کو دیکھا تھا۔ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ بھانوروں کی ساعت قریب تھی۔ وہ بَر کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں کئی آدمیوں نے آکر انہیں یہ کیفیت سُنائی۔ انہوں نے پوچھا۔ کیوں لوٹے جاتے ہیں۔ کیا اُمانا تھ سے کوئی حُجّت ہو گئی ہے ۔

لوگوں نے کہا۔ ”ہمیں نہیں معلوم۔ اُمانا تھ تو کھڑے منا رہے ہیں“ ۔

کرشن چند جھلاتے ہوئے بارات کی طرف چلے۔ بارات کا لوٹانا لڑکوں کا کھیل ہے؟ یہ کوئی گڑیا گڈے کا بیاہ ہے کیا؟ اگر شادی نہیں کرنی تھی۔ تو بارات کیوں لائے تھے؟ دیکھتا ہوں بارات کیسے لوٹتی ہے؟ خون کی ندیاں بہا دونگا۔ یہی نہ ہوگا۔ کہ پھانسی ہو جائیگی۔ پر انہیں اِس کا مزہ چکھا دوں گا۔ کرشن چندر اپنے ساتھیوں سے یہی باتیں کرتے۔ قدم بڑھاتے ہوئے جنواسے میں پہنچے۔ اور للکار کر بولے۔ کہاں ہیں پنڈت مدن سنگھ! مہاراج ذرا باہر آئیے ۔

مدن سنگھ یہ للکار سُن کر باہر نکل آئے۔ اور تند لہجہ میں بولے۔ ”کہئے کیا کہتے ہیں؟“

کرشن چند۔ آپ بارات کیوں لوٹالے جاتے ہیں؟

مدن۔ اپنی طبیعت۔ ہمیں شادی نہیں کرنی ہے ۔

کرشن۔ آپکو شادی کرنی ہوگی۔ یہاں آکر آپ اس طرح نہیں لوٹ سکتے ۔

مدن۔ آپکو جو کرنا ہو کیجئے۔ ہم شادی نہیں کرتے ۔

کرشن۔ کوئی سبب ؟
مدن۔ سبب کیا آپ کو نہیں معلوم ہے ؟
کرشن۔ جانتا تو آپ سے کیوں پوچھتا +
مدن۔ تو پنڈت اُما ناتھ سے پوچھئے +
کرشن۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں ؟
مدن۔ بات دبی رہنے دیجئے۔ میں آپکو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا +
کرشن۔ اچھا! سمجھ گیا۔ میں جیل خانہ ہو آیا ہوں۔ یہ اُسکی سزا ہے! واہ رے آپکا انصاف!
مدن۔ اس بات پر برات نہیں لوٹ سکتی تھی +
کرشن۔ تو شاید اُما ناتھ نے جہیز کا خراج دینے میں کچھ بُخل کیا ہوگا؟
مدن۔ ہم اتنے کمینے نہیں ہیں؟
کرشن۔ تو پھر ایسی کونسی بات ہے ؟
مدن۔ ہم کہتے ہیں۔ ہم سے نہ پوچھئے +
کرشن۔ آپ کو بتلانا پڑے گا۔ دروازہ پر آکر بارات لوٹائے جانا کیا آپ نے لڑکوں کا کھیل سمجھا ہے۔ یہاں خون کی ندیاں بہ جائیں گی۔ آپ اس بھروسے میں نہ رہئے گا +
مدن۔ اس کا ہمیں غم نہیں۔ ہم یہاں مرجائیں گے لیکن آپ کی لڑکی سے شادی نہ کریں گے، آپ کے گھر اپنی عزت بیچنے اور آبرو گنوانے نہیں آئے ہیں +
کرشن۔ تو کیا ہم آپ سے نیچے ہیں؟

مدن۔ ہاں آپ ہم سے نیچے ہیں۔

کرشن۔ اس کا کوئی ثبوت؟

مدن۔ ہاں ثبوت ہے۔

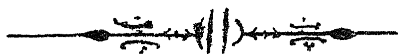
کرشن۔ تو اس کے ظاہر کرنے میں آپ کو کیوں تامل ہوتا ہے؟

مدن۔ اچھا تو سنئے۔ مجھے الزام نہ دیجئیگا۔ آپ کی لڑکی سمن جو اس لڑکی کی حقیقی بہن ہے۔ آوارہ ہو گئی ہے۔ آپ کا جی چاہے تو جا کر اُسے دال منڈی میں دیکھ آیئے۔

کرشن چندر نے بدگمان ہو کر کہا "یہ بالکل جھوٹھ ہے۔ سراسر غلط!"

پھر ایک لمحہ میں اُنہیں یاد آگیا۔ کہ جب میں نے اما ناتھ سے سمن کا پتہ پوچھا تھا۔ تو انہوں نے ٹال دیا تھا۔ کتنے ہی ایسے کنایوں کے معنے سمجھ میں آگئے۔ جو جاہنوی بات بات میں اُن پر کرتی رہتی تھی۔ یقین آگیا۔ شرم سے سر جھک گیا۔ وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ دونوں طرف کے صدہا آدمی وہاں کھڑے تھے۔ لیکن سب کے سب سناٹے میں آگئے۔ کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ معاملہ ایسا نازک تھا۔ کہ وہاں فہمائش کا گذر نہ تھا۔

آدھی رات ہوتے ہوتے ڈیرے خیمے سب اُکھڑ گئے۔ اس باغ میں پھر تاریکی مسلط ہو گئی۔ پھر گیدڑوں کی مجلس آراستہ ہوئی۔ اور اُلّو اپنا راگ گانے لگے۔



بٹھل داس نے سمن کو بدھوا آشرم میں خفیہ طور سے رکھا تھا۔ کارکن کمیٹی

کے کسی رُکن کو اسکی اطلاع ندی تھی۔ آشرم کی بدھواؤں سے کہا تھا۔ یہ بھی بدھوا ہے۔ لیکن منشی ابوالوفا جیسے غواصوں سے یہ بات زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہ رہی۔ انہوں نے ہریا کو ڈھونڈ نکالا۔ اور اس سے سُمن کا پتہ پوچھ لیا۔ تب اپنے دوسرے رنگیں مزاج دوستوں کو بھی یہ مژدہ سُنایا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اُن حضرات کی نظرِ عنایت آشرم پر روز افزوں ہونے لگی۔ کبھی سیٹھ چمن لال آتے۔ کبھی سیٹھ بل بھدر داس۔ کبھی پنڈت جی جلوہ افروز ہوتے۔ اور کبھی منشی ابوالوفا۔ ان بھلے آدمیوں کو اب آشرم کی صفائی اور سجاوٹ۔ اس کی مالی حالت اور دیگر انتظامی امور سے خاص دلچسپی ہوگئی تھی۔ شب و روز آشرم کے فلاح و بہبود کی فکر میں غرق رہتے تھے۔

بٹھل داس سخت مصیبت میں گرفتار تھے۔ بار بار ارادہ کرتے تھے۔ کہ اس خدمت سے استعفا دیدوں۔ کیا میں نے ہی آشرم کا ذمہ لیا ہے؟ کمیٹی میں اور بھی کتنے ہی اصحاب ہیں۔ جو اس کام کو سنبھال سکتے ہیں۔ وہ جو مناسب سمجھیں گے کریں گے۔ مجھے اپنی آنکھوں سے تو یہ اندھیر نہ دیکھنا پڑے گا۔ کبھی سوچتے کیوں نہ ایک دن اُن رنگے سیاروں کو پھٹکاروں۔ پھر جو کچھ ہوگا۔ دیکھا جائیگا۔ لیکن جب سکون کی حالت میں اس مسئلہ پر غور کرتے۔ تو انہیں اس آشرم کا وجود اپنی ہی ذات کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ہی اسکی بنیاد ڈالی ہے۔ میں نے ہی اسے اب تک زندہ رکھا ہے۔ اگر میں نے کنارہ کیا۔ تو چند ہی دنوں میں یہ سرسبز پودا خشک ہو جائیگا۔ ہاں وہ اُن حضرات سے بڑی بے اعتنائی اور بے رُخی سے پیش آتے۔ اُنکی خیر خواہانہ صلاحوں کی

ہنسی اُڑاتے۔ اور کنایتہً ان پر ظاہر کرتے۔ کہ آپ لوگوں کی یہ آمد و رفت مجھے سخت ناپسند ہے، لیکن غرض کے بندے باریک بین نہیں ہوتے۔ دونوں سیٹھ اُنکی باتیں سُنکر خلق مجسم بن جاتے۔ تیواری جی ایسے حلیم وسلیم ہو جاتے گویا انہیں کبھی غصہ آہی نہیں سکتا۔ اُنکی رضاجوئی اور خندہ طبعی بٹھل داس کو نرم کر دیتی تھی +

اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ بٹھل داس انہیں تفکرات میں ڈوبے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ہرچہ بادا باد آج اس خلجان کو مٹا دوں گا۔ آشرم ٹوٹ جائے کوئی مضائقہ نہیں۔ پر اس سے بدرجہا بہتر ہے۔ کہ وہ ایسی نا اہلیوں کا نشانہ بنے۔ دفعتہً ایک فٹن آشرم کے دروازے پر آکر رُکی۔ اُس میں سے کون لوگ اُترے؟ عبداللطیف اور ابوالوفا +

بٹھل داس دل میں تلملا کر رہ گئے۔ جی میں تو آیا۔ کہ دونوں کو دُتکار دوں۔ پر صبر سے کام لیا +

منشی ابوالوفا نے فرمایا "آداب عرض ہے بندہ نواز! آج طبیعت کچھ پریشان ہے کیا۔ واللہ آپ کا ایثار دیکھ کر روح کو تقویت ہوتی ہے۔ کہ ابھی ہم میں کچھ انسان باقی ہیں، خوش نصیب ہے۔ وہ قوم جس میں آپ جیسے سچے خادم موجود ہیں + ایک ہماری خود غرض، خود نما قوم ہے۔ جسے ان باتوں کی حس ہی نہیں۔ جو حضرات بہت نیکنام ہیں۔ وہ بھی غرض سے پاک نہیں +

عبداللطیف۔ جناب ہماری قوم کی کچھ نہ کہئے۔ خود غرض۔ خم دفروش۔ خود

مطلب کج فہم کج رو کج ہیں۔ جو کہتے تھوڑا ہے۔ بڑے بڑوں کو دیکھئے رنگے ہوئے سیار ہیں۔ ریا کا جامہ پہنے ہوتے۔ آپ کی ذات مصدر برکات ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ خداوند تعالےٰ نے زمرہ ملائک میں سے انتخاب کر کے آپ کو اس خوش نصیب قوم پر نازل کیا ہے +

ابوالوفا۔ آپ کی پاک نفسی دلوں پر خواہ مخواہ اثر ڈالتی ہے + آپ کے یہاں کچھ سوزن کاری اور بیل بوٹے کے کام تو ہوتے ہی ہوں گے + میرے ایک دوست نے سوزن کاری کے کئی درجن چادروں کی فرمائش لکھ بھیجی ہے۔ حالاں کہ شہر میں اور کئی جگہ یہ کام ہوتا ہے۔ لیکن میں نے خیال کیا۔ کہ آشرم کو دوسرے پرائیویٹ کام کرنے والوں پر ترجیح ہونی چاہئے۔ آپ کے یہاں کچھ نمونے موجود ہوں۔ تو تکلیف کر کے دکھا دیجئے۔ اگر اسوقت امر مانع ہو۔ یا نمونے موجود نہ ہوں۔ تو پھر کسی وقت حاضر ہوں +

عبداللطیف۔ میرے گھر میں بھی چکن کے تھان کی ضرورت ہے۔ لکھنؤ کے تھان بازار میں ہیں۔ لیکن میں ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق آشرم ہی کو یہ آرڈر دینا چاہتا ہوں +

بھٹل داس نے بیرجی سے کہا ُ میرے یہاں سوزن کاری بالکل نہیں ہوتی +

ابوالوفا۔ مگر ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ دریافت کیجئے۔ کچھ مستورات ضرور اس فن میں ماہر ہوں گی + ہمیں ایسی کوئی عجلت نہیں ہے۔ پھر حاضر ہوں گے۔ ایک دو۔ چار۔ دس بار آنے میں بھی ہم کو کوئی عذر نہیں ہے۔ آپ اپنا سب کچھ نثار کر رہے ہیں۔ تو کیا ہم سے اتنا بھی نہ ہوگا۔ میں ان معاملات میں قومی

تفریق مناسب نہیں سمجھتا +

بٹھل داس۔ میں ان عنایات کے لئے آپ کا مشکور ہوں لیکن کمیٹی نے فیصلہ کر دیا ہے۔ کہ یہاں سوزن کاکام نہ کرایا جائے۔ کیونکہ اس سے بینائی کمزور ہوتی ہے۔ اس وجہ سے مجبور ہوں +

یہ کہہ کر بٹھل داس اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اب دونوں حضرات کو لوٹ جانے کے سواء اور کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ دل میں بٹھل داس کو صلواتیں سناتے ہوئے فٹن پر سوار ہو گئے +

لیکن ابھی فٹن کی آواز کانوں میں آہی رہی تھی۔ کہ چمن لال کا موٹر کار آپہنچا + سیٹھ جی لکڑی کے سہارے اُترے اور بٹھل داس سے ہاتھ ملا کر بولے "کیوں بابو صاحب۔ ناٹک کے متعلق آپ نے کیا رائے قایم کی؟ شکنتلا کو انگریز لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔ کچھ پارٹ یاد کرائے ہوں۔ تو میں بھی سُنوں کبھی کبھی ضرورت کے وقت ہمیں ایسی چالیں سوجھ جاتی ہیں۔ جو سوچنے سے دھیان میں نہیں آتیں + بٹھل داس نے بہت سوچا تھا۔ کہ اِن موٹے مل سے کیونکر پنڈ چھوٹے لیکن کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی تھی۔ اس وقت دفعتہً انہیں ایک حکمت سوجھ گئی۔ بولے "جی نہیں اُس کے کھیلنے کی صلاح نہیں ہوئی میں نے اس معاملہ میں کلکٹر صاحب سے رائے لی تھی۔ انہوں نے منع فرمایا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ یہ لوگ پالٹیکس کے کیا معنی لیتے ہیں۔ آج جب میں نے باتوں ہی باتوں میں اُن سے اِس آشرم کے لئے کچھ سالانہ امداد کی درخواست کی۔ تو بولے میں پولٹیکل کاموں میں مدد نہیں دے سکتا + میں حیرت میں آگیا

پوچھا۔ آپ آشرم کو کس لحاظ سے پولٹیکل سمجھتے ہیں؟ اس کا صرف یہ جواب دیا۔ کہ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا +

سیٹھ چمن لال کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ بولے "تو صاحب نے آشرم کو پولٹیکل سمجھ لیا؟"

بٹھل۔ جی ہاں صاف صاف کہہ دیا +

چمن لال۔ جب ان کا یہ خیال ہے۔ تو یہاں آنے جانے والوں کی دیکھ بھال بھی ضرور ہوتی ہوگی ؟

بٹھل داس۔ جی ہاں اور کیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ جن لوگوں کے دلوں میں قوم کا درد ہے۔ وہ ان باتوں کی پرواکب کرتے ہیں +

چمن لال۔ جی نہیں۔ میں ان دردمندان قوم میں نہیں ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوجائے۔ کہ یہ لوگ رام لیلا کو بھی پولٹیکل سمجھتے ہیں۔ تو میں اسے بھی بند کردوں + پالٹیکس کے نام سے میری روح فنا ہوتی ہے۔ آپ میرے گھر دیکھ آیئے۔ بھگوت گیتا کی ایک جلد بھی نہیں ہے + میں نے اپنے نوکروں کو سخت تاکید کر دی ہے۔ کہ بازار سے چیزیں پتوں میں لایا کریں۔ میں اخباروں کی پڑیاں تک گھر میں نہیں آنے دیتا + رانا پرتاپ کی ایک پرانی تصویر کمرہ میں تھی۔ اُسے میں نے اُتار کر صندوق میں بند کر دیا ہے۔ تو اب مجھے اجازت دیجئے"؟

یہ کہہ کر وہ توند سنبھالتے ہوئے موٹر کار کی طرف لپکے۔ اور دم زدن میں موٹر کی گرد اُڑتی ہوئی نظر آئی + بٹھل داس دل میں خوب ہنسے۔ اچھی

چال سوجھی۔ لیکن انہیں اس کا مطلق خیال نہ تھا۔ کہ جھوٹ کتنا بولنا پڑا۔ اور اس سے روح کو کتنا زوال پہنچا۔ یہ نیکی کا پُتلا اپنے ذاتی معاملات میں دروغ سے کوسوں بھاگتا تھا۔ لیکن قومی معاملات میں وقتاً فوقتاً اس سے مدد لینے میں دریغ نہ کرتا تھا۔

چمن لال کے جانے کے بعد بھٹل داس نے چندے کا رجسٹر اُٹھایا۔ اور چندہ وصول کرنے کو چلے۔ لیکن کمرہ سے باہر بھی نہ نکلے تھے۔ کہ سیٹھ بلبھدر داس کو پیر گاڑی پر آتے دیکھا۔ غصہ کی ایک لہر ساری رگوں میں دوڑ گئی۔ رجسٹر پٹک دیا۔ اور آمادہ جنگ ہو بیٹھے۔ راہ فرار نہ تھا۔

بلبھدر داس نے آگے بڑھکر کہا "کہئے بابو صاحب۔ کل میں نے جو پودے بھیجے تھے۔ وہ آپ نے بٹھا دیئے یا نہیں؟ ذرا میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ ضرورت ہو تو اپنا مالی بھیجدوں"۔

بھٹل داس بیرخی سے بولے۔ "جی نہیں آپ کو مالی بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ وہ پودے یہاں لگ سکتے ہیں"۔

بل بھدر۔ کیوں لگ کیوں نہیں سکتے؟ میرا مالی آکر سب ٹھیک کر دیگا۔ آج ہی لگوا دیجئے۔ ورنہ سب سوکھ جائیں گے۔

بھٹل۔ سوکھ جائیں یا رہیں۔ پر یہاں وہ نہیں لگ سکتے۔

بل بھدر۔ نہیں لگانے تھے۔ تو پہلے ہی کیوں نہ کہدیا۔ میں نے سہارنپور سے منگوائے تھے۔

بھٹل۔ برآمدے میں پڑے ہیں۔ اُٹھوا لے جائیے۔

سیٹھ جی خود دار اور بیباک آدمی تھے۔ یوں وہ نہایت خلیق۔ سلیم۔ بامروت آدمی تھے۔ لیکن ذرا کسی نے اکڑ کر بات کی۔ ذرا نگاہ بدلی۔ اور وہ ذہانت و فطانت کا پتلا آگ ہو جاتا تھا۔ اسی وجہ سے خاص حلقوں میں وہ مغرور اور بدمزاج مشہور تھے۔ لیکن انہیں اوصاف کے باعث وہ رعایا کے منظور نظر بنے ہوئے تھے۔ پبلک کو اُن پر کامل اعتماد تھا۔ اُسے یقین تھا۔ کہ یہ کبھی حق کے معاملہ میں قدم پیچھے نہ ہٹائیں گے۔ اپنی ذاتی شہرت یا مفاد کے لئے پبلک کا بُرا نہ سوچیں گے۔ ڈاکٹر شیاما چرن پر پبلک کو یہ اعتماد نہ تھا۔ جمہور کی نگاہ میں علم اور عقل۔ اعزاز و امتیاز کی اتنی وقعت نہیں ہوتی۔ جتنی اخلاقی قوت کی۔ ہٹھل داس کی کج خلقی نے اُن کے تیوروں پر بل ڈال دیئے۔ اینٹ اور پتھر کی جنگ شروع ہوئی۔ تنکر بولے "آج آپ اتنے برہم کیوں ہیں؟"

ہٹھل داس۔ مجھے چکنی چپڑی باتیں کرنی نہیں آتیں۔

بل بھدر۔ چکنی چپڑی باتیں نہ کیجئے۔ لیکن لاٹھی تو نہ ماریئے۔ شرافت کے یہ معنی نہیں ہیں"۔

"میں آپ سے شرافت کا سبق نہیں لینا چاہتا"۔

"آپ جانتے ہیں۔ میں بھی کارکن کمیٹی کا ممبر ہوں"۔

"جی ہاں۔ جانتا ہوں"۔

"چاہتا تو کمیٹی کا صدر ہوتا"۔

"جانتا ہوں"۔

"میرے عطیئے کسی سے کم نہیں ہیں"۔

"ان پرانی باتوں کے یاد دلانیکی ضرورت نہیں"۔

"چاہوں تو آشرم کی ہستی خاک میں ملا دوں"۔

"غیر ممکن"۔

"کارکن کمیٹی کے ممبروں کو اشارے پر نچا سکتا ہوں"۔

"ممکن ہے"۔

"ایک دن میں اسکی ہستی مٹا سکتا ہوں"۔

"غیر ممکن"۔

"آپ کس گھمنڈ میں بھولے ہوئے ہیں؟"

"ایشور کے بھروسے پر"۔

سیٹھ جی آشرم کی طرف پر غضب نگاہوں سے تاکتے ہوئے پھر گاڑی پر سوار ہو گئے۔ لیکن بٹھل داس پر اُنکی دھمکیوں کا کچھ اثر نہ ہُوا۔ انہیں یقین تھا۔ کہ وہ آشرم کے متعلق ممبروں سے کچھ کہنے کی جُرأت نہ کر سکیں گے۔ اُن کا غرور انہیں اتنے نیچے نہ گرنے دیگا۔ ممکن ہے۔ وہ اس خفت کو مٹانے کے لئے ممبروں سے آشرم کی تعریف کریں۔ لیکن یہ آگ کبھی نہ کبھی بھڑکے گی ضرور۔ اس میں شک نہ تھا۔ غرور اپنی ذلت کو نہیں فراموش کر سکتا۔ اس کا خدشہ ہونے پر بھی بٹھل داس کو وہ ملال نہ تھا۔ جو کسی بدمزگی کے بعد دل پر چھا جایا کرتا ہے۔ اس کے برعکس انہیں اپنے فرض کو پورا کرنے کا اطمینان تھا۔ اور وہ پچھتا رہے تھے۔ کہ میں نے ابتک اتنی تاخیر کیوں کی۔ اس اطمینان قلب کا ان پر ایسا سرور ہُوا۔ کہ وہ بلند آواز سے یہ پد گانے لگے۔

پربھو جی۔ مجھے کا ہے کی لاج!

جنم جنم یونہی بھرمائیو۔ ابھمانی بے کاج
(بھٹکتا ہوں) مغرور - بے معرف
پربھو جی۔ مجھے کا ہے کی لاج

اسی اثنا میں انہیں پدم سنگھ آتے نظر آئے۔ متفکر۔ زرد۔ خستہ۔ پریشان حالی کی مجسم صورت۔ گویا ابھی رو کر آنسو پونچھے ہیں۔ بٹھل داس آگے بڑھ کر اُن سے گلے ملے۔ اور پوچھا۔ "کہئے کچھ طبیعت ناساز ہے کیا۔ بالکل پہچانے نہیں جاتے؟"

پدم سنگھ۔ جی نہیں بیمار تو نہیں ہوں۔ ذرا پریشان رہا +

بٹھل۔ شادی بخیریت ہو گئی؟

پدم سنگھ نے چھت کی طرف تاکتے ہوئے جواب دیا۔ "اس کا قصہ نہ پوچھئے شادی کیا ہوئی۔ ایک غریب لڑکی کی زندگی خاک میں ملا آئے۔ وہ لڑکی اسی سمن بائی کی بہن نکلی۔ بھائی صاحب کو جونہی معلوم ہوا۔ وہ دروازہ سے بارات لوٹا لائے +

بٹھل داس۔ یہ تو ایک سانحہ ہے۔ آپ نے اپنے بھائی صاحب کو سمجھایا نہیں؟

پدم سنگھ۔ آپ سمجھانے کی کہتے ہیں۔ میں لڑا جھگڑا۔ مار تک کھائی۔ لیکن سب بے سود +

بٹھل۔ دیکھئے اب بیچاری لڑکی کی کیا گت ہوتی ہے۔ سمن سنیگی تو رو ئیگی +

پدم۔ کہئے یہاں کی کیا خبریں ہیں۔ سمن کے آنے سے آشرم میں کوئی ہنگامہ تو نہیں مچا۔ ودھوائیں اس سے نفرت تو ضرور کرتی ہونگی +

بٹھل۔ راز کھُل جاتے۔ تو آج آشرم خالی نظر آتے +

پدم۔ اور سمن کیسے رہتی ہے؟

بٹھل۔ بالکل اس طرح گویا آشرم ہی میں اسکی پرورش ہوئی ہے+ معلوم ہوتا ہے وہ اپنے حسن اخلاق سے اپنے داغ کو مٹانا چاہتی ہے۔ ہر ایک کام کرنے کو تیار اور بہ خندہ پیشانی، وہ دھوائیں سوتی ہی رہتی ہیں۔ اور وہ ان کے کمروں میں جھاڑو لگا جاتی ہے+ کئی عورتوں کو کھانا سکھاتی ہے۔ کئی عورتیں اس سے سینا پرونا سکھتی ہیں۔ سب کی سب ہر ایک معاملہ میں اسی کی صلاح پر چلتی ہیں۔ اس چار دیواری کے اندر اب اُس کا راج ہے۔ مجھے اس سے ہرگز ایسی اُمید نہ تھی۔ یہاں اس نے کچھ پڑھنا بھی شروع کر دیا ہے۔ اور جناب دل کا حال تو پرماتما ہی جان سکتا ہے۔ پر بظاہر اُسکی کایا پلٹ سی ہو گئی ہے +

پدم۔ نہیں جناب اس کے اطوار کبھی بُرے نہیں رہے۔ میرے یہاں مہینوں اُسکی آمد و رفت تھی۔ میرے گھر میں اُسکی بڑی تعریف کیا کرتی تھیں۔ کچھ ایسے ناگوار اتفاقات ہی ہو گئے۔ جنکی بدولت اُسے یہ ٹھوکریں کھانی پڑیں سچ پوچھئے۔ تو ہماری حماقتوں کا خمیازہ اُسے اٹھانا پڑا۔ ہاں کچھ اس طرف کی خبریں بھی ملیں؟ سیٹھ بل بھدر داس نے اور کوئی چال چلی؟

بٹھل۔ ہاں صاحب وہ چپ بیٹھنے والے آدمی ہیں؟ آج کل خوب دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ تین دن ہوئے ہندو ممبروں کا ایک جلسہ بھی ہوا تھا۔ میں تو جا نہ سکا۔ پر سُنتا ہوں۔ میدان انہیں لوگوں کے ہاتھ رہا۔ اب پریزیڈنٹ کے دو ووٹ ملا کر اُنکے پاس چھ ووٹ ہیں۔ اور ہمارے پاس صرف چار ہاں مسلمانوں کے ووٹ ملا کر برابر ہو جائیں گے +

پدم۔ تو ہمکو کم سے کم ایک ووٹ اور ملنا چاہیئے؟ ہے اسکی کوئی اُمید؟
بٹھل۔ مجھے تو کوئی اُمید نظر نہیں آتی +
پدم۔ فرصت ہو تو چلئے ذرا ڈاکٹر صاحب اور لالہ بھگت رام کے پاس چلیں +
بٹھل۔ ہاں چلئے میں تیار ہوں +



(۱۲)

اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا بنگلہ قریب ہی تھا۔ لیکن ان دونوں صاحبوں نے ایک گاڑی کرایہ کی + ڈاکٹر صاحب کے دولت خانہ پر پیدل جانا فیشن کے خلاف تھا۔ راستہ میں بٹھل داس نے آج کے سب حالات مبالغہ کے ساتھ بیان کئے۔ اور اپنی فراست کا خوب اظہار کیا + پدم سنگھ نے یہ کیفیت سنی۔ تو انداز تفکر سے بولے۔ " تو اب ہمیں اور بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ غالباً انجام یہ ہوگا۔ کہ آشرم کا سارا بار ہمیں لوگوں پر پڑے گا۔ بل بھدر داس ابھی چاہے خاموش ہو جائیں پر کبھی نہ کبھی اس کا غبار نکلے گا ضرور" +

بٹھل داس۔ میں کیا کروں۔ مجھ سے یہ اندھیر دیکھ کر رہا نہیں جاتا۔ بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ یہ حضرات علم اور تہذیب اور اخلاق کے پتلے بنے پھرتے ہیں۔ اور حرکات ایسے ناشائستہ!

پدم سنگھ۔ خیر یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ یہ بھی میرے اعمال کا نتیجہ ہے۔ دیکھئے ابھی اور کیا کیا گل کھلتے ہیں۔ جب سے بارات واپس آئی ہے میری عجیب حالت ہو رہی ہے۔ نہ بھوک نہ پیاس۔ رات بھر کروٹیں بدلا کرتا ہوں

یہی غم ستایا کرتا ہے۔ کہ اس بدنصیب لڑکی کی کیا گت ہوگی۔ اگر کہیں آشرم کی فکر بھی سر پر آپڑی۔ تو جان ہی پر بن جائیگی۔ ایسے اتھاہ دلدل میں پھنس گیا ہوں۔ کہ جوں جوں اوپر اٹھنا چاہتا ہوں۔ اور نیچے دبا جاتا ہوں +

اتنے میں ڈاکٹر صاحب کا بنگلہ آگیا۔ ۱۰ بجے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے سجے ہوئے کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنی بڑی لڑکی مس کانتی سے شطرنج کھیل رہے تھے۔ میز پر دو بٹیر پتے بیٹھے ہوئے بڑے غور سے شطرنج کی چالوں کا ملاحظہ کر رہے تھے۔ اور کبھی کبھی جب ان کے خیال میں کھلاڑیوں سے کوئی غلطی ہو جاتی تھی۔ تو وہ پنجوں سے مہروں کو ٹھیک کر دیا کرتے تھے۔ مس کانتی انکی اس شرارت پر ہنسکر انگریزی میں کہتی تھیں۔ "یونائی" میز کے بائیں جانب ایک کرسی پر سید تیغ علی صاحب رونق افروز تھے۔ اور مس کانتی کو چالیں بتاتے جاتے تھے +

اسی اثنا میں۔ دونوں آدمی کمرہ میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے تپاک سے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔ مس کانتی نے انکی طرف دبی نگاہوں سے دیکھا۔ اور میز پر سے ایک اخبار اٹھا کر پڑھنے لگیں +

ڈاکٹر صاحب نے انگریزی میں فرمایا۔ "آپ سے ملکر بہت خوش ہوا۔ آئیے آپ لوگوں کو مس کانتی سے انٹروڈیوس کر دوں" +

تعارف ہوجانے پر مس کانتی نے دونوں آدمیوں سے ہاتھ ملایا۔ اور شگفتہ ہوکر بولیں۔ "پاپا ابھی آپ ہی صاحبوں کا ذکر کر رہے تھے۔ آپ سے ملکر میں بہت خوش ہوئی" +

ڈاکٹر شیاما چرن۔ مس کانتی ابھی ڈلہوزی پہاڑ سے آئے ہیں۔ ان کا سکول

جاڑوں میں بند ہو جاتا ہے۔ وہاں تعلیم کا نہایت معقول انتظام ہے۔ یہ انگریزوں کی لڑکیوں کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس میں رہتی ہیں۔ لیڈی پرنسپل نے ایکے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ کانتی! ذرا اپنے لیڈی پرنسپل کی چٹھی انہیں دکھا دو۔ مسٹر سنہا (پدم سنگھ) آپ کانتی کی انگریزی تقریر سنکر دنگ رہ جائیں گے۔ (ہنستے ہوئے) یہ مجھے کتنے ہی نئے محاورے سکھا سکتی ہے +

مس کانتی نے شرماتے ہوئے اپنا سرٹیفکٹ پدم سنگھ کو دکھایا۔ وہ اُسے پڑھکر بولے۔ "کیا آپ لیٹن بھی پڑھتی ہیں؟"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "لاٹن میں ایکے انہیں ایک تمغہ انعام ملا ہے۔ کل کلب میں کانتی نے ایسا گیم (کھیل) دکھایا۔ کہ انگریز لیڈیاں حیرت میں آگئیں۔ اس نے سب کے چھکے چھڑا دیئے۔" ہاں ایکے بار آپ ہندو ممبروں کے جلسے میں نہیں تھے؟

پدم سنگھ۔ جی نہیں۔ میں ذرا مکان پر چلا گیا تھا +

شیاما چرن۔ آپ ہی کی تجویز درپیش تھی۔ میں تو مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ ابھی آپ اُسے بورڈ میں پیش کرنے میں عجلت نہ کریں۔ ابھی کامیابی کی اُمید بہت کم ہے +

تیغ علی۔ جناب مسلمان ممبروں کی طرف سے تو آپ کو پوری مدد ملے گی +

شیاما چرن۔ درست ہے۔ لیکن ہندو ممبروں میں تو اختلاف ہے +

پدم سنگھ۔ آپ اگر اعانت فرمائیں۔ تو ہماری کامیابی یقینی ہے +

شیاما چرن۔ مجھے آپکی تجویز سے کامل ہمدردی ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے میں

گورنمنٹ کا نامزد کردہ ممبر ہوں۔ جب تک یہ تحقیق نہ ہو جائے۔ کہ گورنمنٹ اس تجویز کو پسند کرتی ہے یا نہیں اس وقت تک میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

بٹھل داس نے بے تمیزانہ انداز سے کہا "جب ممبر ہونے سے آپ کے خیالات کی آزادی میں فرق آتا ہے۔ تو میرے خیال میں آپ کو استعفا دینا چاہیئے"

تینوں آدمیوں نے بٹھل داس کی طرف ملامت آمیز نظروں سے دیکھا۔ انکی یہ گفتگو بالکل بے موقع تھی۔ تیغ علی نے طنز سے کہا "استعفا دیدیں تو یہ قدر و منزلت کیونکر حاصل ہو؟ لاٹ صاحب کے برابر کرسی پر کیسے بیٹھیں؟ آنریبل کیونکر کہلائیں؟ بڑے بڑے انگریزوں سے ہاتھ ملانے کا اعزاز کیونکر حاصل ہو۔ سرکاری دعوتوں میں بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنے کے موقع کیونکر میسر ہوں۔ نینی تال کی سیر کیونکر کریں۔ اپنی تقریر کا اعجاز کیونکر دکھائیں؟ یہ بھی تو سوچئے"۔

بٹھل داس کٹ گئے۔ تیغ علی نے انہیں بڑی بیرحمی سے جھنجھوڑا۔ پدم سنگھ پچھتائے۔ کہ ناحق ایسے آدمی کے ساتھ آئے۔

ڈاکٹر صاحب نے متین لہجہ میں کہا "عوام کا خیال ہے۔ کہ لوگ اسی اعزاز و وقار کی ہوس میں ممبری کے لئے دوڑتے ہیں۔ وہ مطلق نہیں سمجھتے۔ کہ یہ کتنی عظیم ذمہ واری کا کام ہے۔ غریب ممبر کو اپنا کتنا وقت۔ کتنی محنت۔ کتنی دولت اس ذمہ واری پر قربان کرنی پڑتی ہے۔ اس کے صلے میں اُسے بجز اس اطمینان کے اور کیا ملتا ہے۔ کہ میں اپنے ملک اور قوم کی خدمت کر رہا ہوں۔ یہ اطمینان نہ ہو۔ تو کوئی ممبری کی پروا بھی نہ کرے"۔

شیخ علی۔ جی ہاں اس میں کیا شک ہے۔ جناب صحیح فرماتے ہیں جس کے سر پہ عظیم الشان ذمہ داری پڑتی ہے۔ اس کا دل ہی جانتا ہے +

گیارہ بج گئے تھے۔ پدم سنگھ اور بٹھل داس یہاں سے چلے + راستہ میں بٹھل داس نے کہا "میرے کھانے کا وقت آگیا۔ میں اب جاتا ہوں۔ آپ شام کو تشریف لائیے گا + پدم سنگھ نے کہا۔ "ہاں ہاں شوق سے جائیے"۔ انہیں خیال آیا۔ کہ جب ایسا دھن کا پکا آدمی کھانے میں ذرا سی دیر ہو جانے پر بےچین ہو جاتا ہے۔ تو دوسروں سے کیا امید کی جا سکتی ہے۔ لوگ قوم اور ملک کے خادم تو بنتے ہیں۔ پر ذرا سی بھی تکلیف نہیں اٹھانی چاہتے + یہ سوچتے ہوئے وہ لالہ بھگت رام کے مکان پر آ پہنچے +

لالہ بھگت رام دھوپ میں تخت پر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے انکی چھوٹی لڑکی گود میں بیٹھی ہوئی دھوئیں کو پکڑنے کے لئے بار بار لپکتی تھی + سامنے زمین پر کئی مستری اور معمار بیٹھے ہوئے تھے۔ بھگت رام پدم سنگھ کو دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور پالاگن کر کے بولے "میں نے شام ہی کو سنا تھا۔ کہ آپ آگئے۔ آج صبح ارادہ کیا۔ کہ چلوں۔ لیکن کچھ ایسی جھنجھٹ میں پھنس گیا۔ کہ فرصت ہی نہ ملی۔ یہ ٹھیکہ داری بڑے جھگڑے کا کام ہے + کام کرائیے۔ اپنے روپے لگائیے۔ اُس پر دوسروں کی خوشامد کیجئے + آج کل انجینیر صاحب نہ جانے کیوں مجھ سے ناراض ہیں۔ میرا کوئی کام اُنہیں پسند ہی نہیں آتا۔ ایک پل بنانیکا ٹھیکہ لیا تھا۔ اسے تین بار گرا چکا ہوں۔ کبھی کہتے ہیں۔ یہ نہیں بنا۔ کبھی کہتے ہیں۔ وہ نہیں بنا۔ نفع کیا ہو گا۔ اُلٹے نقصان اُٹھا رہا ہوں۔ کوئی سُننے والا

نہیں۔ آپ نے ہندو ممبروں کے جلسے کی کیفیت تو سُنی ہوگی ؟

پدم سنگھ۔ جی ہاں سُنا۔ اور سنکر رنج ہُوا۔ آپ سے مجھے پوری اُمید تھی۔ کیا آپ کو اس تجویز سے اتفاق نہیں ہے ؟

بھگت رام۔ جناب محض اتفاق ہی نہیں ہے۔ اس کی دل سے مدد کرنی چاہتا ہوں۔ پر میں اپنی رائے کا مالک نہیں ہوں۔ میں نے اپنے تئیں غرض کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔ مجھے آپ گراموفون کا رکارڈ سمجھئے۔ جو کچھ بھر دیا جاتا ہے۔ وہی کہتا ہوں۔ اور کچھ نہیں *

پدم سنگھ۔ لیکن آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ قومی بہبود کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینی چاہئیے *

بھگت رام۔ جی ہاں اصولاً اسے تسلیم کرتا ہوں لیکن عمل کی جُرأت نہیں۔ آپ جانتے ہیں۔ میرا سارا کاروبار سیٹھ چمن لال کی مدد سے چلتا ہے۔ اگر اُنہیں ناراض کر دوں۔ تو یہ سارا ٹھاٹ بگڑ جائے۔ شہر میں میری جو کچھ عزت ہے۔ وہ اسی ٹھاٹ کے باعث ہے۔ علم اور عقل ہے ہی نہیں صرف اسی سوانگ کا بھروسا ہے۔ آج اگر قلعی کھل جائے۔ تو کوئی بات بھی نہ پوچھے۔ دودھ کی مکھی کی طرح سماج سے نکال دیا جاؤں۔ بتلائیے شہر میں ایسا کون ہے جو محض میرے اعتبار پر بلا سود کے ہزاروں روپے قرض دیدے؟ اور پھر صرف اپنی ہی فکر تو نہیں۔ کم سے کم تین سَو روپیہ ماہوار خاندان کا خرچ ہے۔ قوم کے لئے میں خود تکلیف اُٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن عیال کو کیونکر منجدھار میں چھوڑ دوں ؟

ہم جب اپنے کسی فرض سے قاصر ہوتے ہیں۔ تو الزام سے بچنے کے لئے ایسی ایسی پر زور دلیلیں اختراع کرتے ہیں۔ کہ کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ اسوقت ہم شرم اور لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر بڑی دلیری سے اپنے متعلق ایسے ایسے رازوں کا افشا کر دیتے ہیں۔ جو کسی وقت ہماری زبان پر ہرگز نہ آتے + پدم سنگھ سمجھ گئے۔ کہ اُن سے بھی کوئی اُمید نہیں ہے۔ بولے "ایسی حالت میں آپ پر کیونکر زور دے سکتا ہوں۔ مجھے صرف ایک ووٹ کی فکر ہے۔ کوئی تدبیر بتلایئے۔ کیونکر حاصل ہو؟"

بھگت رام۔ میری صلاح تو یہ ہے۔ کہ آپ کنور صاحب کے پاس جایئے۔ اُن کا ووٹ آپ کو یقیناً مل جائے گا۔ سیٹھ بل بھدر داس نے اُن پر تیس ہزار کی نالش کی ہے۔ کل اُنکی ڈگری بھی ہو گئی۔ کنور صاحب آج کل سیٹھ جی سے تنے ہوتے ہیں۔ بس چلے تو اُنہیں گولی مار دیں۔ انہیں قابو میں لانے کی ایک اور تدبیر آپ کو بتلاتا ہوں۔ آپ اُنہیں کسی جلسے کا پریزیڈنٹ بنا دیجئے۔ بس اُنکی تکمیل آپ کے ہاتھ میں ہو جائے گی +

پدم سنگھ نے ہنس کر کہا "اچھی بات ہے۔ انہیں کے ہاں چلتا ہوں" +

دوپہر ہو گئی تھی۔ لیکن پدم سنگھ کو بھوک پیاس نہ تھی۔ بگھی پر بیٹھکر چلے۔ کنور صاحب برنا کے کنارے ایک بنگلہ میں رہتے تھے۔ آدھ گھنٹہ میں جا پہنچے۔ بنگلہ کے احاطہ میں نہ کوئی سجاوٹ تھی۔ نہ صفائی۔ پھول پتی کا نام نہ تھا۔ برامدے میں کئی کتے زنجیروں سے بندھے کھڑے تھے۔ کنور صاحب کو شکار کا بہت شوق تھا۔ کبھی کبھی کشمیر تک کا چکر لگایا کرتے تھے۔ اس

وقت وہ اپنے کمرہ میں بیٹھے ہوئے ستار بجا رہے تھے۔ دیواروں پر ہرنوں کے سینگ اور چیتوں کی کھالیں زیب دے رہی تھیں۔ ایک گوشہ میں کئی بندوقیں اور بھالے رکھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ایک بڑی میز پر ایک گھڑیال بیٹھا ہوا تھا۔ پدم سنگھ نے کمرہ میں قدم رکھا۔ تو اسے دیکھ کر ایکبار چونک پڑے۔ کھال میں ایسی صفائی سے بھوسا بھرا گیا تھا۔ کہ اس میں جان سی پڑ گئی تھی۔

کنور صاحب نے پدم سنگھ کو دیکھا۔ تو ٹوٹ کر گلے ملے۔ اور بولے "آئیے جناب۔ آپ کی تو اب زیارت ہی نہیں نصیب ہوتی۔ مکان سے کب آئے؟"

پدم سنگھ۔ کل آیا۔

کنور۔ چہرہ اُترا ہُوا ہے۔ بیمار تھے کیا؟

پدم سنگھ۔ جی نہیں۔ کوئی خاص شکایت نہیں ہے۔

کنور۔ شربت پیجئے۔ پیاس لگی ہوگی؟

پدم سنگھ۔ جی نہیں۔ معاف کیجئے۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔ کیا ستار کی مشق ہو رہی ہے؟

کنور۔ جی ہاں مجھے تو اپنے ستار ہی سے عشق ہے۔ ہارمونیم اور پیانو سن کر طبیعت مالش کرنے لگتی ہے۔ ان انگریزی باجوں نے ہمارے فن موسیقی کا قلع قمع کر دیا۔ اُنکی چرچا ہی اُٹھ گئی۔ جو کچھ تھوڑی سی کسر باقی رہ گئی تھی۔ وہ تھیٹروں نے پوری کر دی بس جسے دیکھئے غزل اور قوالی کی رٹ لگا رہا ہے۔ چند دنوں میں ہمارے فن حرب کی طرح اس کا بھی خاتمہ ہو جائیگا۔ موسیقی دلوں میں پاکیزہ جذبات پیدا کرتی ہے۔ جب سے فن نغمہ کی کساد

بازاری ہوتی۔ ہم بے حس ہو گئے۔ ہمارے دلوں میں نازک جذبات کا مادہ ہی نہیں رہا۔ اور اس کا سب سے بُرا اثر ہماری ادبیات پر نظر آتا ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے۔ کہ جس قوم نے رامائن جیسی عدیم المثال تصنیف کی۔ سورساگر جیسا گلزار معانی سجایا۔ وہی قوم اب معمولی ناولوں کے لئے ترجمہ کی محتاج ہے۔ بنگال اور دکن میں ابھی تک گانے کا کچھ رواج ہے۔ اسی لئے وہاں جذبات کا ایسا فقدان نہیں ہے۔ کہئے۔ آپ کی تجویز کا کیا حشر ہوتا نظر آتا ہے؟

پدم سنگھ۔ آپ یہ سوال پوچھ کر میرے اوپر ستم کرتے ہیں۔ مجھ کو آپ سے زیادہ ہمدردی کی توقع تھی۔

کنور صاحب نے قہقہہ مارا۔ اُنکی ہنسی کمرہ میں گونج اٹھی۔ پینل کی ڈھال جو دیوار سے لٹک رہی تھی۔ اس آواز سے جھنکارنے لگی۔ بولے۔ آپ کو غالباً میری جانب سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے اپنی ساری قوت تقریر آپ کی حمایت میں صرف کی۔ اس سے زیادہ میں اور کیا کر سکتا تھا؟ یہاں تک کہ میں نے اس تجویز کے مخالفین سے متانت کے ساتھ بحث کرنا بھی بیکار سمجھا۔ طنز آمیز تمسخر کا پہلو اختیار کیا۔ (کچھ یاد کر کے) ہاں ایک بات ہو سکتی ہے۔ سمجھ گیا۔ (پھر قہقہہ مار کر) اگر یہ بات ہے۔ تو میں کہوں گا۔ کہ میونسپل بورڈ بچھیا کے تاؤ ہی سے بھری ہوئی ہے۔ غالباً اس تمسخر کا منشا ہی کسی نے نہ سمجھا۔ کاشی کی روشن خیال۔ مہذب۔ معاملہ فہم بورڈ میں ایک شخص بھی ایسا سخن فہم نہ نکلا! سخت افسوس ہے۔ جناب آپ کو یقیناً میری جانب سے

سخت غلط فہمی ہوئی۔ معاف کیجئے۔ مجھے آپ کی تجویز سے کامل اتفاق ہے۔
پدم سنگھ جب یہاں سے چلے تو انکی طبیعت ایسی شگفتہ تھی۔ گویا کسی پرفضا مقام کی سیر کر کے آئے ہوں۔ کنور صاحب کی شفقت اور اخلاق نے انہیں گرویدہ کر لیا تھا۔

(۱۳)

سدن جب مکان پر پہنچا۔ تو اسکی حالت اُسی آدمی کی سی تھی۔ جو برسوں کی کمائی لئے۔ دل میں ہزاروں منصوبے باندھتا مسرت سے پھولا گھر آئے۔ اور یہاں صندوق کھولنے پر اُسے اپنی تھیلیاں خالی نظر آئیں!

خیالات کی آزادی علم صحبت اور تجربہ سے پیدا ہوتی ہے۔ سدن ان تینوں ارکانوں سے بے بہرہ تھا۔ یہ اُسکی زندگی کا وہ زمانہ تھا۔ جب ہمیں اپنے مذہبی عقاید پر۔ اپنے معاشرتی رسوم پر۔ ایک غرور سا ہوتا ہے جب ہمیں اُن میں کوئی عیب نہیں نظر آتا۔ جب ہم ان کے خلاف کوئی دلیل یا اعتراض سُننے کی جراٰت نہیں کر سکتے۔ اس وقت ہم میں "کیا" اور "کیوں" کی تمیز نہیں ہوتی۔ سدن کو گھر سے نکل بھاگنا منظور ہوتا بجائے اس کے کہ وہ اپنے گھر کی مستورات کو گنگا نہلانے لے جائے۔ اگر عورتوں کی ہنسی کی آواز کبھی مردانے میں سُنائی دیتی۔ تو وہ تیور بدلے گھر میں آتا۔ اور اپنی ماں کو آڑے ہاتھوں لیتا۔ سُبھدرا کو اپنی ساس کی حکومت بھی اتنی سخت نہ معلوم ہوتی تھی۔ اخلاقی کمزوریوں کو وہ فلسفی کی فیاض نگاہوں سے نہیں

زاہد کی خشک نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اس نے دیکھا تھا۔ کہ اس کے گاؤں کے ایک ٹھاکر نے ایک بیڑن گھر میں ڈال لی تھی۔ تو سارے گاؤں نے اس کے دروازہ پر آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ اور کچھ اس طرح اس کے پیچھے پڑے تھے۔ کہ اُسے جبراً، قہراً بیڑن کو گھر سے نکالنا پڑا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ وہ سمن بائی پر جان دیتا تھا۔ لیکن اس کے مذہب میں یہ محبت اتنا نا قابل عفو گناہ نہ تھا۔ جتنا سمن کی پرچھائیں کا اس کے گھر میں آجانا۔ اُس نے اب تک سمن کے یہاں پان تک نہ کھایا تھا۔ وہ اپنی خاندانی نجابت اور مجلسی رسم و رواج کو اپنی ضمیر سے بھی زیادہ وقیع سمجھتا تھا۔ اُس ذلت اور رسوائی کا خیال ہی اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ جو ایک خانہ برباد عورت سے قرابت ہو جانے کے باعث اس کے خاندان پر نازل ہوتی۔ اس کے مقابلے میں وہ ڈوب مرنا اچھا سمجھتا تھا۔ جنوا سے میں پدم سنگھ کی باتیں سُن سُن کر بیحد اشتعال ہو رہا تھا۔ وہ ڈرتا تھا۔ کہ کہیں والد صاحب اُنکی باتوں میں نہ آجائیں۔ اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ چچا صاحب کو کیا جنون ہو گیا ہے۔ اگر یہی دلیلیں اس نے کسی دوسرے آدمی کی زبان سے سُنی ہوتیں۔ تو بے محابا اُسکی زبان پکڑ لیتا۔ لیکن پدم سنگھ کا وہ بہت لحاظ کرتا تھا۔ اور دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا تھا۔ اس وقت اس کے دماغ میں جوابی دلیلوں کا ایک طوفان سا اٹھا ہوا تھا۔ اسکی طبیعت کبھی اتنی جولاں نہ ہوئی تھی۔ اور اگر یہ مباحثہ دلیلوں ہی تک رہتا۔ تو غالباً وہ

ضرور اپنے چچا صاحب سے اُلجھ پڑتا۔ لیکن مدن سنگھ کی دست درازی نے اُس کے جذبہ تردید کو ہمدردی کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

اِدھر سے مایوس ہو کر سدن کا دل بیقرار پھر سمن بائی کی طرف لپکا۔ لذت نشاط کا چسکا پڑ جانے کے بعد طبیعت کو روکنا دشوار تھا۔ وہ پدم سنگھ کے ساتھ ہی بنارس چلا آیا۔ لیکن یہاں آ کر وہ ایک سخت کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ اُسے اندیشہ ہونے لگا۔ کہ کہیں سمن کو ساری حقیقت معلوم نہ ہو گئی ہو۔ وہ خود تو وہاں نہ رہی ہو گی۔ ان لوگوں نے ضرور اسے ترک کر دیا ہو گا۔ لیکن غیر ممکن ہے۔ کہ اُسے شادی کی خبر نہ دی ہو۔ اگر اس پر سب حالات روشن ہو گئے ہوں گے۔ تو وہ مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرے گی۔ کیا عجب ہے مجھے جھڑک دے۔ لیکن شام ہوتے ہی اُس نے کپڑے بدلے۔ گھوڑا کھنچوایا۔ اور دال منڈی کی طرف چلا۔ وصال کی دلخوش کُن آرزو نے اِن شکوک کو زیر کر دیا۔ وہ سوچ رہا تھا سمن مجھ سے کیا کہے گی۔ اور میں اُسے کیا جواب دونگا۔ کہیں اُسے کچھ نہ معلوم ہو۔ اور وہ جاتے ہی محبت سے میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہے۔ تم بڑے بیوفا ہو۔ تو بڑا مزہ آئے۔ اس تخیل نے اس کے شوق اور بھی تیز کر دیا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اور ایک لمحہ میں دال منڈی کے سامنے جا پہنچا۔ لیکن جس طرح ایک کھلاڑی لڑکا مدرسہ کے دروازے پر آ کر اندر جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اُسی طرح سدن ڈال منڈی کے سامنے آ کر ٹھٹک گیا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک ایسے مقام پر آ کر کھڑا ہو گیا

جہاں سے سمن کا بالاخانہ صاف نظر آتا تھا۔ یہاں سے اُس نے نگاہ خوف سے سمن کے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ قفل پڑا ہوا تھا۔ سدن کے دل پر سے ایک بوجھ سا اُتر گیا۔ یہ مایوسی کامیابی سے بدرجہا اطمینان بخش ثابت ہوئی۔ اسے کچھ وہی مسرت ہوئی۔ جو اس آدمی کو ہوتی ہے۔ جو جیب میں پیسے نہ رہنے پر بھی لڑکے کی ضد سے مجبور ہو کر کھلونے کی دُکان پر جائے۔ اور اُسے بند پائے۔

مگر یہ مسرتِ ناکامی بہت دیر تک قائم نہ رہی۔ سدن جب مکان پر لوٹا تو بہت اُداس تھا۔ اُسے اپنے دل میں ایک خلا۔ ایک سوناپن محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کچھ کھو گیا ہو۔ رات کو جب سب لوگ سو گئے۔ تو وہ چپکے سے اُٹھا۔ اور دال منڈی کی طرف چلا۔ جاڑے کی رات تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ چاند کہرے کی آڑ سے جھانکتا تھا۔ اور کسی گھبرائے ہوئے آدمی کی طرح تیزی سے دوڑتا چلا جاتا تھا۔ سدن دال منڈی تک ہوا کی طرح آیا۔ پر یہاں آکر پھر اُس کے پیر بندھ گئے۔ اور جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اُسے خیال آیا۔ کہ اس وقت میرا یہاں آنا نہایت شرمناک ہے۔ سمن کے یہاں جاؤں تو وہ مجھے کیا سمجھے گی؟ اس کے نوکر چاکر آرام سے سو رہے ہوں گے۔ مجھے کون پوچھتا ہے۔ اُسے تعجب ہوتا تھا۔ کہ میں یہاں کیسے چلا آیا۔ میری عقل کہاں چلی گئی تھی۔ وہ اسی وقت لوٹ پڑا۔

دوسرے دن شام کو وہ پھر چلا۔ دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ اگر سمن نے مجھے دیکھ لیا۔ اور بُلایا تو جاؤں گا۔ ورنہ سیدھے اپنی راہ چلا جاؤں گا۔ اُس

کا مجھے بلانا ہی بتلا دے گا۔ کہ اُس کا دل میری طرف سے صاف ہے نہیں تو اس افسوسناک واقعہ کے بعد وہ مجھے بلانے ہی کیوں لگی + کچھ دیر اور آگے چلکر اُس نے سوچا۔ کیا وہ مجھے بلانے کے لئے جھروکھے پر بیٹھی ہوگی؟ اُسے کیا معلوم کہ میں یہاں آگیا۔ نہیں۔ مجھے ایکبار خود اس کے پاس چلنا چاہئے۔ سمن کبھی مجھسے ناراض نہیں ہوسکتی۔ اور ناراض بھی ہو تو کیا میں اُسے منا نہیں سکتا۔ میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑوں گا۔ اس کے پیروں پڑوں گا۔ اور اپنے آنسوؤں سے اُس کے دل کا غُبار دھوؤں گا + وہ مجھ سے کتنی ہی بیزار ہو۔ پر میرے محبت کے نقش کو دل سے مٹا نہیں سکتی۔ آہ! وہ اگر اپنے کنول کی سی آنکھوں میں آنسو بھرے میری طرف تاکے تو میں اس کے لئے کیا کچھ نہ کر ڈالوں گا! اگر اُسے کوئی فکر ہو تو اُس فکر کو دور کرنے کے لئے میں اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔ تو کیا وہ میری اس خطا کو معاف نہ کرے گی؟ لیکن جوں ہی وہ دال منڈی کے مقابل پہنچا۔ اُسکی یہ بیتابیاں اسی طرح غائب ہوگئیں۔ جیسے اپنے گاؤں میں شام کے وقت نیم کے نیچے دیوی کی مورت دیکھ کر اُسکی دلیلیں غائب ہو جاتی تھیں۔ اس نے سوچا کہیں وہ مجھے دیکھے اور دل میں کہے۔ وہ جا رہے ہیں کنور صاحب۔ گویا سچ مچ کسی ریاست کے مالک ہیں۔ کیسا مکّار آدمی ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس کے پیروں میں زنجیر سی پڑگئی۔ آگے نہ بڑھ سکا +

اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ دن بھر اُسکی تمنائیں جو بانو کی دیو رکھوالی کرتیں وہ شام کو دال منڈی کے سامنے جاتے ہی حجاب کے صدمہ سے

گر پڑتی تھی +

ایک دن وہ گھومتے ہوئے کوئنس پارک جا پہنچا۔ وہاں ایک شامیانہ تنا ہوا تھا۔ اور لوگ فرش پر بیٹھے ہوئے پروفیسر رومیش دت کی پُراثر تقریر سُن رہے تھے + سدن گھوڑے سے اُتر پڑا۔ اور بڑے غور سے تقریر سُننے لگا + اُس کے دل نے فیصلہ کیا۔ بیشک یہ عصمت فروش فرقہ سوسائٹی کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ میں بہت بچا ورنہ کہیں کا نہ رہتا + اِسے شہر سے باہر نکالدینا چاہیئے۔ اگر سمن بازار میں نہ ہوتی تو میں اس کے دامِ محبت میں ہرگز نہ پھنسا +

دوسرے دن وہ پھر کوئنس پارک کی طرف گیا۔ آج وہاں منشی ابوالوفا کی مرصع تقریر ہو رہی تھی۔ سدن نے اُسے بھی غور سے سُنا۔ اور اپنے دل میں کہا "بیشک یہ فرقہ بیجا طور پر بدنام ہے۔ ٹھیک تو ہے۔ یہ نہ ہوں تو ہمارے دیوتاؤں کی یادخیر کرنیوالا بھی کوئی نہ رہے۔ یہ بھی سچ ہی کہا۔ کہ بازارِ حسن ہی وہ مقام ہے۔ جہاں ہندو مسلمان دل کھولکر ملتے ہیں۔ جہاں حسد اور باہمی مخالفت کا گزر نہیں ہے۔ جہاں ہم کارزارِ ہستی سے دم لینے کے لئے۔ اپنے رنج و غم کو غلط کرنے کے لئے پناہ گزیں ہوتے ہیں۔ یقیناً انہیں شہر سے نکالدینا انہیں پر نہیں۔ ساری آبادی پر سخت ظلم ہوگا +

کئی دن کے بعد اس کے اس خیال نے پھر پلٹا کھایا۔ اور یہ سلسلہ بند نہ ہوتا تھا۔ اس میں اپنی ذاتی رائے قائم کرنے کی کسی مسئلہ کے حسن و قبح

کے تولنے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس کا سر ہر ایک پُر زور دلیل کے سامنے جھک جاتا تھا۔

اس نے ایک دن پدم سنگھ کی تقریر کا نوٹس دیکھا۔ تین ہی بجے سے چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ اور چار بجے بینی باغ میں جا پہنچا، وہاں ابھی کوئی آدمی نہ تھا۔ ہاں کچھ لوگ فرش بچھا رہے تھے۔ وہ گھوڑے سے اُترا۔ اور فرش بچھانے میں لوگوں کی مدد کرنے لگا، پانچ بجتے بجتے مجمع ہونے لگا۔ اور آدھ گھنٹہ میں وہاں ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہو گیا۔ تب اس نے ایک فٹن پر پدم سنگھ کو آتے دیکھا۔ اس کا سینہ دھڑکنے لگا۔ پہلے مسٹر رستم بھائی نے ایک مختصر سی نظم پڑھی۔ جو خاص اس موقع کے لئے سید تیغ علی نے لکھی تھی۔ ان کے بیٹھنے پر لالہ بھٹل داس کھڑے ہوئے۔ اگرچہ انکی تقریر روکھی تھی۔ نہ کہیں لطف زبان تھا۔ نہ پُر مزہ چٹکیاں۔ لیکن انکی باتوں کو لوگ بڑے غور سے سُنتے رہے۔ اُنکی بے غرض قومی مشاغل نے پبلک کو ان کا معتقد بنا دیا تھا۔ انکی خشک اور پھیکی تقریر کو لوگ ایسے شوق سے سُنتے تھے جیسے پیاسا آدمی پانی پیتا ہے۔ اُن کے پانی کے سامنے دوسروں کا شربت پھیکا پڑ جاتا تھا۔

بالآخر پدم سنگھ اُٹھے۔ سدن کے سینے میں گُدگُدی سی ہونے لگی۔ گویا کوئی غیر معمولی بات ہونیوالی ہے، تقریر نہایت دلاویز اور جذبۂ درد سے پُر تھی۔ زبان کی سلالت اور لطافت دلوں پر تسخیر کا عمل کر رہی تھی۔ موقع موقع پر انکا طرز بیان اتنا موثر ہو جاتا تھا۔ کہ سدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے

اگرچہ ابھی تک اس کے دل میں شکوک تھے۔ لیکن اس تجویز کے مفید ہونے میں اسے مطلق شبہ نہ تھا، اس لئے وہ اُن شکوک کو مخفی رکھنا ہی مناسب سمجھتا تھا۔ کہ کہیں اُن کو ظاہر کرنے سے اُس کا پہلو کمزور نہ ہو جائے۔ سمن اب بھی اُس کے دل میں بسی ہوئی تھی۔ اُس کے دیدار کی تمنا اب بھی اسے بیتاب کرتی رہتی تھی۔ سمن کا حُسن ملیح اسکی نظروں سے کبھی نہ اُترتا تھا۔ ان خیالات سے بچنے کے لئے اس نے اکیلے بیٹھنا ترک کر دیا۔ علی الصباح گنگا نہانے چلا جاتا۔ رات کو دس بجے تک اخبار اور کتابیں پڑھا کرتا۔ لیکن اتنی بندشوں پر بھی سمن اسکی یاد سے نہ اُترتی تھی۔ وہ طرح طرح کے بھیس بدل کر اسکی نگاہ باطن کے سامنے آتی۔ اور کبھی اس سے روٹھتی۔ کبھی اسے مناتی۔ کبھی شوق سے اُس کے گلے میں باہیں ڈالتی، پریم سے مسکراتی۔ دفعتہً سدن ہوشیار ہو جاتا جیسے کوئی نیند سے چونکے اور ان شورش انگیز تخیلات کو ہٹا کر سوچنے لگتا۔ آج کل چچا صاحب اتنے اداس کیوں ہیں؟ کبھی ہنستے نہیں نظر آتے۔ جیتن اُنکے لئے روز دوائیں کیوں لاتا ہے؟ آخر انہیں کیا ہو گیا ہے۔ اتنے میں سمن پھر اس کے خانہ دل میں آجاتی اور باچشم پُرآب کہتی۔ "سدن تم سے ایسی امید نہ تھی۔ تم سمجھتے ہو۔ کہ یہ ایک بازاری عورت ہے۔ لیکن میں نے تمہارے ساتھ کوئی دغا نہیں کی۔ اپنا سرمایہ الفت تمہیں سونپ دیا۔ کیا تمہاری نگاہ میں اسکی ذرا بھی وقعت نہیں ہے؟ سدن پھر چونک پڑتا۔ اور پھر خیال کو ہٹانے کی کوشش کرتا۔ اس نے ایک تقریر میں سُنا تھا۔ کہ انسان خود اپنی زندگی کا معمار ہے۔ وہ اپنے تئیں جیسا

چاہے ویسا بنا سکتا ہے۔ اس کا راز یہی ہے۔ کہ گندے اور مخرب خیالات دل میں نہ آنے پائیں۔ وہ بزوران خیالات کو دباتا رہے۔ اور پاکیزہ خیالات سے دل کو معمور رکھے۔ سدن اس اصول کو ایک دم کے لئے بھی فراموش نکرتا تھا۔ اسی تقریر میں اس نے یہ بھی سُنا تھا۔ کہ زندگی کو اعلیٰ بنانے کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں۔ صرف پاکیزہ خیالات اور محسوسات کی ضرورت ہے۔ اس لئے وہ تزکیہ نفس کی سعی میں مصروف رہتا تھا۔ ہزاروں آدمیوں نے اس تقریر میں سُنا تھا۔ کہ ہر ایک مکروہ خیال ہماری اس زندگی ہی کو نہیں۔ آنیوالی زندگی کو بھی خراب کر دیتا ہے۔ لیکن جو زیادہ عقیل تھے۔ وہ سُنکر بھول گئے۔ سادہ دل سدن نے سُنا۔ اور اُسے گانٹھ میں باندھ لیا۔ جیسے کوئی غریب آدمی ایک اشرفی پا جائے۔ اور اسے جان سے زیادہ عزیز رکھے۔ آج کل سدن تہذیب نفس کی دُھن میں لگا رہتا تھا۔ راستہ میں اگر اسکی نگاہ کسی عورت پر پڑ جاتی۔ تو وہ فوراً اپنے تئیں ملامت کرتا۔ اور دل کو سمجھاتا۔ کہ تو ایک لمحہ کی لطف دید کے لئے اپنی مستقبل زندگی کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ اس تنبیہہ سے اس کے دل کو ایک خاص تقویت ہوتی تھی ٭

ایک دن گنگا اشنان کو جاتے ہوئے سدن کو چوک میں طوائفوں کا ایک جلوس دکھائی دیا۔ شہر کی سب سے ممتاز طوائف نے عُرس کیا تھا۔ یہ جلوس وہاں سے واپس آ رہا تھا۔ سدن نے حُسن اور آرائش اور بانکپن کی ایسی بہار کبھی نہ دیکھی تھی۔ ریشم۔ رنگ۔ اور رونق کا ایسا دلاویز نظارہ نکھار

اور نفاست۔ طنازی اور رعنائی کا ایسا سرور انگیز ہنگامہ اس کے لئے بالکل انوکھا تھا۔ اُس نے اپنے اوپر بہت ضبط کیا۔ پر بے سود۔ اُس نے حُسن کے ان نورانی پیکروں کو ایک بار آنکھ بھر کر دیکھا۔ جیسے کوئی طالب علم مہینوں کی ریاضت شاقہ کے بعد امتحان سے فارغ ہو کر سیر مناظر میں محو ہو جائے۔ ایک نگاہ سے اُسے تسکین نہ ہوئی۔ اس نے پھر نظر ڈالی۔ یہاں تک کہ اُسکی نگاہیں پھر اسی طرف جم گئیں۔ گویا کسی نے انہیں زنجیر سے باندھ دیا ہو۔ وہ راستہ چلنا بھول گیا۔ اور مدہوشی کے عالم خاموش میں نقش دیوار بنا کھڑا رہا۔ جب جلوس گزر گیا۔ تو اسے ہوش آیا۔ چونکا۔ اور اپنے اُوپر نفریں کرنے لگا۔ مینے مہینوں کی کمائی ایک لمحہ میں گنوا دی۔ اپنے نفس کو کتنا پامال کر دیا۔ میں کتنا ضعیف ہوں۔ لیکن پھر اس نے اپنے تئیں سمجھایا۔ کہ محض نظارۂ حُسن سے میں گناہ کا مرتکب تھوڑا ہی ہو سکتا ہوں۔ میں نے انہیں نگاہِ بد سے نہیں دیکھا۔ میرا دل فسق سے پاک تھا۔ باغبان قدرت کی گلکاریوں سے پاک لطف اُٹھانا بھی ایک ذریعہ عبادت ہے!

یہ سوچتے ہوئے وہ آگے چلا۔ لیکن اسکی روح کو تسکین نہ ہوئی۔ میں اپنے ہی کو دھوکا دینا چاہتا ہوں! یہ تسلیم کر لینے میں کیا قباحت ہے۔ کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ ہاں ہوئی اور ضرور ہوئی۔ لیکن میں اپنے دل کی موجودہ حالت کے اعتبار سے اسے معافی کے قابل سمجھتا ہوں۔ میں ولی نہیں۔ زاہد نہیں سنیاسی نہیں۔ ایک ضعیف العقل آدمی ہوں۔ اتنا اونچا معیار پیش نگاہ رکھ کر میں اس پر عمل نہیں کر سکتا۔ آہ! حُسن بھی کیا چیز ہے! لوگ کہتے

ہیں نفس پرستی سے چہرہ کی رونق غائب ہوجاتی ہے۔ لیکن ان حسینوں کی نفس پرستی ان کے حُسن کو اور بھی دوبالا کرتی ہے۔ چہرہ کو دل کا آئینہ کہتے ہیں۔ یہ بھی لغو ہے +

سدن نے پھر دل کو سنبھالا۔ اور اُسے اس طرف سے منحرف کرنے کے لئے اس معاملہ کے دوسرے پہلو پر غور کرنے لگا۔ ہاں یہ عورتیں بہت ہی حسین ہیں۔ بہت ہی نازک بدن۔ لیکن انہوں نے اُن پاک نعمتوں کا کتنا بیجا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے اپنی روح کو کتنا نیچے گرا دیا ہے۔ محض ان ریشمی کپڑوں کے لئے اِن جگمگاتے ہوئے زیوروں کے لئے انہوں نے اپنی عصمت جیسی بے بہا جنس بیچ ڈالی ہے۔ وہ آنکھیں جنسے خلوص الفت کی شعاعیں نکلنی چاہیئے تھیں۔ شوخی۔ شرارت اور نفسانیت سے پُر ہو رہی ہیں۔ وہ دل جن میں خالص پاک محبت کا چشمہ رواں ہونا چاہیئے تھا۔ کتنے متعفن اور زہریلی غلاظت سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ کتنا افسوسناک نظارہ ہے!

ان نفرت انگیز خیالوں سے سدن کو کچھ تسکین ہوئی۔ وہ ٹہلتا ہُوا گنگا کے کنارے پہنچا۔ اس اُدھیڑ بن میں آج اُسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ اس گھاٹ پر نہ گیا۔ جہاں وہ معمولاً نہایا کرتا تھا۔ وہاں بھیڑ ہو گئی ہوگی۔ چنانچہ وہ اس گھاٹ پر گیا۔ جو بدھوا آشرم سے ملحق تھا۔ وہاں سناٹا رہتا تھا۔ دور ہونے کے باعث شہر کے لوگ وہاں کم جاتے تھے +

گھاٹ کے قریب پہنچا تو سدن کو گھاٹ کی طرف سے ایک عورت آتی ہوئی دکھائی دی۔ فوراً پہچان گیا۔ یہ سمن تھی۔ پر اسکی صورت کتنی متغیر

ہو گئی تھی! نہ وہ لمبے لمبے سیاہ گیسو تھے۔ نہ وہ تن نازک۔ نہ وہ ہنستے ہوئے گلاب کے سے ہونٹ۔ نہ وہ رقیق اور مست آنکھیں۔ نہ وہ آرائش اور سنگار۔ نہ وہ مرصع زیوروں کی بہار۔ وہ محض ایک سفید ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اسکی رفتار میں متانت تھی۔ اور بشرہ سے مایوسی اور حسرت جھلک رہی تھی۔ داستان وہی تھی۔ لیکن استعارات سے پاک۔ اور اس لئے زیادہ سلیس اور پُرتاثیر۔ اُسے دیکھتے ہی سدن وفور شوق سے کئی قدم خوب تیز چلا۔ پر اسکی یہ کایا پلٹ دیکھی۔ تو ٹھٹھک گیا۔ گویا اُسے پہچاننے میں غلطی ہوئی۔ گویا یہ سمن نہیں کوئی دوسری عورت ہے۔ اس کا جوش محبت دھیما پڑ گیا۔ اُسکی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ یہ تغیر کیوں ہو گیا۔ اس نے پھر سمن کی طرف دیکھا۔ وہ اُسکی طرف تاک رہی تھی۔ لیکن اُسکی نگاہ میں جذبۂ شوق کی بجائے ایک بیدلی تھی۔ گویا وہ پچھلی باتوں کو یا تو بھول گئی ہے۔ یا بھولنا چاہتی ہے۔ گویا وہ دبی ہوئی آگ کو اُبھارنا نہیں چاہتی۔ سدن کو ایسا گمان ہُوا۔ کہ وہ مجھے خود غرض۔ مکار۔ اور بیوفا سمجھ رہی ہے۔ اس نے ایک بار پھر اسکی طرف دیکھا۔ یہ یقین کرنے کے لئے کہ میرا گمان غلط تو نہیں ہے۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ پر ملتے ہی ہٹ گئیں۔ سدن کو اپنے گمان کا یقین ہو گیا۔ اور اس یقین کے ساتھ ہی اس کے دل میں غرور کا احساس ہُوا۔ اس نے اپنے تئیں دھتکارا۔ ابھی ابھی میں نے اپنے دل کو اتنا سمجھایا ہے۔ اور اتنی ہی دیر میں پھر انہیں بیہودہ خیالات میں پڑ گیا۔ اُس نے پھر سمن کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ سر جھکائے اس کے سامنے سے نکل گئی۔ سدن

نے دیکھا۔ کہ اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ لیکن وہ جگہ سے نہ ہلا۔ کسی قسم کا اشارہ نہ کیا۔ اپنے خیال میں اس نے سمن پر ثابت کر دیا۔ کہ اگر تم مجھسے ایک کوس بھاگو گی۔ تو میں تم سے سو کوس بھاگنے پر تیار ہوں۔ پر اسے یہ دھیان نہ رہا۔ کہ میں اپنی جگہ پر صورت تصویر کھڑا ہوں۔ جن جذبات کو اس نے پوشیدہ رکھنا چاہا۔ خود انہیں جذبات کی تصویر بنگیا۔ جب سمن کچھ دور نکل گئی۔ تو وہ لوٹ پڑا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے اپنے تئیں چھپاتا ہُوا چلا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا۔ کہ سمن کہاں جاتی ہے۔ حزم نے خواہشات کے سامنے سر جُھکا لیا تھا +



جس دن سے بارات لوٹ گئی۔ اسی دن سے پنڈت کرشن چندر پھر گھر سے باہر نہیں نکلے۔ افسردہ خاطر اپنے کمرہ میں بیٹھے رہتے۔ انہیں اب کسی کو اپنا مُنہ دکھاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ سمن نے انہیں دُنیا کی نظروں میں چاہے کم گرایا ہو۔ لیکن اپنی ہی نظروں میں وہ کہیں کے نہ رہے تھے۔ وہ اس رسوائی کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ وہ تین سال قید رہے لیکن اپنی نگاہ میں اس قدر نیچے نہ گرے تھے۔ وہاں انہیں اس خیال سے تسکین ہوتی تھی۔ کہ یہ میری بداعمالیوں کی سزا ہے۔ لیکن اس داغ سیاہ نے ان کے غرور کو پامال کر دیا۔ وہ اب اُن رذیل آدمیوں کے پاس بھی نہ جاتے تھے۔ جن کے ساتھ بیٹھ کر گانجہ اور چرس کے دم لگایا کرتے تھے۔ وہ جانتے

تھے۔ کہ میں اب اُن سے بھی نیچے گر گیا ہوں۔ انہیں معلوم ہوتا تھا۔ کہ ساری
دنیا میں میری بدنامی ہو رہی ہے۔ لوگ کہتے ہونگے۔ کہ اس شخص کی لڑکی
.... یہ خیال آتے ہی وہ غیرت اور رنج کے اتھاہ ندی میں ڈوبنے لگتے
تھے۔ ہائے اگر میں جانتا۔ کہ سمن یوں خاندان میں داغ لگائے گی۔ تو میں نے
اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا۔ یہ میں جانتا ہوں۔ کہ وہ خوددار عورت تھی۔ کسی
بڑے گھر میں رہنے کے قابل تھی۔ سامان عیش اور نمود پر جان دیتی تھی لیکن
میں یہ نہ جانتا تھا۔ کہ اس کا ضمیر اتنا کمزور ہے۔ دنیا میں ایسا کون خوش نصیب
ہے۔ جس کے سب دن برابر ہو جاتے ہوں؟ مصیبت سبھی پر آتی ہے۔ بڑے
بڑے متمول گھرانوں کی عورتیں روٹی کپڑے کو محتاج ہو جاتی ہیں۔ پر کوئی
ان کے چہرہ پر شکن تک نہیں دیکھ سکتا۔ وہ رو رو کر دن کاٹتی ہیں۔ یہ کیا
مجال کہ کوئی انکی بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھ لے۔ وہ مر جاتی ہیں لیکن کسی کا
احسان سر پر نہیں لیتیں۔ کسی کے سامنے اپنا دکھڑا نہیں روتیں۔ وہ دیویاں
ہیں۔ خاندان کے نام پر جیتی ہیں۔ اور اُسی کے نام پر مر جاتی ہیں۔ پر یہ بدنصیب
یہ بے غیرت... اور اُس کا شوہر کیسا نالائق ہے۔ کہ اس کا سر نہیں کاٹ
لیا۔ جسوقت اُس نے گھر سے باہر پاؤں نکالے۔ اُس نے کیوں اس کا گلا
نہیں دبا دیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی بیحیا۔ بدکردار۔ نامراد آدمی ہے۔ اس
میں اپنے خاندانی وقار کا لحاظ ہوتا۔ تو یہ نوبت نہ آتی۔ اُسے اپنی رسوائی
کی شرم نہ ہوگی۔ پر مجھے ہے۔ اور اسکی سزا سمن کو دے گی۔ جن ہاتھوں سے
اُسے پالا۔ کھلایا۔ انہیں ہاتھوں سے اسکی گردن پر تلوار چلاؤں گا ہی

آنکھیں کبھی اسکی خوش فعلیوں پر خوش ہوتی تھیں۔ اب وہ اُسے خون میں تڑپتے دیکھ کر شاد ہونگی۔ مٹی ہوئی آبرو کو بحال کرنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں ہے۔ دُنیا کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ خاندانی ننگ و ناموس پر مرنے والے بیحیائیوں کی کیا سزا دیتے ہیں!

یہ فیصلہ کر کے کرشن چندر اس مہلک ارادہ کو پورا کرنے کے وسائل پر غور کرنے لگے۔ جیل خانہ میں انہوں نے مجرموں سے قتل اور خون کے کتنے ہی منتر سیکھے تھے۔ شب روز انہیں باتوں کے چرچے رہتے تھے۔ انہیں سب سے بہتر یہی صورت معلوم ہوئی۔ کہ چلکر اُسے تلوار سے ماروں۔ اور تب خود پولیس کو اسکی اطلاع کر دوں۔ مجسٹریٹ کے روبرو میرا جو بیان ہوگا۔ اُسے سُنکر لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں گی!

دل میں اس نشۂ خون سے مست ہو کر وہ اپنا بیان مرتب کرنے لگے۔ پہلے مہذب جماعت کی ہوس پروری کا ذکر کروں گا، تب پولیس کے ہتھکنڈوں کی قلعی کھولوں گا۔ اس کے بعد رسم قرار داد اور جہیز پر ایسی ایسی چوٹیں کروں گا۔ کہ سُننے والے دنگ رہ جائیں گے۔ لیکن سب سے معرکتہ الآرا اظہار کا وہ حصہ ہوگا۔ جس میں ثابت کروں گا۔ کہ اپنی بے حرمتی کے حقیقی باعث ہم خود ہیں۔ ہم اپنی کم ہمتی سے۔ جان کے ڈر سے۔ رسوائی کے خوف سے۔ اولاد کی جھوٹی محبت سے اپنی بیشرمی سے۔ اپنے حفظ وقار کی نا اہلیت سے۔ ایسی ناشائستگیوں کو چھپاتے ہیں۔ ان پر پردہ ڈالتے ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ سفلہ طبیعتیں اس قدر بیباک ہو گئی ہیں*

کرشن چندر نے یہ عزم تو کر لیا۔ لیکن ابھی تک یہ نہ سوچا تھا۔ کہ شانتا کی کیا گت ہو گی۔ غیرت نے اُن کے دل میں اور کسی فکر کے لئے جگہ ہی نہ باقی رکھی تھی۔ اُنکی حالت اس آدمی کی سی تھی۔ جو اپنے لختِ جگر کو بستر مرگ پر چھوڑ کر اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لئے آمادہ ہو جاتے۔ جو ڈونگی پر بیٹھا ہُوا پانی میں ایک سانپ دیکھ کر اسکی طرف جھپٹے۔ اور اسے یہ خیال نہ رہے کہ اس جھٹکے سے ڈونگی ڈوب جاتے گی۔

شام کا وقت تھا۔ کرشن چندر نے آج قصد خون کر لیا تھا۔ اسوقت انکی طبیعت کچھ مضمحل تھی۔ یہ وہ افسردگی تھی۔ جو کسی خوفناک کام کرنے کے قبل دل پر مستولی ہو جاتی ہے۔ کئی دنوں تک غصہ و غم کے جنون میں رہنے کے بعد اسوقت اُن کے دل پر جمود کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ جیسے ہوا کچھ دیر تک تیزی سے چلنے کے بعد دھیمی پڑ جاتی ہے۔ کرشن چندر کو وہ دن یاد آ رہے تھے۔ جب انکی زندگی کلفت و کاوش سے آزاد تھی۔ جب وہ روز شام کے وقت اپنی دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے کر سیر کو نکلتے تھے۔ کبھی سمن کو گود میں لیتے کبھی شانتا کو۔ جب وہ گھر لوٹتے۔ تو گنگا جلی کس طرح شوقِ محبت سے مسرور ہو کر دونوں لڑکیوں کو پیار کرنے لگتی تھی۔ یادِ مسرت لطفِ مسرت سے زیادہ دلپذیر ہوتی ہے۔ وہی جنگل اور پہاڑ جو کبھی آپ کو سنسان اور بیہڑ معلوم ہوتے تھے۔ وہی ندیاں اور جھیلیں جنکے کنارہ سے آپ آنکھیں بند کئے نکل جاتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد نہایت دلکش اور خوش آئند صورتیں اختیار

کوکے آپ کی نگاہِ یاد کے سامنے آتے ہیں۔ اور پھر انہیں مناظر کی سیر کی تمنا آپ کے دل میں موج زن ہو جاتی ہے۔ کرشن چندر پر ایام گزشتہ کی یاد کرتے کرتے رقت طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے اشک جاری ہو گیا۔ افسوس! اس پُر مسرت زندگی کا ایسا غمناک انجام ہو رہا ہے! میں اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے گود کی کھیلی ہوئی لڑکی کا خون کرنے پر آمادہ ہو رہا ہوں۔ دفعتہً کرشن چندر کو سمن پر رحم آیا۔ وہ غریب نادانی سے کنوئیں میں گر پڑی ہے کیا میں ایسا بیرحم ہو جاؤں۔ کہ اُوپر سے اُسپر پتھر پھینکوں؟ لیکن یہ رحم اُن کے دل میں دیر تک نہ قائم رہا۔ جونہی اُنہیں خیال آیا۔ کہ اس کا دروازہ آج سب کے لئے کھُلا ہے۔ ہندو مسلمان آج وہاں بے تکلف داخل ہو سکتے ہیں۔ ان کا احساس شرم پھر تازہ ہو گیا۔ آتش غضب پھر دہک اٹھی۔

اسی اثنا میں پنڈت اُمانا تھ اُن کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ اور بولے۔ "میں وکیلوں کے پاس گیا تھا۔ انکی صلاح ہے۔ کہ مقدمہ دائر کرنا چاہئے"۔

کرشن چندر نے چونک کر پوچھا۔ "کیسا مقدمہ؟"

اُمانا تھ۔ انہیں لوگوں پر جو دروازہ سے بارات لوٹا لے گئے۔

کرشن چندر۔ اس سے کیا حاصل؟

اُمانا تھ۔ اس سے یہ ہوگا۔ کہ یا تو وہ پھر لڑکی سے شادی کرینگے۔ یا ہرجانہ دیں گے۔

کرشن چندر۔ لیکن کیا بدنامی اور زیادہ نہ ہوگی؟

اُمانا تھ۔ بدنامی جو کچھ ہونی تھی ہو چکی۔ اب کس بات کا ڈر۔ میں نے ایک ہزار روپے تیلک میں دیئے۔ چار پانچسو روپے تو اضع وتکریم میں خرچ کیئے۔ یہ سب کیوں چھوڑ دوں؟ یہی روپے کسی اچھے کُل کے آدمی کو دے دوں گا۔ تو وہ خوشی سے شادی کرنے پر تیار ہو جائیگا۔ ذرا ان روشن خیال حضرات کی قلعی تو کھُلے +

کرشن چندر نے لمبی سانس بھر کر کہا "پہلے مجھے زہر دیدو۔ تب یہ مقدمہ دائر کردو"+

اُمانا تھ نے چڑھ کر کہا۔ "آپ کیوں اتنا ڈرتے ہیں؟"

کرشن چندر۔ تم نے مقدمہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے؟

اُمانا تھ۔ ہاں میں نے پورا ارادہ کر لیا ہے۔ کل سارے شہر کے بڑے بڑے وکیل بیرسٹر جمع تھے۔ یہ مقدمہ اپنے ڈھنگ کا نرالا ہے۔ اُن لوگوں نے بہت کچھ دیکھ بھال کر یہ مشورہ دیا ہے۔ دو وکیلوں کو بیعانہ تک دے آیا ہوں +

کرشن چندر نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ دائر کردو"+

اُمانا تھ۔ آپ کو اس کا اس قدر ملال کیوں ہے؟

کرشن چندر۔ جب تم خود ہی نہیں سمجھتے۔ تو میں کیا بتاؤں۔ جو بات ابھی تک صرف قرب وجوار کے موضعوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ سارے شہر میں پھیل جائیگی۔ سمن ضرور ہی اجلاس پر بُلائی جائیگی۔ میرا نام گلی گلی بکے گا +

اُمانا تھ۔ اب اس سے کہاں تک ڈروں؟ مجھے بھی تو اپنی دونوں لڑکیوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ یہ کلنک اپنے ماتھے پر لگا رہنے دوں۔ تو اُن کی شادی میں رخنہ نہ پیدا ہوگا؟

کرشن چندر۔ تو یہ مقدمہ تم اس لئے دائر کر رہے ہو جسمیں تمہارے نام پر کوئی داغ نہ رہے؟

اُمانا تھ نے پُر غرور لہجہ میں کہا "ہاں اگر آپ اس کے یہ معنے نکالتے ہیں تو یہی سہی۔ بارات میرے ہی دروازے سے لوٹی ہے۔ لوگوں کا یہ گمان ہو رہا ہے۔ کہ سمن میری ہی لڑکی ہے۔ سارے شہر میں مجھی پر انگلیاں اُٹھ رہی ہیں۔ میرا دعویٰ دس ہزار کا ہوگا۔ اگر پانچہزار کی بھی ڈگری ہوگئی تو شانتا کی شادی کسی اچھے خاندان میں ہو جائے گی۔ آپ جانتے ہیں جھوٹی چیز کھانے کے لئے مٹھاس کی ضرورت ہے۔ جب تک روپوں کی گٹھڑی نہ دی جائیگی۔ شانتا کی شادی کیونکر ہوگی؟ ایک طرح سے میرے خاندان میں داغ لگ گیا۔ پہلے جو لوگ مجھ سے ناتا کرنے میں اپنا فخر سمجھتے تھے۔ وہ اب لمبی تھیلی کے بغیر سیدھے مُنہ سے بات بھی نہ کرینگے معاملہ کی یہ صورت ہے۔ مجھے روپیوں کی بیحد ضرورت ہے۔ اور اتنے روپوں کے ہاتھ آنے کی دوسری کوئی تدبیر نہیں ہے"۔

کرشن چندر۔ اچھی بات ہے۔ مقدمہ دائر کردو۔

اُمانا تھ چلے گئے۔ تو کرشن چندر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ یا ایشور! اب مجھے اُٹھا لو۔ یہ ذلّت نہیں سہی جاتی۔ آج انہیں اپنی بے ناموسی کا

ایک التجا کرتا ہوں +

شانتا۔ کہئے کیا حکم ہے؟

کرشن چندر۔ یہی کہ صبر کو کبھی مت چھوڑو۔ یہ منتر بڑے سے بڑے وقت پر بھی تمہیں سنبھالتا رہے گا +

شانتا تاڑ گئی۔ کہ یہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے۔ مگر لحاظ کے باعث نہ کہہ سکے۔ اُن کے دل کی بات اُس سے چھپی نہ رہی۔ اُس نے متکبرانہ انداز سے سر اُٹھالیا۔ اور پُرغرور نظروں سے کرشن چندر کی طرف دیکھا۔ اُسکی اس اعتقاد انگیز نگاہ نے وہ سب کچھ۔ اور اُس سے بہت زیادہ کہہ دیا۔ جو وہ اپنی زبان سے کہہ سکتی +

(۱۹)

آدھی رات گزر چکی تھی۔ کرشن چندر گھر سے باہر نکلے۔ ناظورۂ قدرت کسی ضعیفہ کی طرح کہرے کی موٹی چادر اُوڑھے چپ چاپ پڑی ہوئی تھی۔ آسمان میں چاند مُنہ چھپائے ہوئے تیزی سے دوڑا چلا جاتا تھا۔ معلوم نہیں کہاں! کرشن چندر کے دل میں ایک بیتابانہ اشتیاق پیدا ہُوا۔ شانتا کو کیونکر دیکھوں؟ دُنیا میں یہی ایک چیز ان کے اچھے دنوں کی یادگار باقی رہ گئی تھی۔ مایوسی کی گہری تاریکی میں یہی ایک روشنی کی جھلک انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک دروازہ پر خاموش کھڑے رہے۔ اور تب ایک ٹھنڈی سانس بھر کر آگے بڑھے۔ انہیں ایسا معلوم ہوا۔ گویا گنگا جلی آسمان پر بیٹھی ہوئی مجھے بلا رہی ہے کرشن چندر کے دل میں اسوقت کوئی خواہش۔ کوئی آرزو۔ کوئی فکر نہ تھی۔ دنیا

سے انکی طبیعت بیزار ہو گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ کسی طرح جلد گنگا کنارے پہنچوں۔ اور اسکی لہروں میں روپوش ہو جاؤں، اُنہیں خوف ہوتا تھا۔ کہ دیر ہونے سے میری ہمت ٹوٹ نہ جائے۔ انہوں نے اپنے عزم کو مشتعل کرنے کے لئے دوڑنا شروع کیا۔

لیکن تھوڑی ہی دور چلکر وہ پھر ٹھٹک گئے۔ اور سوچنے لگے۔ پانی میں کود پڑنا کچھ بہت مشکل تو نہیں۔ جہاں زمین سے پیر اکھڑے کام تمام ہُوا۔ اس خیال سے اُن کا دل کانپ اٹھا۔ دفعتہً ان کے دھیان میں آیا۔ کہ کہیں بھاگ کیوں نہ جاؤں؟ جب یہاں رہوں گا ہی نہیں۔ تو زبان خلق سے مجھے کیا؟ ہوگا۔ لیکن اس خیال کو انہوں نے اپنے دل میں ٹھہرنے نہ دیا۔ ہوس دنیا کی یہ دام افگنی انہیں دھوکا نہ دے سکی۔

اگرچہ کرشن چندر کا میلان مذہبی عقائد کی جانب نہ تھا۔ اور نادیدہ کے ایک موہوم خوف سے ان کا دل کانپ رہا تھا۔ لیکن اپنے ارادہ کو مستقل رکھنے کے لئے وہ اپنے تئیں یقین دلا رہے تھے۔ کہ پرماتما بڑا رحیم اور غفور ہے۔ انکی باطن پر پردہ سا پڑ گیا تھا۔ اُن کے نفس کی حالت اس لڑکے کی سی تھی۔ جو اپنے کسی ہمجولی کے کھلونے توڑ ڈالنے کے بعد اپنے ہی گھر میں جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔

کرشن چندر اسی طرح قدم بڑھاتے ہوئے چار میل تک چلے گئے۔ جوں جوں گنگا قریب آتی جاتی تھی۔ اُن کے دل کی حرکت بڑھتی جاتی تھی۔ خوف سے حواس پریشان ہوئے جاتے تھے۔ لیکن وہ اس ضعف قلب کو کچھ تو اپنی

سرعت گام اور کچھ ملامت اور تحقیر سے دور کرنیکی کوشش کر رہے تھے۔ آہ! میں کتنا بے شرم۔ بے غیرت ہوں؟ بُردشا ہونے پر بھی موت سے ڈرتا ہوں۔ دفعتہً اُن کے کان میں گانے کی آواز آئی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے تھے۔ وہ آواز قریب ہوتی جاتی تھی۔ گانے والا انہیں کی طرف چلا آتا تھا۔ اس خاموشی میں کرشن چندر کو وہ صدا بہت سُریلی معلوم ہوئی۔ کان لگا کر سننے لگے۔ اگرچہ نغمہ دلکش نہ تھا۔ لیکن اصول فن کے مطابق تھا۔ اس لئے کرشن چندر کو بہت لطف حاصل ہُوا۔ اس فن میں اُنہیں اچھا ذوق تھا۔ اس نغمہ سے ان کے قلب مضطر کو گونہ تسکین ہوئی۔

گانا بند ہوگیا۔ اور ایک لمحہ کے بعد کرشن چندر نے ایک دراز قد۔ جٹا دھاری سادھو کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ سادھو نے ان کا نام اور مقام پوچھا۔ اور تب مودبانہ انداز سے بولا۔ "اس وقت آپ ادھر کہاں جا رہے ہیں"؟

کرشن چندر۔ کچھ ایسا ہی کام آپڑا ہے۔

سادھو۔ آدھی رات کو آپ کا گنگا کنارے کیا کام ہوسکتا ہے؟

کرشن چندر نے ترشی سے جواب دیا۔ "آپ تو روشن ضمیر ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے"۔

سادھو۔ میں روشن ضمیر نہیں ہوں۔ اور نہ مجھے سادھو ہونے کا دعویٰ ہے۔ میں محض ایک بھکاری برہمن ہوں۔ لیکن اس وقت میں آپ کو اُس طرف نہ جانے دوں گا۔

کرشن چندر۔ تم اپنی راہ جاؤ۔ میرا راستہ روکنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔

سادھو۔ حق نہ ہوتا تو میں آپ کو روکتا کیونکہ آپ مجھے جانتے نہیں ہیں لیکن میں آپ کا دھرم پُتر ہوں۔ میرا نام گجادھر پانڈے ہے +

کرشن چندر۔ اچھا آپ پنڈت گجادھر پرشاد ہیں۔ آپ نے یہ بھیس کب سے اختیار کیا۔ آپ سے ملنے کی مجھے بہت خواہش تھی۔ مجھے آپ سے بہت باتیں پوچھنی ہیں +

سادھو۔ میرا ڈیرا اس وقت گنگا کے کنارے ایک درخت کے نیچے ہے۔ چلیئے وہاں تھوڑی دیر آرام کیجیے۔ میں سارا واقعہ آپ سے بیان کروں گا +

راستہ میں دونوں آدمیوں میں کچھ گفتگو نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر میں وہ لوگ اُس درخت کے نیچے آپہنچے۔ وہاں ایک موٹا سا کُندا جل رہا تھا۔ زمین پر پوال بچھا ہُوا تھا۔ اور اُس پر ایک مرگ چھالا۔ ایک کمنڈل اور کتابوں کا ایک بستہ رکھا ہُوا تھا +

کرشن چندر نے آگ پر ہاتھ سینکتے ہوئے پوچھا۔ آپ اب سادھو ہو گئے ہیں۔ سچ کہئے گا۔ سمن کی یہ حالت کیوں ہو گئی؟

گجانند آگ کی روشنی میں کرشن چندر کے چہرہ کو مبصرانہ انداز سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں اُن کے چہرے پر اُن کے دل کی ساری کیفیات جلی حروف میں لکھی ہوئی نظر آتی تھیں۔ وہ اب وہ گجادھر پنڈت نہ تھے۔ فقیروں کی صحبت اور مشق و ریاضت نے ان کے باطن کو روشن کر دیا تھا۔ اب وہ اس واقعہ پر جتنا ہی غور کرتے تھے۔ اتنا ہی انہیں افسوس ہوتا تھا۔ سمن سے اب اُنہیں ہمدردی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی ان کا جی چاہتا تھا۔ کہ چلکر سمن سے

اپنی خطا کی معافی مانگوں۔ کرشن چندر سے بولے "اس کا سبب میری حماقت تھی۔ یہ میری ہی بے رحمی اور وحشیانہ برتاؤ کا نتیجہ تھا۔ وہ عورت دل کی رانی تھی۔ وہ اس قابل تھی۔ کہ کسی بڑے گھر کی مالکن بنتی۔ مجھ جیسا کمینہ پست ہمت اور ناشناس آدمی اُس کے قابل نہ تھا۔ اس وقت میری موٹی نگاہیں اُسکی ذاتی خوبیوں کو نہ دیکھ سکتی تھیں، ایسی کوئی تکلیف نہ تھی۔ جو اس غریب کو میرے ساتھ نہ اُٹھانی پڑی ہو۔ پر وہ کبھی آزردہ خاطر نہیں ہوئی۔ وہ میری عزت کرتی تھی۔ لیکن اُس کا یہ برتاؤ دیکھ کر مجھے شبہ ہوتا تھا۔ کہ وہ میرے ساتھ دغا کر رہی ہے، اُسکی قناعت۔ اُسکی متانت۔ اُسکی وفاداری میری سمجھ میں نہ آتی تھی، میں سمجھتا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی چال چل رہی ہے۔ اگر وہ ذرا ذرا سی باتوں کے لئے مجھ سے جھگڑے کرتی۔ روتی۔ کوستی۔ طعنے دیتی۔ تو شاید مجھے اُس پر زیادہ اعتبار ہوتا۔ اسکی بلند نظری ہی میری بدگمانی کا سبب تھی۔ میں اسکی عصمت پر شبہ کرنے لگا۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی۔ کہ ایک دن صرف رات کو ایک سہیلی کے گھر پر دیر ہو جانے کے باعث میں نے اسے گھر سے نکال دیا"۔

کرشن چندر نے قطع کلام کیا۔ "تمہاری عقل اسوقت کہاں گئی تھی؟ تمہیں ذرا بھی خیال نہ رہا۔ کہ تم ان سخت گیریوں سے کتنے بڑے خاندان کی تباہی کے سامان کر رہے ہو؟

گجانند۔ مہاراج اب کیا عرض کروں۔ کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے پھر اُس کی خبر نہ لی۔ پر میں قسم کھا سکتا ہوں۔ اس کا دل پاک تھا۔ اب وہ بدھوا آشرم میں

رہتی ہے۔ اور وہاں سب اُسکی عزت کرتے ہیں۔ سب اُسکی نیکی اور شرافت کے مدّاح ہیں +

گجانند کی باتیں سُنکر کرشن چندر کا دل سمن کی طرف سے نرم پڑ گیا۔ لیکن جیسے پانی کی دھار ایک طرف سے رُک کر دوسری طرف بہنے لگتی ہے۔ اسی طرح اُن کا غصّہ سمن کی جانب سے پھر کر گجانند کی جانب مائل ہُوا۔ وہ انہیں غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ "گجادھر تم نے میرے خاندان کو ڈبو دیا۔ تم نے مجھے کہیں مُنہ دکھانے کے لائق نہیں رکھا۔ تم نے میری لڑکی کی جان لی۔ اُسے تباہ کر دیا۔ تسپر بھی تم میرے سامنے اس طرح شان سے بیٹھے ہو۔ گویا کوئی مہاتما ہو۔ تمہیں چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے" +

گجانند زمین کی مٹی کھُرچ رہے تھے۔ سر نہ اٹھایا۔ کرشن چندر نے پھر کہا۔ تُم غریب تھے۔ اس میں تمہاری کوئی خطا نہ تھی۔ تم اگر اپنی بیوی کی مناسب طریق سے داشت نہ کر سکتے تھے۔ تو اس کا الزام تمہارے سر پر نہیں۔ تم اس کے دل کی کیفیتوں کو نہ جان سکے۔ اس کے حُسن سلوک کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ اس کے لئے میں تمہیں خطاوار نہیں ٹھہراتا۔ تمہاری خطا یہ ہے۔ کہ تم نے اُسے گھر سے نکال کیوں دیا؟ تم نے اُسے مار کیوں نہیں ڈالا؟ اگر تمہیں اس کی عصمت پر شبہ تھا۔ تو تم نے اس کا سر کیوں نہیں کاٹ لیا؟ اور اگر اتنی جرأت نہ تھی۔ تو خودکشی کیوں نہ کر لی؟ زہر کیوں نہ کھا لیا؟ اگر تم نے اسکی زندگی کا خاتمہ کر دیا ہوتا۔ تو اسکی وہ حالت نہ ہوتی جو ہوتی۔ میرے خاندان میں وہ داغ نہ لگتا۔ جو لگا۔ تم بھی کہو گے۔ کہ میں مرد ہوں! تمہاری اس کم ہمتی پر۔

اس بے شرمی پر۔ تُف ہے۔ جو انسان اتنا بے غیرت ہے۔ کہ اپنی بیوی کی بے عصمتی پر اس کے خون میں جوش نہیں آجاتا۔ وہ حیوانوں سے بھی گیا گزرا ہے۔
گجانند کو اب معلوم ہُوا۔ کہ سُمن کو بیخطا ثابت کرنے کی دُھن میں میں خود ایک دلدل میں آپھنسا۔ وہ پچھتانے لگے۔ کہ فیاضی کے جوش میں میں اتنا جھک کیوں گیا۔ وہ اپنے خیال میں اس سخت طعن اور تشنیع کے سزاوار نہ تھے۔ چوٹ کھایا ہُوا دل ایسی ملامت چاہتا ہے۔ جسمیں ہمدردی اور غم گساری ہو۔ وہ نہیں جسمیں ذلت اور خشونت ہو۔ پکا ہُوا پھوڑا نشتر کا زخم چاہتا ہے۔ پتھر کی چوٹ نہیں۔ گجانند اپنی ندامت پر پچھتاتے۔ ان کا دل پھر سمن کو خطا وار ثابت کرنے کے لئے بیقرار ہونے لگا۔

دفعتہً کرشن چندر نے گرج کر کہا۔ "کیوں تم نے اسے مار کیوں نہیں ڈالا؟"
گجانند نے تحمل سے جواب دیا۔ "میرا دل اتنا سخت نہیں تھا"۔

کرشن چندر۔ تو اُسے گھر سے کیوں نکال دیا؟
گجانند۔ محض اس لئے کہ اُس وقت مجھے اس سے اپنا گلا چھڑانیکی کوئی تدبیر نظر نہ آتی تھی۔

کرشن چندر نے مُنہ چڑھا کر کہا۔ "کیوں زہر تو کھا سکتے تھے"؟
گجانند اس زخم سے تڑپ گئے۔ بولے۔ "جان دینا بے سود تھا"؟

کرشن چندر۔ بے سود زندگی سے بے سود موت بہتر ہوتی ہے۔
گجانند۔ آپ میری زندگی کو بے سود نہیں کہہ سکتے۔
کرشن چند۔ کیا اسی لئے کہ تم یہ سوانگ بنائے پھرتے ہو؟

گنجانند۔ جی نہیں۔ اس لئے کہ میری زندگی سے دوسروں کو کچھ نہ کچھ نفع ضرور پہنچا ہے۔ آپ سے پنڈت اُمانا تھ نے کہا نہ ہوگا۔ کہیں میں نے اسی طرح بھیک مانگ کر شانتا کی شادی کے لئے پندرہ سَو روپے دیئے تھے۔ اور اس وقت بھی انہیں کے پاس ایک ہزار روپیہ اور لئے جا رہا تھا۔

یہ کہتے کہتے گنجانند خاموش ہو گئے۔ انہیں خیال آگیا۔ کہ اس امر کا ذکر کرنا میری کم ظرفی ہے۔ شرم سے سر جُھکا لیا۔

کرشن چندر نے مشتبہ انداز سے کہا۔ "انہوں نے اس کے متعلق مجھ سے کچھ نہیں کہا۔"

گنجانند۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جو وہ آپ سے کہتے۔ میری زبان سے بھی یہ بات سہواً نکل گئی۔ معاف کیجئے۔ میری منشا صرف یہ ہے۔ کہ اپنی جان دیگر میں دنیا کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکتا تھا۔ اس داغ نے مجھے اپنی زندگی کی اصلاح پر مائل کیا ہے۔ ضمیر خفتہ کو بیدار کرنے لئے ہماری غلطیاں ایک قسم کی ندائے غیب ہیں۔ جو ہمیں ہمیشہ کے لئے ہشیار کر دیتی ہیں۔ تعلیم صحبت تلقین۔ کسی کا بھی ہمارے اُوپر وہ نیک اثر نہیں پڑتا۔ جو اپنی غلطیوں کے بُرے نتائج سے پڑتا ہے۔ ممکن ہے۔ آپ اسے میری بے غیرتی سمجھ رہے ہوں۔ لیکن وہی بے غیرتی میرے سکون قلب اور عمل خیر کی تحریک کا ایک وسیلہ بن گئی ہے۔ ایک عورت کی زندگی تباہ کر کے آج میں صدہا بدنصیب کنواری لڑکیوں کی ناؤ پار لگانے کے قابل ہو گیا ہوں۔ اور یہ مجھے دیکھ کر بیحد مسرت ہوتی ہے۔ کہ یہی تحریک نیک سمن پر بھی اثر ڈال رہی ہے

ہیں نے اپنی کُٹی میں بیٹھے ہوئے۔ اُسے گنگا اشنان کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور اُس کے خلوص ارادت پر متحیر ہو گیا ہوں۔ اس کے چہرہ پر صفائی باطن کی روشنی نظر آتی ہے۔ وہ اگر پہلے خانہ داری میں ہوشیار تھی۔ تو اب وہ حسن باطن سے آراستہ ہے۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ وہ ایک دن طبقہ اناث کا زیور بنے گی +

کرشن چندر نے پہلے تو ان باتوں کو اس طرح سُنا۔ جیسے ہوشیار گاہک کسی سوداگر کی پُر اصرار خوش کلامیوں کو سُنتا ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں بھولتا۔ کہ سوداگر مجھسے اپنے مطلب کی باتیں کر رہا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ کرشن چندر پر اس تقریر کا اثر پڑنے لگا۔ انہیں محسوس ہونے لگا۔ کہ میں نے اپنی درشت کلامیوں سے اس شخص کا دل دکھایا ہے۔ جو اپنی حرکت پر نادم ہے۔ اور جس کے احسانوں کے بوجھ سے میں دبا ہُوا ہوں۔ میں کیسا احسان فراموش ہوں! یہ یاد کر کے انکی آنکھیں بھر آئیں۔ صاف دل آدمی موم کی بتّی کی طرح جتنی جلد سخت ہو جاتا ہے۔ اتنی ہی جلدی پگھل بھی جاتا ہے +

گجانند نے ان کے چہرے کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھ کر کہا "اس وقت اگر آپ ایک فقیر کے مہمان بن جائیں۔ تو کیسا ہو؟ صبح آپ جہاں کہیں گے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ اس کمل میں آپ کو جاڑا نہ لگے گا" +

کرشن چندر نے ملائمت سے کہا "کمل کی ضرورت نہیں۔ لیٹ رہوں گا" +

گجانند آپ سمجھتے ہیں کمل اوڑھنے سے آپ گنہگار ہو جائیں گے۔ لیکن یہ کمل میرا نہیں ہے۔ میں نے اسے مہمانوں ہی کے لئے رکھ چھوڑا ہے +

کرشن چندر نے زیادہ انکار نہ کیا۔ انہیں سردی لگ رہی تھی۔ کمل اوڑھ کر

لیٹے اور فوراً نیند آ گئی، لیکن سکون انگیز نیند نہیں۔ ان کے درد دل کا محض ایک مرقع تھی، انہوں نے خواب دیکھا۔ کہ میں جیل خانہ میں بستر مرگ پر پڑا ہوا ہوں اور جیل کا داروغہ میری طرف نگاہ نفرت سے دیکھ کر کہہ رہا ہے۔ تمہاری رہائی ابھی نہیں ہو سکتی، اتنے میں گنگا جلی اور میرے والد دونوں آکر چارپائی کے پاس کھڑے ہو گئے۔ اُن کے چہرے مسخ اور سیاہ تھے۔ گنگا جلی نے رو کر کہا۔ تمہارے ہی باعث میری یہ حالت ہو رہی ہے۔ والد نے غضبناک لہجہ میں کہا۔ کیا تمہاری روسیاہی ہماری زندگی کا انعام ہو گی؟ اسی لئے ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا؟ اب یہ سیاہی کبھی ہمارے چہرے سے دور نہ ہو گی۔ ہم ہمیشہ یہ عذاب جھیلتے رہیں گے۔ تو نے محض چار دن کی زندگی کے لئے ہمیں اس عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ پر ہم ابھی تیری زندگی کا خاتمہ کئے دیتے ہیں، یہ کہتے ہوئے وہ ایک کلہاڑا لئے ہوئے میری طرف جھپٹے ‌+

کرشن چندر کی آنکھیں کھُل گئیں۔ اُنکی چھاتی دھڑک رہی تھی۔ سوتے وقت وہ بھول گئے تھے۔ کہ میں گھر سے کس کام کو چلا تھا۔ اس خواب نے اسکی یاد دلادی۔ انہوں نے اپنے تئیں نفرین کی۔ انہیں یقین ہوا۔ کہ یہ محض خواب نہیں۔ صدائے غیب ہے۔ گجانند کی تالیف کا اثر رفتہ رفتہ اُن کے دل سے مٹنے لگا۔ سمن اب چاہے عصمت کی دیوی ہو جائے۔ پر اس سے وہ داغ سیاہ تو نہ مٹے گا۔ جو اُس نے ہمارے چہرے پر لگا دیا ہے۔ یہ مہاتما کہتے ہیں۔ گناہ سے انسان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ مجھے تو یہ بالکل انوکھی بات معلوم ہوتی ہے۔ میں نے بھی تو گناہ کئے ہیں۔ پر مجھے گناہ کی اس

مصلحانہ اثر کا کبھی احساس نہیں ہُوا۔ کچھ نہیں۔ یہ سب اُنکی لسّانی ہے۔ انہوں نے اپنی بے غیرتی کو چھپانے کے لئے یہ لفّاظی کی ہے۔ یہ بالکل لغو خیال ہے۔ گناہ سے گناہ ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر گناہ سے ثواب ہوتا۔ تو آج دُنیا میں کوئی گنہگار باقی نہ رہتا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ اُٹھ بیٹھے۔ گجانند بھی الاؤ کے قریب ہی پڑے ہوئے تھے۔ کرشن چندر چُپکے سے اُٹھے۔ اور گنگا کنارے چلے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ اب اس درد کا خاتمہ ہی کر کے چھوڑوں گا +

چاند غروب ہو چکا تھا۔ کُہرا اور بھی گھنا ہو گیا تھا۔ تاریکی نے کوہ و شجر اور ساحل و دریا میں کوئی تمیز نہ رکھی تھی۔ کرشن چندر ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ لیکن نگاہ کی بہ نسبت قیاس سے زیادہ کام لینا پڑتا تھا۔ سنگریزوں اور جھاڑیوں سے بچنے میں وہ ایسے محو تھے۔ کہ اپنی حالت کا دھیان نہ تھا +

کرا ہکے کنارے پر پہنچکر انہیں کچھ روشنی نظر آئی۔ وہ نیچے اُترے۔ گنگا کسی مریض کی طرح کُہرے کی چادر اُوڑھے کراہ رہی تھی۔ آس پاس کی تاریکی اور گنگا میں صرف روانی کا فرق تھا۔ یہ رواں تاریکی تھی۔ چاروں طرف ایسی اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ جو کسی کی وفات کے بعد گھر پر چھا جاتی ہے +

کرشن چندر ندی کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے سوچا ہائے! اب میری موت کتنی قریب ہے! ایک لمحہ میں یہ جان نہ جانے کہاں چلی

جائیگی! وہاں نہ جانے اسکی کیا گت ہوگی! آج دُنیا سے ناتا ٹوٹتا ہے! ایشور! اب مجھ پر رحم کرو۔ مجھے سنبھالو!

اس کے بعد ایک لمحہ تک انہوں نے اپنے دل کو خوب مستحکم کیا۔ انہیں یقین ہوگیا۔ کہ مجھے کسی قسم کا خوف نہیں ہے۔ وہ پانی میں گھُسے۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ کرشن چندر کا ایک ایک عضو شل ہوگیا۔ وہ اسکی پروا نہ کرکے آگے بڑھتے چلے گئے۔ گردن تک پانی میں پہنچ کر انہوں نے ایکبار پھر مسلط تاریکی پر نگاہ ڈالی۔ یہ رشتہ دُنیا کی آخری لڑی تھی۔ یہ استقلال کی خلوص غیرت کی آخری آزمائش تھی۔ اب تک انہوں نے جو کچھ کیا تھا۔ وہ محض اسی امتحان کی تیاری تھی۔ ارادہ اور ہوس کا یہ آخری معرکہ تھا۔ ہوس نے پوری طاقت سے انہیں اپنی طرف کھینچا۔ سُمن سنیاسنی بنی ہوئی روبرو آئی۔ شانتا حسرت وغم میں ڈوبی ہوئی سامنے آکھڑی ہوئی۔ ابھی کیا بگڑا ہے؟ کیوں نہ سادھو ہوجاؤں۔ میں ایسا کون بڑا نامور آدمی ہوں کہ دُنیا میرے نام اور ناموس کا چرچا کرے گی؟ ایسی نہ جانے کتنی لڑکیاں روز نفس کے پنجہ میں پھنسا کرتی ہیں۔ دُنیا کس کی پروا کرتی ہے۔ میں نادان ہوں۔ جو یہ سوچتا ہوں۔ کہ دُنیا میری ہنسی اُڑائیگی۔ ارادہ نے کتنا ہی زور لگایا۔ کہ اس دلیل کی تردید کرے۔ پر کامیاب نہ ہوئی۔ صرف ایک ڈبکی کی کسر تھی۔ زندگی اور موت میں صرف ایک قدم کا فاصلہ تھا! پیچھے کا قدم کتنا آسان تھا۔ کتنا زود عمل۔ آگے کا قدم کتنا مشکل تھا۔ کتنا خوفناک!

کرشن چندر نے پیچھے لوٹنے کو پیر اُٹھائے۔ ہوس نے اپنی قوت کا اعجاز

دکھا دیا۔ مگر فی الواقع یہ محبت دُنیا نہیں تھی۔ یہ خوف غائب تھا!

اس وقت کرشن چندر کو معلوم ہُوا۔ کہ اب میں پیچھے نہیں پھر سکتا۔ وہ آہستہ آہستہ خود بخود آگے کھسکتے جاتے تھے۔ وہ زور سے چیخ اُٹھے۔ اپنے ٹھٹھرے ہوئے پیروں کو پیچھے ہٹانے کی انتہائی کوشش کی۔ مگر نوشتۂ تقدیر! وہ آگے ہی کھسکتے گئے +

دفعتہً اُن کے کانوں میں گجانند کے پکارنے کی آواز آئی۔ کرشن چندر نے چلّا کر جواب دیا۔ لیکن مُنہ سے پوری بات بھی نہ نکلنے پائی تھی۔ کہ وہ ہوا سے بُجھکر تاریکی میں ڈوب جانے والے چراغ کی طرح لہروں میں غرق ہو گئے غیرت غم اور درد سے جلتے ہوئے دل کی آگ ٹھنڈے پانی میں بُجھ گئی +

گجانند نے صرف یہ الفاظ سُنے "میں یہاں ڈوبا جاتا ہوں" اور پھر لہروں کی سفاکانہ ہاؤ ہُو کے اور کچھ نہ سُنائی دیا +

گجانند دیر تک کنارے پر کھڑے رہے۔ وہی الفاظ چاروں طرف سے ان کے کانوں میں آتے تھے۔ پاس کی پہاڑیوں اور سامنے کی لہروں اور چاروں طرف چھائی ہوئی تاریکی سے انہیں الفاظ کی بازگشت صدائیں آ رہی تھیں +



علی الصباح امولا میں اس سانحہ کی خبر پھیل گئی۔ لیکن چند انے گنے آدمیوں کے سوا کوئی بھی اُمانا تھ سے تعزیت کرنے نہ آیا۔ اگر قدرتی موت ہوئی ہوتی۔ تو

غالباً اُن کے دشمن بھی آکر چار آنسو بہا جاتے۔ لیکن خودکشی ایک خوفناک شے ہے۔ اس موقعہ پر دوست بھی دشمن ہو گئے +

گجانند نے اُمانا تھ سے جسوقت یہ حال کہا۔ وہ کنوئیں پر نہا رہے تھے۔ انہیں ذرا بھی رنج یا حیرت نہ ہوئی۔ اس کے برعکس اُنہیں کرشن چندر پر غصہ آیا۔ پولیس کی مداخلت کے خوف نے غم کو پس پشت ڈالدیا۔ انہیں اُسدن اشنان دھیان میں بہت دیر لگی۔ طبع فکرمند کو اپنے حل پر غور کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔ اُسے احساس وقت نہیں رہتا +

جانہوی نے کہرام مچانا شروع کیا۔ اسے روتے دیکھ کر اُسکی دونوں بیٹیاں بھی رونے لگیں۔ ہمسایہ کی مستورات فرض تشفی ادا کرنے کے لئے جمع ہوئیں اُنہیں پولیس کا خوف نہ تھا۔ لیکن یہ شورماتم جلد ہی بند ہو گیا۔ کرشن چندر کے عیب ہنر کی تنقید ہونے لگی۔ اتفاق رائے نے فیصلہ کیا۔ کہ انکی خوبیوں کا پہلو نقائص پر غالب تھا۔ دوپہر کو جب اُمانا تھ گھر میں شربت پینے آئے۔ اور کرشن چندر کے متعلق چند ناسزاوار باتیں کیں۔ تو جانہوی نے اُنکی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "کیسی چھوٹی باتیں مُنہ سے نکالتے ہو"۔ اُمانا تھ شرمندہ ہو گئے +

جانہوی اپنے سرور قلب کا لطف تنہا اُٹھا رہی تھی۔ اس کیفیت کو وہ اتنا رکیک اور شرمناک سمجھتی تھی۔ کہ اُمانا تھ سے بھی اُسے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ سچا غم شاشا کے سوا، اور کسی کو نہ ہُوا۔ اگرچہ اپنے باپ کو وہ دوسرے کا دست نگر سمجھتی تھی۔ تاہم دُنیا میں اُسکی زندگی کا ایک سہارا موجود تھا۔ اپنے باپ کی خستہ حالی ہی اسکی پدر پرستی کا باعث تھی۔ اب وہ دُنیا میں یکہ

تنہا رہ گئی۔ لیکن اس صدمۂ یاس نے اُس کے نیک ارادوں کو مغلوب نہ کیا۔
اس کا دل اور بھی دردمند ہوگیا۔ آج سے شانتا تحمل اور ضبط کا مجسمہ بن گئی
برسات کی آخری بوندوں کی طرح انسان کی آخری نصیحتیں بیکار نہیں جاتیں
شانتا اب مُنہ سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکالتی۔ جس سے اُس کے باپ کی روح کو
تکلیف ہو۔ انکی زندگی میں وہ کبھی کبھی ان سے بے ادبی کر بیٹھتی تھی۔ لیکن اب
وہ انکی شان میں کسی خودغرضانہ خیال کو دل میں بھی نہ آنے دیتی۔ اُسے یقین
تھا۔ کہ قیدِ عناصر سے آزاد ہوکر روح کو ظاہر و باطن کا یکساں علم ہوجاتا ہے۔
اگرچہ اب وہ جاہنوی کو خوش رکھنے کے لئے کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھتی تھی لیکن
جاہنوی دن میں دو چار مرتبہ ضرور ہی اُس کے زخم کو تازہ کر دیا کرتی۔ شانتا
کو غصہ آتا۔ پر وہ زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ تنہائی میں بھی نہ روتی تھی۔ اُسے
خوف ہوتا۔ کہ والد مرحوم کو میرے گریہ وزاری سے ملال ہوگا۔ ہولی کے دن
اُما ناتھ اپنی دونوں لڑکیوں کے لئے اچھی اچھی ساڑیاں لائے۔ جاہنوی نے
بھی اپنے ریشمی ساڑی نکالی۔ لیکن شانتا کو اپنی پُرانی دھوتی ہی پہننی پڑی
اُس کا دل غم سے پارہ پارہ ہوگیا۔ اس کے چہرے پر ذرا بھی شکن نہ آیا۔ دونو
بہنیں مُنہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ کہ ساڑیوں میں فیتے نہیں لگوائے گئے۔ اور
شانتا خوش خوش گھر کے کام دھندے کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ جاہنوی کو
بھی اُس پر رحم آگیا۔ اُس نے اپنی ایک پُرانی لیکن ریشمی ساڑی نکال کر
شانتا کو دیدی۔ شانتا نے ذرا بھی انکار نہ کیا۔ اُسے پہن کر پھر پکوان بنانے
میں مصروف ہوگئی۔

ایک دن شانتا اما ناتھ کی دھوتی دھونا بھول گئی۔ دوسرے دن علی الصباح اُما ناتھ نہانے چلے تو دھوتی گیلی پڑی تھی۔ وہ تو کچھ نہ بولے۔ لیکن جانھوی نے شانتا کو اتنا کوسا کہ وہ رو پڑی، روتی تھی۔ اور دھوتی چھانٹتی تھی۔ اما ناتھ کو یہ دیکھ کر رنج ہوا۔ انہوں نے دل میں سوچا۔ ہم محض پیٹ کی روٹیوں کے لئے ایک یتیم کو اس قدر ستاتے ہیں۔ ایشور کے یہاں کیا جواب دیں گے۔ جانھوی سے تو انہوں نے کچھ نہ کہا۔ پر دل میں فیصلہ کیا۔ کہ بہت جلد ان یتیم آزاریوں کا خاتمہ کرنا چاہیئے۔ مراسم دفات سے فارغ ہو کر آجکل اما ناتھ پنڈت مدن سنگھ پہ قانونی چارہ جوئی کرنے کی فکر میں منہمک تھے۔ وکیلوں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ ضرور تمہاری فتح ہوگی۔ پانچہزار روپے ہاتھ آجانے کی امید نے اما ناتھ کے دل میں بڑے بڑے منصوبے پیدا کر دیئے تھے۔ وہ اس سرور میں مست ہو جایا کرتے تھے۔ نئے مکان کا خاکہ تیار ہو گیا تھا۔ اس کے لئے موقعہ کی زمین کی تلاش بھی شروع ہو گئی تھی۔ ان مسرتناک ارادوں میں انہیں شانتا کی فکر بھی نہ رہی تھی۔ آج جانھوی کی سخت کلامیوں نے انہیں شانتا کی دردسی کی جانب مائل کیا۔ گجانند کے دیئے ہوئے ایک ہزار روپے جو انہوں نے مقدمہ کے مصارف کے لئے الگ رکھ دیئے تھے۔ گھر میں موجود تھے۔ ایک دن انہوں نے جانھوی سے شانتا کی شادی کے متعلق کچھ گفتگو کی۔ شانتا نے یہ باتیں سن لیں۔ استغاثہ کے چرچے سنکر بھی اُسے رنج ہوتا تھا۔ پر وہ اس میں دخل دینا حد درجہ نامناسب سمجھتی تھی۔ لیکن شادی کا ذکر سنکر وہ خاموش نہ رہ سکی۔ ایک پُرزور تحریک باطن نے اس کے شرم اور حجاب کو دور کر دیا۔ جونہی اما ناتھ باہر چلے گئے۔ وہ جانھوی

کے پاس جاکر بولی۔ "ابھی ماموں تم سے کیا کہہ رہے تھے ؟

جاھنوی نے بیدلی سے کہا۔ "کہہ کیا رہے تھے۔ اپنا دکھ رو رہے تھے۔ اچھا گنی سمن نے یہ سب کچھ کیا۔ ورنہ کئے ہوئے کو پھر کیوں کرنا پڑتا۔ اب نہ اچھا خاندان ہی ملتا ہے۔ اور نہ اتنا اچھا بَر۔ تھوڑی دور پر ایک گاؤں ہے۔ وہیں ایک بَر دیکھنے گئے تھے" +

شانتا نے زمین کی طرف تلکتے ہوئے جواب دیا۔ "کیا میں تم لوگوں کو اتنی بھاری ہوگئی ہوں۔ کہ مجھے پھینکنے کی پڑی ہوئی ہے ؟ آپ ماموں سے کہہ دیجئے۔ کہ وہ میرے لئے کوئی تردّد نہ کریں" +

جاھنوی۔ تم انکی پیاری بھانجی ہو۔ اُن سے تمہاری مصیبت نہیں سہی جاتی۔ میں نے بھی تو یہی کہا تھا۔ کہ ابھی رہنے دو۔ جب مقدمہ کے روپے ہاتھ آجائیں تو اطمینان سے شادی کرنا۔ وہ میری مانیں تب تو!

شانتا۔ مجھے وہیں کیوں نہیں پہنچا دیتے ؟

شانتا نے استعجاب سے پوچھا۔ "کہاں ؟"

شانتا نے سادگی سے جواب دیا۔ "چاہے چُنار۔ چاہے کاشی" +

جاھنوی۔ کیسی پگلوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہوسکتا۔ تو رونا کاہیکا تھا۔ ان لوگوں کو تجھے گھر میں رکھنا ہوتا تو یہ اندھیر کیوں مچاتے ؟

شانتا۔ بہو بناکر نہ رکھیں گے۔ لونڈی بناکر تو رکھیں گے +

جاھنوی نے بیدردی سے کہا۔ "تو چلی جاؤ روکتا کون ہے ؟ تمہارے ماموں سے یہ کبھی نہ ہوگا۔ کہ وہ تمہیں سر چڑھاکر لے جائیں۔ اور پھر اپنی بدنامی کراکے

واپس لائیں۔ وہ تو ان لوگوں کا سر کچل کر ان سے اپنے تاوان کے روپے وصول کریں گے ۔

شانتا۔ ماں وہ لوگ چاہے کیسے مغرور ہوں لیکن میں اُن کے دروازہ پر جا کر کھڑی ہو جاؤنگی۔ تو انہیں مجھ پر رحم آ ہی جائے گا۔ مجھے یقین ہے۔ کہ وہ مجھے اپنے دروازہ سے دُتکار نہ دیں گے۔ اپنا دشمن بھی دروازہ پر آ جائے۔ تو اُسے بھگاتے لحاظ ہوتا ہے۔ میں تو پھر بھی . . . . . ''

جانھوی کو اب صبر کی تاب نہ رہی۔ یہ بیشرمی اس سے نہ برداشت ہوئی۔ بات کاٹ کر بولی ''چُپ بھی رہ۔ شرم و حیا تو تجھے جیسے چھو نہیں گئی۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ جو اپنی بات نہ پوچھے۔ وہ چاہے دھنا سیٹھ ہی ہو۔ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھوں۔ اب تو وہ لوگ یہاں آ کر ناک بھی گھسیں تو میں انہیں دور ہی سے بھگا دوں''۔

شانتا خاموش ہو گئی۔ دُنیا چاہے جو کچھ سمجھتی ہو۔ لیکن وہ اپنے کو بیاہتا ہی سمجھتی تھی۔ ایک منسوبہ لڑکی کا دوسرے گھر بیاہ ہو۔ یہ اُسے انتہا درجہ شرمناک اور نفرت انگیز معلوم ہوتا تھا۔ بارات آنے کے ایک ماہ قبل ہی سے وہ سدن کے اوصاف سُن سُن کر اُس کے ہاتھوں بک چکی تھی۔ اس نے اپنے دروازہ پر دوار پوجا کے وقت سدن کو اُسی نگاہ سے دیکھا تھا۔ جیسے کوئی عورت اپنے شوہر کو دیکھتی ہے۔ اس طرح نہیں گویا وہ کوئی بیگانہ آدمی ہے اب کسی دوسرے مرد کا خیال اس کے شیشۂ عصمت پر پتھر کی طرح لگتا تھا۔ وہ اتنے دنوں تک سدن کو اپنا شوہر سمجھنے کے بعد اب اُسے دل سے نکال نہ

سکتی تھی، دھرم کی زنجیر کو توڑ نہ سکتی تھی، سدن اب اُس کا شوہر تھا۔ چاہے اُسے قبول کرے یا نہ کرے۔ چاہے اُسکی بات پوچھے یا نہ پوچھے۔ اگر دوار پوجا کے بعد ہی سدن اس کے سامنے آتا تو وہ اس سے اسی طرح ملاقات کرتی۔ گویا وہ اس کا شوہر ہے۔ شادی رسوم کا طومار نہیں۔ محض دل کی ایک کیفیت ہے +

شانتا کو ابھی تک یہ اُمید تھی۔ کہ کبھی نہ کبھی میں ضرور اپنے سُسرال جاؤنگی لیکن آج اپنی شادی یا ازدواج ثانی کا ذکر سُنکر اُس کا دل پُردرد کانپ اُٹھا۔ اُس نے شرم اور حیا چھوڑ دی۔ اور جاہنوی سے منت کی کہ مجھے سُسرال بھجوا دو + اتنا ہی اس کے امکان میں تھا۔ اس کے سوا وہ اور کیا کرتی۔ لیکن جاہنوی کی بیرحمانہ گفتگو سُنکر اس کا صبر ہاتھ سے جاتا رہا۔ دل کا اضطراب بڑھنے لگا رات کو جب سب لوگ سو گئے۔ تو اُس نے پنڈت پدم سنگھ کے نام ایک خط لکھنا شروع کیا۔ یہ اُسکی آخری تدبیر تھی۔ اس کے ناکام ہونے پر اس نے اپنے طرز عمل کا فیصلہ کر لیا تھا۔ خط جلد تمام ہو گیا۔ مضمون پہلے ہی سے ذہن میں موجود تھا۔ صرف لکھنے کی دیر تھی +

"میرے قابل تعظیم دھرم پتا۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں مجھ پر رحم کیجئے۔ یہاں کی حالت کیا لکھوں۔ پتاجی گنگا میں ڈوب گئے۔ آپ لوگوں پر مقدمہ چلانے کی صلاح ہو رہی ہے۔ میری دوبارہ شادی ہونی قرار پائی ہے، جلد خبر لیجئے ایک ہفتہ تک آپکی راہ دیکھوں گی۔ اس کے بعد اس بیکس یتیم کی فریاد آپ کے کانوں تک نہ پہنچے گی +

(۱۸)

پدم سنگھ کا پہلا بیاہ اس وقت ہُوا تھا۔ جب وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ اور ایف اے پاس ہوئے تو وہ ایک بیٹے کے باپ تھے۔ پر بیوی ناتجربہ کار تھی۔ بچے کی پرورش کرنا نہ جانتی تھی۔ پیدائش کے وقت تو لڑکا توانا و تندرست تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ دُبلا ہونے لگا۔ اور چھٹے مہینے میں ماں اور بیٹا دونوں دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ پدم سنگھ نے ارادہ کیا۔ کہ اب شادی نہ کروں گا۔ مگر وکالت پاس کر چکنے پر اُنہیں پھر مجبوراً شادی کرنی پڑی۔ سُبھدرا بھو بنکر آئی۔ اسے آج سات برس ہو گئے ۔

پہلے دو تین سال تک تو پدم سنگھ کو اولاد کی کوئی فکر ہی نہ ہوئی۔ اگر بھاما کبھی اس کا ذکر کرتی تو وہ ٹال جاتے تھے۔ کہتے مجھے اولاد کی ہوس نہیں مجھ سے یہ بوجھ نہ سنبھلے گا۔ ابھی تک انہیں اولاد کی اُمید تھی۔ اس لئے بے صبر نہ ہوتے تھے۔ لیکن جب چوتھا سال بھی یونہی کٹ گیا۔ تو انہیں کچھ کچھ مایوسی ہونے لگی۔ فکر ہُوا کیا فی الواقع میں لاولد ہی رہوں گا؟ جوں جوں دن گزرتے تھے۔ یہ فکر بڑھتی جاتی تھی۔ اب انہیں اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ سبھدرا سے وہ محبت نہ رہی۔ سبھدرا تاڑ گئی۔ اُسے صدمہ تو ہُوا بعد اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کر صبر کیا ۔

پدم سنگھ اپنے تئیں بہت سمجھاتے کہ تمہیں اولاد لے کر کیا کرنا ہے۔ روز ولادت سے پچیس سال تک اُسے جلاؤ۔ کھلاؤ۔ پڑھاؤ۔ لکھاؤ۔ اس پر

بھی یہ اندیشہ لگا ہی رہتا ہے۔ کہ یہ کسی ڈھنگ کا ہو گا بھی یا نہیں۔ کہیں لڑکا مر گیا۔ تو اس کے نام کو بیٹھ کر روؤ۔ اور جو کہیں خود ہی مر گئے۔ تب تو غریب لڑکے کی زندگی ہی تباہ ہو گئی۔ ہمیں ایسی نعمت کی ضرورت نہیں لیکن اِن خیالات سے دلکو تشفی نہ ہوتی تھی۔ وہ سبھدرا سے اپنا درد دل چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اُسے معذور سمجھ کر حسب سابق اس کے ساتھ محبت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب دل پر یاس کی تاریکی چھائی ہوئی ہو۔ تو چہرہ پر مسرت کی روشنی کہاں سے آئے۔ موٹی نگاہ کا آدمی بھی کہہ سکتا تھا۔ کہ میاں بیوی کے درمیان کشیدگی ضرور ہے۔ خیریت یہی تھی۔ کہ سبھدرا اپنے شوہر کی محبت اور دلجوئی میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑتی تھی۔ وہ اپنی دلجوئیوں سے اولاد کی تمنا کو مٹانا چاہتی تھی۔ مگر اس امر دشوار میں وہ اس شخص سے زیادہ کامیاب نہ ہوتی تھی۔ جو مریض کو گیتوں سے اچھا کرنا چاہتا ہو۔ خانہ داری کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اُسے ہمیشہ دبنا پڑتا تھا۔ اور جب سے سدن یہاں رہنے لگا تھا۔ کتنی ہی بار سدن کے پیچھے اُسے جھڑکیاں سننی پڑی تھیں۔ عورت اپنے شوہر کے ہاتھ سے بھالے کا زخم بھی برداشت کر سکتی ہے۔ لیکن کسی دوسرے شخص کے پیچھے گر شوہر اُسے تیز نگاہ بھی سے دیکھے تو اسے برداشت نہیں ہوتی۔ سدن سبھدرا کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔

آخر کل ہی وہ ابل ہی پڑی۔ گرمی شدت کی تھی۔ مسرائن کسی وجہ سے نہ آئی تھی۔ سبھدرا کو رسوئیں بنانا پڑی۔ اُس نے پدم سنگھ کے لئے باریک پھلکیاں بنائیں لیکن گرمی سے بیتاب تھی۔ چولھے کے سامنے بیٹھا نہ جاتا تھا۔ سدن

کے لئے موٹی موٹی روٹیاں پکا دیں، پدم سنگھ کھانا کھانے بیٹھے۔ تو سدن کی تھالی میں موٹی روٹیاں نظر آئیں۔ غصّہ کے مارے انہوں نے اپنی پھلکیاں اسکی تھالی میں رکھ دیں۔ اور اُسکی روٹیاں اپنی تھالی میں ڈال لیں۔ سبھدرا نے جل کر کچھ طنز آمیز باتیں کیں۔ پدم سنگھ نے انکا ویسا ہی جواب دیا۔ پھر جواب الجواب کی نوبت آئی۔ یہانتک کہ وہ جھلا کر اُٹھ آئے۔ کھانا نہیں کھایا۔ سبھدرا نے بھی مناون نہیں کیا۔ اُس نے رسوئیں اُٹھا دی اور جاکر لیٹ رہی۔ تب سے پورا ایک دن گزر گیا۔ مگر دو میں سے ایک کا بھی غصّہ فرو نہیں ہُوا۔ مسرائن نے آج کھانا پکایا۔ پر نہ پدم سنگھ نے کھایا۔ اور نہ سبھدرا نے۔ سدن باری باری سے دونوں کی خوشامد کر رہا تھا۔ ایک طرف سے جواب پاتا۔ "ابھی بھوک نہیں ہے"۔ اور دوسری طرف سے جواب ملتا کھالونگی۔ یہ تھوڑے ہی چھوٹے گا۔ یہی چھوٹ جاتا۔ تو کیوں کسی کی دھونس سہنی پڑتی۔ تعجب یہ تھا۔ کہ سبھدرا سدن سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھی۔ حالاں کہ وہی کل کی بدمزگیوں کا خاص باعث تھا۔ سدن خوب جانتا ہے۔ کہ ٹٹی کی آڑ سے آنیوالا تیر دراصل صیاد کا شوق شکار یا تماشائے گوشت ہے۔

تیسرا پہر ہو گیا تھا۔ پدم سنگھ سو کر اُٹھے تھے۔ اور جمائیاں لے رہے تھے۔ ان کے دل میں سبھدرا کی جانب سے ایک غبار بھرا ہُوا تھا۔ اسی اثنا میں ڈاکیے نے ایک بیرنگ خط لاکر انہیں دیا۔ انہوں نے ڈاکیہ کی طرف ترش نگاہوں سے دیکھا۔ گویا بیرنگ چٹھی لاکر اُس نے کوئی خطا

کی ہے۔ پہلے تو ان کے جی میں آیا۔ کہ اسے واپس کر دیں۔ کسی مفلس موکل نے اس میں اپنی مصیبت کی کتھا گائی ہوگی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر چٹھی لے لی۔ اور اُسے پڑھنے لگے۔ یہ شانتا کا خط تھا۔ اُسے ایکبار پڑھ کر میز پر رکھ دیا۔ ایک لمحہ کے بعد اُسے پھر پڑھا۔ اور تب کمرہ میں ٹہلنے لگے۔ اسوقت اگر مدن سنگھ وہاں موجود ہوتے۔ تو وہ انہیں یہ خط دکھاتے اور کہتے۔ یہ آپ کے خوف رسوائی کا۔ آپ کے خاندانی وجاہت کے غرور کا نتیجہ ہے۔ آپ نے ایک انسان کا خون کیا ہے۔ اور وہ خون آپ کی گردن پر ہے۔ اُما ناتھ کے استغاثہ کا ذکر پڑھ کر پدم سنگھ کو گونہ مسرت ہوئی۔ بہت اچھا ہو۔ کہ یہ استغاثہ دائر ہو جائے۔ اور ان حضرت کا غرور نجابت خاک میں مل جائے۔ اُما ناتھ کی ڈگری ضرور ہی ہوگی تب بھائی صاحب کو معلوم ہوگا۔ کہ یہ تماشا کتنا مہنگا پڑا۔ افسوس! اس غریب لڑکی کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ پدم سنگھ نے پھر اُس خط کو پڑھا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے حُسن عقیدت ٹپکا پڑتا تھا۔ شانتا نے انہیں "دھرم پتا" لکھا تھا۔ یہ ایک لفظ انکے دل پر جادو کا سا عمل کر رہا تھا۔ اُس نے اُن کے جذبۂ انصاف کو متحرک اور ان کے دل کے تار ہائے محبت کو مرتعش کر دیا۔ فوراً کپڑے پہنے اور بٹھل داس کے مکان پر جا پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا۔ کہ وہ کنور انرودھ سنگھ کے یہاں گئے ہوئے ہیں۔ فوراً بائسکل ادھر پھیر دی۔ وہ شانتا کے متعلق اسی وقت کچھ نہ کچھ فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں خوف تھا۔ کہیں تاخیر اس جوش کو ٹھنڈا نہ کر دے۔

کنور صاحب کے یہاں آج گوالیر کا ایک جل ترنگیا آیا ہوا تھا۔ اس کا گانا سننے اور اس کا کمال دیکھنے کے لئے انہوں نے اپنے احباب کو مدعو کیا تھا۔ پدم سنگھ وہاں پہنچے تو دیکھا۔ کہ بابو بیٹھل داس اور پروفیسر رمیش دت کے درمیان ایک سرگرم مناظرہ ہو رہا ہے۔ اور کنور صاحب۔ پنڈت پربھاکر راؤ اور سید تیغ علی بیٹھے ہوئے اس مناظرہ کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ گویا بٹیروں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ پدم سنگھ کو دیکھتے ہی کنور صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور کہا۔ "آئیے آئیے۔ یہاں خونریز جنگ ہو رہی ہے۔ کسی طرح انہیں الگ کیجئے۔ نہیں تو دونوں لڑتے لڑتے مرجائیں گے"۔

اتنے میں پروفیسر دت بولے "تھیا صوفسٹ ہونا کوئی گالی نہیں ہے۔ میں تھیا صوفسٹ ہوں۔ اور اسے ساری دنیا جانتی ہے۔ یہ ہماری ہی سوسائٹی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کہ آج امریکہ۔ جرمنی۔ روس وغیرہ ملکوں میں آپ کے رام اور کرشن کے معتقد اور گیتا۔ اپنشد وغیرہ مقدس کتابوں کے شائق نظر آنے لگے ہیں۔ ہماری سوسائٹی نے ہندو قوم کا رتبہ بڑھا دیا ہے۔ اس کے دائرہ اثر کو وسیع کر دیا ہے۔ اور اسے اس مسند اعزاز پر بٹھا دیا ہے۔ جسے وہ اپنی آرام طلبی اور جمود کے باعث صدیوں سے چھوڑے بیٹھی تھی۔ یہ ہندو قوم کی احسان فراموشی ہوگی۔ اگر وہ ان لوگوں کی منت گذار نہ ہو۔ جنہوں نے اپنی شمعوں سے اسے بصارت عطا کی ہے۔ یہ شمع چاہے میڈم بلیوٹسکی نے روشن کی ہو۔ چاہے کرنل الکٹ نے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ ہمیں جن لوگوں کی ذات سے فیض پہنچا ہے۔ ان کا مشکور ہونا ہمارا فرض ہے۔ اگر

آپ اسے روحانی غلامی کہتے ہیں۔ تو آپ کی صریح بے انصافی ہے +

بٹھل داس نے اس تقریر کو ایسی لاپرواہی سے سُنا۔ گویا یہ کوئی مہمل بکواس ہے۔ اور بولے۔ جسے آپ احسان گزاری کہتے ہیں۔ اسی کو میں روحانی غلامی کہتا ہوں۔ بلکہ غلام تو ایک طرح سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کا جسم چاہے جکڑا ہُوا ہو۔ لیکن اسکی روح آزاد ہوتی ہے۔ آپ لوگوں نے تو اپنی روحانی آزادی ہی کو بیچ دیا ہے۔ آپ کی انگریزی تعلیم نے آپ کو اتنا پست ہمت بنا دیا ہے۔ آپ اپنے روحانی اور مذہبی اعتقادات میں بھی یورپین علما کے فیصلے کے منتظر رہتے ہیں۔ آپ اُپنشدوں کی عزت اس لئے نہیں کرتے ہیں۔ کہ وہ بجائے خود عزت کے قابل ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ہیوٹسکی اور میکسمولر نے انکی تعریف کی ہے۔ آپ کے مذہبی رسوم و رواج سب بے معنی تھے۔ لیکن اب جو اہل مغرب نے ان کے اوصاف ظاہر کئے۔ تو آپ کو ان میں سرتا پا خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ آپ لوگوں میں اپنے عقل اور تمیز سے کام لینے کی طاقت سلب ہو گئی ہے۔ ابھی چند سال قبل تک آپ یہاں کے تانترک وِدیا کی بات بھی نہ پوچھتے تھے۔ یورپین علما نے جب انکے معنی کا انکشاف کرنا شروع کیا۔ تو آپ جھاڑ پھونک۔ ٹونے ٹوٹکے کے قائل ہو گئے ہیں۔ یہ ذہنی متابعت جسمانی انقیاد سے کہیں زیادہ حقیر ہے۔ آپ اپنشدوں کو انگریزی میں پڑھتے ہیں۔ اور گیتا کو جرمن میں۔ آپ ارجن کو ارجنا کہتے ہیں۔ کرشن کو کرشنا۔ رام کو راما۔ یہ آپ کی زبادانی ہے۔ آپ نے اسی ذہنی غلامی کے باعث اس مملکت میں بھی اطاعت قبول کر لی۔ جہاں ہم اپنے بزرگوں کے علم اور کمال

کی بدولت قیامت تک اپنی سربلندی کے پھریرے اُڑا سکتے تھے"۔

رمیش دت کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ اِس کا کچھ جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ کنور صاحب بول اٹھے!" یارو! اب مجھ سے بولے بغیر نہیں رہا جاتا۔ بابو بٹھل داس آپ اپنے اس "غلامی" کے الزام کو واپس لیجئے"۔

بٹھل داس۔ کیوں واپس لوں؟

کنور صاحب۔ آپ کو یہ الزام دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

بٹھل داس۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھتا۔

کنور صاحب۔ میرا مطلب یہ ہے۔ کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی دوسرے شخص کو غلام کہنے کا حق نہیں رکھتا۔ اندھوں کی بستی میں کون کسی کو اندھا کہے گا۔ ہم سب کے سب امیر ہوں یا غریب۔ راجہ ہوں یا فقیر غلام ہیں۔ ہم اگر جاہل مفلس گنوار ہیں۔ تو تھوڑے غلام ہیں۔ ہم اپنے رام کا نام لیتے ہیں۔ اپنی دھوتی پگڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ اپنی بولی بولتے ہیں۔ اپنی گائے پالتے ہیں۔ اور اپنی پاک گنگا میں نہاتے ہیں۔ اور اگر ہم تعلیم یافتہ صاحب ثروت اور بیدار مغز ہیں۔ تو بہت غلام ہیں۔ کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ بدیسی زبان بولتے ہیں۔ کُتے پالتے ہیں۔ ٹب میں نہاتے ہیں۔ اور اپنے بھائیوں کو حقیر سمجھتے ہیں، ہماری ساری قوم انہیں دو جماعتوں میں منقسم ہے۔ اس لئے کوئی کسی کو غلام نہیں کہہ سکتا۔ غلامی کو مختلف صورتوں میں تقسیم کرنا خیال باطل ہے۔ غلامی صرف روح سے تعلق رکھتی ہے۔ اُسکی دوسری صورتیں اسی میں مشتمل ہیں۔ موٹر۔ بنگلے۔ پولو اور پیانو یہ سب لوہے کی ایک بیڑیاں ہیں جس

نے ان بیڑیوں کو نہیں پہنتا۔ انہیں کو سچی آزادی کا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ وہ کون لوگ ہیں۔ جو اپنے پسینہ کی کمائی کھاتے ہیں۔ اپنا قومی لباس۔ قومی زبان اور قومی معاشرت کے دلدادہ ہیں۔ اور اپنی معاشرت کے لئے کسی غیر کے محتاج نہیں۔ ہم جو مہذب اور روشن خیال ہیں۔ لوہے کی بیڑیاں پہن کر اپنی روحانی آزادی کو ہاتھ سے کھو کر کسانوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ انہیں قابل رحم سمجھتے ہیں۔ مگر دراصل قابل رحم ہم ہیں۔ جو اپنی روٹیوں کے لئے بھی دوسروں کے دست کرم کے محتاج ہیں۔ یہ ہم ہی ہیں۔ جو بنگلوں پر جبیں سائیاں کرتے ہیں۔ خانساموں کے ناز اٹھاتے ہیں۔ پھولوں کی ڈالیاں لئے لئے در بدر گھومتے ہیں۔ کسانوں کو بھی کسی نے یہ بیہودہ حرکتیں کرتے دیکھا ہے؟ ہم پالتو کتے ہیں۔ جو جنگل کے آزاد جانوروں کا شکار کرتے پھرتے ہیں۔ ہمارے لئے اس سے بہتر کوئی تشبیہ نہیں ہو سکتی۔

پربھاکر راؤ نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کو کسان بن جانا چاہئے؟"

کنور صاحب۔ کسان بن جاؤں تو اپنے پہلے جنم کی سزائیں کیونکر جھیلوں گا۔ بڑے دن میں میوے کی ڈالیاں کیسے لگاؤں گا۔ سلامی کے لئے خانساموں کی خوشامدیں کیسے کروں گا۔ خطابوں کے لئے نینی تال کی زیارت کیونکر کروں گا۔ ڈنر پارٹی دیکر لیڈیوں کے کتوں کو کیونکر گود میں اٹھاؤں گا۔ اپنے آقاؤں کو خوش رکھنے کے لئے قومی بہبود کی تجاویز کی مخالفت کیونکر کروں گا۔ یہ سب انسانی پستی کے آخری درجے ہیں۔ اس منزل کو طے کئے بغیر ہماری نجات نہیں ہو سکتی۔ (پدم سنگھ سے) کہئے شرما جی۔ آپ کی تجویز بورڈ میں کب آئیگی؟

آپ آجکل کچھ افسردہ خاطر نظر آتے ہیں۔ کیا اس تجویز کا بھی وہی حشر ہوگا۔ جو ہماری بیشتر قومی تحریکوں کا ہُوا کرتا ہے؟

ادھر کچھ دنوں سے فی الواقع پدم سنگھ بے دل سے ہو رہے تھے۔ جوں جوں تجویز کے پیش ہونے کا زمانہ قریب آتا تھا۔ ان کا اعتماد کمزور ہوتا جاتا تھا۔ انہیں اب یہ تجویز کچھ بے سود معلوم ہوتی تھی۔ بے سود ہی نہیں۔ کبھی کبھی انہیں اس سے فایدہ کے بجائے نقصان ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ لیکن وہ اپنے شکوک کو کسی پر ظاہر کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ کنور صاحب کی طرف نگاہ اعتماد سے دیکھ کر بولے "جی نہیں۔ یہ بات تو نہیں ہے۔ ہاں اندنوں ذرا فرصت کم تھی۔ اس وجہ سے اتنی سرگرمی سے کام نہ ہو سکا"۔

کنور صاحب۔ تجویز کی کامیابی میں تو اب کوئی رُکاوٹ نہیں ہے؟

پدم سنگھ نے تیغ علی کی طرف دیکھ کر کہا "مسلمان ممبروں کا بھروسہ ہے"۔

تیغ علی نے عارفانہ انداز سے کہا "ان پر اعتماد کرنا ریت پر دیوار بنانی ہے۔ آپ کو معلوم نہیں۔ ادھر کیا ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں۔ عجب نہیں کہ وہ حضرات آپ کو عین وقت پر دھوکا دیں"۔

پدم سنگھ۔ مجھے ان سے ایسی اُمید نہیں ہے۔

تیغ علی۔ یہ آپ کی شرافت ہے۔ وہاں اسوقت اُردو ہندی کا قضیہ درپیش ہے۔ گاؤکشی۔ جداگانہ انتخاب۔ سود کا مجوزہ قانون۔ ان سبھی مسائل سے مذہبی تعصبات کو برانگیختہ کرنیکی کوشش کیجارہی ہے۔

پربھاکر راؤ۔ کیا سیٹھ بل بھدر داس تشریف نہ لائیں گے۔ کسی طرح انہیں اپنی طرف کھینچنا چاہئے ✦

کنور صاحب۔ میں نے انہیں دعوت ہی نہیں دی۔ کیونکہ میں جانتا تھا۔ کہ وہ نہ آئیں گے۔ وہ اختلاف رائے کو جانی دشمنی خیال کرتے ہیں ✦ ہمارے لیڈروں کی بالعموم یہی حالت ہے۔ یہی ایک امر ہے جس میں انکی زندہ دلی ظاہر ہوتی ہے۔ آپ نے اُن سے ذرا بھی اختلاف کیا۔ اور وہ آپ کی جان کے گاہک ہوگئے۔ آپ سے بولنا تو دور رہا۔ آپکی صورت سے گریز کریں گے۔ بلکہ موقع پائیں گے۔ تو حکام سے آپکی شکایت کریں گے۔ اپنے جوار حیین میں آپ کے طور وطریق۔ عادات و اطوار کا مضحکہ اُڑائیں گے۔ آپ برہمن ہیں۔ تو آپ کو بھکھاری کہیں گے۔ آپ چھتری ہیں۔ تو اجڈ گنوار کا لقب عطا کریں گے۔ آپ ویش ہیں تو آپکو بقال اور ڈنڈی نول کا خطاب ملے گا۔ اور اگر آپ شودر ہیں تب تو آپ بنے بنائے چانڈال ہیں۔ آپ کو اگر گانے کا شوق ہے۔ تو آپ عیاش ہیں۔ آپ کو مذہبی معاملات سے اُنس ہے۔ تو آپ پاکھنڈی اور پوپ ہیں۔ یہانتک کہ آپ کی مستورات پر بھی کیچڑ پھینکنے کی کوشش کی جائیگی۔ ہمارے یہاں اختلاف رائے بدترین گناہ ہے۔ اور اس کا کوئی کفارہ نہیں ✦ اہا وہ دیکھئے ڈاکٹر شیاما چرن کا موٹر آگیا ✦

ڈاکٹر صاحب موٹر سے اُترے۔ اور حاضرین کی طرف مربیانہ انداز سے دیکھتے بولے۔" I am sorry I was so late

کنور صاحب نے انکی تعظیم کی۔ اور لوگوں نے بھی ہاتھ ملائے۔ اور ڈاکٹر صاحب

ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

When is the performance to begin

گنور صاحب نے کہا۔"ڈاکٹر صاحب آپ بھولتے ہیں۔ یہ کالے آدمیونکی مجلس ہے"+

ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر کہا۔ معاف کیجئے۔ مجھے یاد نہ رہا۔ کہ یہاں ملیچھوں کی زبان میں گفتگو کرنا منع ہے+

کنور صاحب۔ لیکن دیوتاؤں کی مجلس میں تو آپ سے شاید کبھی ایسی غلطی نہ ہوتی ہو+

ڈاکٹر۔ تو مہاراج اس گناہ کا پرائشچت کرا لیجئے+

کنور صاحب۔ اس کا پرائشچت ہے۔ کہ آپ ہم جیسے گنواروں سے مادری زبان میں باتیں کیا کیجئے+

ڈاکٹر۔ آپ راجہ صاحب ہیں۔ آپ سے یہ عہد پورا ہو سکتا ہے۔ ہمارا انگریزی زبان سے شب و روز کا واسطہ ہے۔ ہم اس عہد کو نہیں نبھا سکتے۔ اور پھر آپ جانتے ہیں۔ کہ یہی زبان آج اس ملک کی Lingues Franca ہے

کنور صاحب۔ آپ ہی جیسے معزز اصحاب نے تو اُسے یہ رتبہ دے رکھا ہے فارس اور کابل کے کندۂ ناتراش فوجیوں اور ہندو سوداگروں کے میل جول سے اُردو جیسی زبان وجود میں آگئی۔ اگر ہمارے مختلف صوبہ جات کے اہل علم باہمی تعلقات میں اپنی ہی زبان پر تکیہ کرنے پر مجبور ہوتے۔ تو ابتک یہاں قومی زبان پیدا ہو جاتی۔ جب تک ہمارا اصحاب علم طبقہ انگریزی زبان کا شیدا

بنا رہے گا۔ کسی قومی زبان کا ایجاد ہونا محال ہے۔ مگر یہ ایک وقت طلب امر ہے۔ اس میں کون جان کھپائے۔ یہاں تو انگریزی جیسی مکمل زبان مل گئی۔ بس لوگ اُسی کے ہو رہے۔ اب چاروں طرف سے یہی صدائیں آتی ہیں۔ کہ انگریزی ہماری لنگوا فرینکا ہے۔ اور ہمیں کسی ہندوستانی زبان کو یہ شرف بخشنے کا خیال ترک کر دینا چاہئے + میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ انگریزی زبان میں بولنا اور لکھنا لوگ کیوں اس قدر باعث فخر سمجھتے ہیں۔ میں نے بھی انگریزی پڑھی ہے۔ دو سال انگلستان میں بھی رہ چکا ہوں۔ اور آپ کے کتنے ہی انگریزی پر جان دینے والوں سے بہتر انگریزی لکھ اور بول سکتا ہوں۔ پر مجھے اس سے ایسی ہی نفرت ہوتی ہے جیسے کسی انگریز کے اُتارے ہوئے کپڑوں سے

پدم سنگھ ان مباحثوں میں شریک نہ ہوتے۔ جونہی موقع ملا۔ انہوں نے بٹھل داس کو قریب بُلا کر شانتا کا خط دکھلایا۔ بٹھل داس نے پوچھا۔ اب آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟

پدم سنگھ۔ میری تو کچھ عقل ہی کام نہیں کرتی۔ جب سے یہ خط ملا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ کہ میں ندی میں بہا جاتا ہوں +

بٹھل داس۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا؟

پدم سنگھ۔ کیا کروں؟

بٹھل داس۔ شانتا کو رخصت کرا لائیے +

پدم سنگھ۔ سارے خاندان سے ناتا ٹوٹ جائے گا +

بٹھل داس۔ ٹوٹ جائے۔ اسوقت فرض یہی ہے۔ اس سے منہ موڑنا مناسب

نہیں +
پدم سنگھ۔ آپ یہ بجا فرماتے ہیں۔ لیکن مجھ میں اتنا استحکام نہیں ہے۔ میں بھائی صاحب کو ناراض کرنیکی جرأت نہیں کرسکتا +
بٹھل۔ اپنے گھر میں نہ رکھئے۔ بدھوا آشرم میں رکھ دیجئے۔ یہ تو مشکل نہیں ؟
پدم سنگھ۔ ہاں یہ آپ نے اچھی تدبیر نکالی۔ مجھے اتنا بھی نہ سوجھتا تھا۔ مشکلات میں میری عقل جیسے چرنے چلی جاتی ہے +
بٹھل داس۔ لیکن جانا آپ کو پڑے گا +
پدم سنگھ۔ یہ کیوں۔ کیا آپ کے جانے سے کام نہ چلے گا ؟
بٹھل داس۔ بھلا اُمانا تھ اُسے میرے ساتھ کیوں بھیجنے لگے +
پدم سنگھ۔ اس میں انہیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے ؟
بٹھل داس۔ آپ تو کبھی کبھی بچوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ شانتا انکی بیٹی نہ سہی۔ لیکن اس وقت وہی اس کے سرپرست ہیں۔ وہ اُسے ایک بیگانہ آدمی کے ساتھ کیوں آنے دیں گے ؟
پدم سنگھ۔ بھائی صاحب آپ ناراض نہ ہوں۔ میں فی الواقع کچھ بدحواس ہوگیا ہوں۔ لیکن میرے چلنے سے معاملہ طول پکڑ جائے گا۔ بھائی صاحب سنیں گے تب مجھے مار ہی ڈالیں گے، جتوا سے میں انہوں نے مجھے جس بُری طرح ڈانٹا تھا وہ مجھے یاد ہے +
بٹھل۔ خیر آپ نہ چلئے۔ میں ہی چلا جاؤں گا۔ لیکن اُمانا تھ کے نام ایک خط لکھدینے میں تو آپ کو تامل نہ ہوگا ؟

پدم سنگھ۔ میں ڈرتا ہوں۔ کہ آپ مجھے نرا مٹی کا تو دہ سمجھنے لگیں گے لیکن مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے۔ ایسی کوئی حکمت بتلائیے۔ کہ خدانخواستہ کوئی بات پیدا ہو۔ تو میں صاف نکل جاؤں، بھائی صاحب کو مجھ پر الزام رکھنے کا موقع نہ ملے +

بٹھل داس نے جھنجھلا کر کہا "جناب میری فکر اتنی رسا نہیں ہے۔ بھلے آدمی! آپ بھی اپنے تئیں انسان کہیں گے۔ کہاں تو وہ دھواں دھار تقریریں کرتے ہو۔ اور ایسے بلند جذبات سے پُر کر معلوم ہوتا ہے۔ ساری دنیا سے مستغنی ہو۔ اور کہاں یہ مہمل وسوسے"!

پدم سنگھ نے خفیف ہو کر کہا "اسوقت آپ جو چاہیں کہہ لیں۔ اس مہم کی ساری ذمہ واری آپ کے سر رہے گی" +

بٹھل داس۔ اچھا ایک تار تو دیدیجئے۔ یا اتنا بھی نہ ہوگا؟

پدم سنگھ نے اچھل کر کہا "ہاں میں تار دیدوں گا۔ میں تو جانتا تھا۔ کہ آپ کوئی نہ کوئی راہ فرار ضرور نکالیں گے۔ اب اگر کبھی بات آئی۔ تو کہدوں گا۔ کہ تار میں نے نہیں دیا تھا۔ کسی غیر شخص نے میرے نام سے دیدیا ہوگا" +

مگر ایک ہی لمحہ میں ان کا خیال تبدیل ہو گیا۔ اپنے ضعف قلب پر غیرت آئی۔ دل میں سوچا۔ بھائی صاحب ایسے کم اندیش نہیں ہیں۔ کہ اس کار خیر کے لئے مجھ سے ناراض ہو جائیں۔ اور اگر ناراض بھی ہوں۔ تب مجھے اسکی پروا نہ کرنی چاہیئے +

بٹھل داس۔ تو آج ہی تار دیدیجئے +

پدم سنگھ۔ لیکن یہ سراسر جعلسازی ہوگی +

بٹھل۔ اسمیں بھی کوئی شک ہے!

پدم سنگھ۔ میں بھی چلوں تو کیسا ہو؟

بٹھل۔ نہایت مناسب۔ سارا کام بن جائے۔ ہر ایک بات بوجوہ احسن طے ہوجائے +

پدم سنگھ۔ بہتر ہے۔ ہم اور آپ دونوں چلیں +

بٹھل داس۔ تو کب؟

پدم سنگھ۔ بس آج تار دیئے دیتا ہوں۔ پرسوں شام کی گاڑی سے چلے چلیں گے؟

بٹھل۔ طے ہو گیا نہ؟

پدم سنگھ۔ جی ہاں مستقل طور پر۔ آپ میرے کان پکڑ کر کھینچ لے جائیے گا +

بٹھل داس نے اپنے سادہ دل دوست کو اعتقاد کی نظروں سے دیکھا اور تب دونوں آدمی جل ترنگ سُننے جا بیٹھے جس کی دلاویز صدائیں فضا میں گونج رہی تھیں +

(۱۹)

جب ہم حصول صحت کے لئے آب و ہوا تبدیل کرنے جاتے ہیں۔ تو خاص احتیاط کرتے ہیں۔ کہ ہم سے کوئی بد پرہیزی نہ ہو۔ مقررہ وقت پر کھاتے ہیں۔ سیر کرتے ہیں۔ آرام کرتے ہیں۔ ہم کو ہر وقت اپنی صحت کی فکر لگی رہتی ہے۔ سمن بدھوا آشرم میں روحانی صحت حاصل کرنے گئی تھی۔ اور اپنے مدعا کو ایک

دم کے لئے بھی فراموش نہ کرتی تھی۔ وہ اپنی بیوہ بہنوں کی خدمت میں حاضر رہتی اور فرصت کے وقت مذہبی کتابیں پڑھتی۔ روز گنگا اشنان کرنے جاتی۔ ان کاموں سے اس کے دل پُر درد کو سکون ملتا تھا۔

بٹھل داس نے امولا کی خبریں اس سے چھپائی تھیں۔ لیکن جب شانتا کو آشرم میں رکھنے کا قطعی فیصلہ ہو گیا۔ تو انہوں نے سُمن کو اس کے لئے تیار کرنا مناسب سمجھا۔ کنور صاحب کے یہاں سے آکر انہوں نے اس کو سارا ماجرا کہہ سُنایا۔

آشرم میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رات بہت جا چکی تھی۔ پر سمن کو کسی طرح نیند نہ آئی تھی۔ اُسے آج اپنی غلط روی کا واقعی صدمہ ہو رہا تھا۔ جس طرح کوئی مریض کلوروفارم لینے کے بعد ہوش میں آکر اپنے چیرے ہوئے پھوڑے کے گہرے زخم کو دیکھتا ہے۔ اور درد اور خوف سے پھر غش کھا جاتا ہے۔ وہی حالت اس وقت سمن کی تھی۔ ماں۔ باپ اور بہن۔ تینوں اُسے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ماں شرم سے اور غم سے سر جھکائے اُداس ہو رہی تھی۔ باپ کھڑے اُسکی طرف غضبناک اور پُر خون آنکھوں سے تاک رہے تھے۔ اور شانتا حسرت اور یاس کی تصویر بنی ہوئی کبھی زمین کی طرف دیکھتی تھی۔ کبھی آسمان کی طرف۔ سمن طائر مجروح کی طرح تڑپ اٹھی۔ وہ ایک عالم جنون میں چارپائی سے اُٹھی۔ اور دیوار پر اپنا سر پٹک دیا۔ وہ اپنی ہی نگاہ میں اس وقت کتنی معلوم ہوتی تھی۔ سر میں چوٹ لگتے ہی وہ تیورا کر گر پڑی۔ ایک لمحہ کے بعد اُسے ہوش آیا۔ سر سے خون جاری تھا۔ اُس نے آہستہ

سے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ آنگن میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ لپکی ہوئی پھاٹک
پر آئی۔ پر وہ بند تھا۔ اس نے تالے کو کئی بار ہلایا۔ لیکن نہ کھول سکی۔ بوڑھا
پھاٹک کے قریب ہی سو رہا تھا۔ سمن آہستہ سے اس کے پاس آئی۔ اور ا
بستر پر کنجی ٹٹولنے لگی۔ چوکیدار چونک پڑا۔ اور چور چور چلانے لگا۔ سمن وہا
سے بے تحاشا بھاگی اور اپنے کمرہ میں آکر کیواڑ بند کر لئے۔ اس پر رقت
کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ ہائے! مجھ جیسی خانہ
عورت دنیا میں نہ ہوگی۔ میں نے نفس پروری کی ہوس میں اپنے خاندان کو
کر دیا۔ میں اپنے باپ کی قاتلہ ہوں۔ میں نے شانتا کی گردن پر چھری چلا
میں اسے یہ روئے سیاہ کیونکر دکھاؤنگی۔ اس کے سامنے کیونکر تاکونگی۔ د
نے جسوقت میری داستان سُنی ہوگی۔ انہیں کسقدر صدمہ ہُوا ہوگا! یہ سوچ
پھر رونے لگی۔ یہ خیال اور سب تکلیفوں سے زیادہ جانگزا تھا۔ اگر کرشن چ
سے یہ باتیں کہنے کے بجائے مدن سنگھ اُسے کولھو میں پیل دیتے۔ ہاتھ
پیروں سے کچلوا دیتے۔ آگ میں جھونک دیتے۔ کُتّوں سے نچوا دیتے۔ تو
ذرا بھی چون نہ کرتی۔ وہ جسوقت گھر سے نکلی تھی۔ اُسے یہ گمان بھی نہ تھا۔ ک
دال منڈی میں بیٹھنا پڑے گا۔ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے نکل کھڑی ہوئی تھ
اُس یاس اور اندوہ کی حالت میں اُسے بھول گیا تھا۔ کہ میرا باپ اور بہ
بھی ہے۔ عرصہ دراز کی جدائی نے اس کے دل میں انکی یاد ہی باقی نہ رکھ
تھی۔ وہ دُنیا میں اپنے کو اکیلی۔ بے یار و مددگار سمجھتی تھی۔ میں کسی دوسری
میں ہوں۔ جہاں کوئی اپنا شناسا۔ اپنا عزیز نہیں ہے۔ یہاں میں جو کچھ کر

وہ چھپا رہے گا۔ کوئی مجھ پر ہنسنے والا۔ مجھ پر آنسو بہانیوالا نہیں ہے۔ پر اب ایسے اتفاق آ پڑے تھے۔ کہ وہ پھر اپنے تئیں عزیزوں اور یگانوں کے رشتہ میں بندھا ہوا پاتی تھی۔ جنہیں وہ بھول گئی تھی۔ وہ پھر اس کے سامنے آ گئے تھے۔ اپنے یگانوں کے قرب نے اُس کی شمع غیرت کو روشن کر دیا۔

سمن نے باقی رات ایک روحانی عذاب کی حالت میں بسر کی۔ پانچ بجتے ہی جونہی پھاٹک کھلا۔ وہ گنگا اشنان کرنے چلی۔ وہ اکثر اکیلے ہی جایا کرتی تھی۔ اس لئے چوکیدار نے کچھ پوچھا نہیں۔

گنگا کنارے پہنچکر سمن ادھر اُدھر تاکنے لگی۔ وہ آج گنگا میں نہانے نہیں۔ ڈوبنے آئی تھی۔ اُسے کسی قسم کا خوف۔ گھبراہٹ یا اضطراب نہ تھا۔ کل کسی وقت شانتا آشرم میں آجائیگی۔ اس سے ملاقات کرنے کی بہ نسبت گنگا کی گود میں منہ چھپا لینا کتنا آسان تھا!

ناگاہ اُس نے دیکھا۔ کہ کوئی آدمی اسکی طرف چلا آ رہا ہے۔ ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا۔ لیکن سمن کو اتنا معلوم ہو گیا۔ کہ وہ سادھو ہے۔ سمن کی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی۔ اس نے ارادہ کیا۔ کہ اِسے سادھو کو دیدوں۔ لیکن جونہی وہ قریب آیا سمن نے شرم حقارت اور دہشت سے منہ چھپا لیا۔ یہ گجانند تھے!

سمن کھڑی تھی۔ گجانند اُس کے پیروں پر گر پڑے۔ اور تھرتھراتی ہوئی آواز سے بولے "سمن میرا قصور معاف کرو"۔

سمن ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اسکی نظروں کے سامنے اس شب بادی

کا نقشہ کھنچ گیا۔ زخم تازہ ہو گیا۔ اُس کے جی میں آیا۔ کہ اسے خوب ذلیل کروں
کہوں کہ تم میرے باپ کے قاتل۔ میری زندگی کو تباہ کرنیوالے ہو۔ پر کچھ گجانند
کے ندامت آمیز انکسار۔ کچھ انکے فقیرانہ بھیس اور کچھ اُس جوش عفو نے جو ایسی
حالت میں دل پر طاری ہو جاتا ہے۔ اُسے پگھلا دیا۔ اُسکی آنکھیں بھر آئیں
رقت آمیز لہجہ میں بولی "تمہارا کوئی قصور نہیں۔ جو کچھ ہوا۔ وہ سب میرے
کرموں کا پھل تھا"۔

گجانند۔ نہیں سمن ایسا نہ کہو۔ یہ سب میری جہالت اور حماقت کا پھل ہے۔
میں نے سوچا تھا۔ کہ اس کی کچھ پرائشچت کر سکوں گا۔ لیکن اس کے مہلک
نتائج دیکھ کر پرائشچت کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ آہ! میں نے انہیں آنکھوں
سے پنڈت کرشن چندر کو گنگا میں ڈوبتے دیکھا ہے!

سمن نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ کیا آپ اُسوقت وہاں موجود تھے؟

گجانند۔ ہاں موجود تھا۔ میں رات کو امولا جا رہا تھا۔ اسنہ میں مجھے مل گئے۔ مجھے
آدھی رات کو انہیں ندی کی طرف جاتے دیکھ شبہ ہُوا۔ انہیں اپنے ڈیرے
پر لایا۔ اور انہیں تشفی دینے کی کوشش کی۔ پھر یہ سمجھکر کہ میرا منشا پورا ہو گیا۔ میں
سو گیا۔ تھوڑی دیر میں جب میری نیند کھلی۔ تو انہیں وہاں نہ دیکھا۔ فوراً گنگا کی طرف
دوڑا۔ اس وقت اُن کے پکارنے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ لیکن جب
تک میں یہ فیصلہ کر سکوں۔ کہ وہ کہاں ہیں۔ بیرحم لہروں نے انہیں چھپا لیا۔ وہ
نفس پاک میری آنکھوں کے سامنے جنت کو سدھارا۔ تب مجھے معلوم ہُوا۔
کہ میں نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔ معلوم نہیں ایشور کے یہاں اس کی کیا سزا ملیگی"۔

گجانند کی روحانی کوفت نے سمن کے دل پر وہی کام کیا۔ جو صابون میل کے ساتھ کرتا ہے۔ اس نے دل میں بیٹھے ہوئے غبار کو اُوپر کر دیا۔ وہ خیالات نکل پڑے۔ جنہیں وہ مخفی رکھنا چاہتی تھی۔ بولی۔ ایشور نے تمہارے باطن کو روشن کر دیا ہے۔ تم اپنی نکوکاریوں سے چاہے کچھ کر بھی لو۔ پر میری کیا گت ہو گی۔ میں تو دونوں جہاں سے گئی۔ ہائے میری ہوس عیش نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اب کیا چھپاؤں۔ تمہاری غریبی اور اس سے زیادہ تمہارے دلازارانہ برتاؤ نے مجھے اپنی حالت سے بیزار کر دیا تھا۔ اُسوقت اس پھپھولے کو پھوڑنے کے لئے ذراسی ٹھیس بھی بہت تھی۔ تمہاری محبت۔ تمہاری ہمدردی۔ تمہاری ملائمت۔ تمہاری شفقت اس پھپھولے پر مرہم کا کام کرتی۔ لیکن تم نے اسے بے دردی کے ساتھ مسل دیا۔ میں درد سے بیتاب۔ بیہوش ہو گئی۔ تمہارے اس بیرحمانہ سلوک کو جب یاد کرتی ہوں تو دل میں ایک شعلہ سا دہک اُٹھتا ہے۔ اور تہ دل سے تمہارے لئے بددُعا نکل آتی ہے۔ یہ میرا آخری وقت ہے ایک لمحہ میں یہ گناہ آلود جسم گنگا میں ڈوب جائے گا۔ اس لئے ایشور سے اب دُعا کرتی ہوں کہ وہ تمہاری خطائیں معاف کرے۔ تم میرے اور اپنے گناہوں کی پراشچت کر سکو"۔

گجانند نے متفکرانہ انداز سے کہا۔ "سمن اگر جان دینے سے گناہوں کی پراشچت ہو جاتی۔ تو میں اب تک کبھی کا جان دے چکا ہوتا"۔

سمن نے کہا۔ "کم سے کم مصیبتوں کا تو خاتمہ ہو جائے گا"۔

گجانند۔ ہاں تمہاری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن ان کی مصیبتوں کا خاتمہ

نہ ہوگا۔ جو تمہارے دُکھ سے دکھی ہو رہے ہیں۔ تمہارے ماں باپ قید جسم سے
آزاد ہو گئے ہیں۔ لیکن انکی روحیں تمہارے آس پاس پھر رہی ہیں۔ وہ اب بھی
تمہارے سُکھ سے سُکھی اور تمہارے دکھ سے دُکھی ہونگی۔ سوچ لو۔ اپنی جان دیکر
انکی روحوں کو عذاب میں ڈالو گی۔ یا اپنی زندگی کو سدھار کر انہیں نجات دو گی۔
یہ بھی سوچو۔ کہ تمہارے نہ رہنے سے اس بیکس شانتا کی کیا حالت ہوگی۔ جس نے
ابھی تک زمانہ کا اونچ نیچ نہیں دیکھا۔ تمہارے سوا دُنیا میں اس کا اور کون ہے؟
اُماناتھ کا حال تم جانتی ہو۔ وہ اس کا نباہ نہیں کر سکتے۔ انہیں رحم ہے پر رحم سے زیادہ
لالچ ہے۔ کبھی نہ کبھی وہ اُس سے ضرور ہی اپنا گلا چھڑا لیں گے۔ اُسوقت وہ کس کی ہو کر رہیگی؟

سمن کو گجانند کی باتوں میں سچی ہمدردی کی جھلک نظر آئی۔ اُس نے انکی
طرف عاجزانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ "اسی لئے میں نے گنگا میں ڈوبنے کا فیصلہ کیا ہے
شانتا سے ملاقات کرنے کے مقابلہ میں مجھے ڈوب مرنا زیادہ آسان معلوم ہوتا
ہے۔ اس نے کئی دن ہوئے پنڈت پدم سنگھ کے پاس ایک خط بھیجا تھا۔ اُماناتھ
اسکی شادی کسی دوسری جگہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسے منظور نہیں کرتی"۔

گجانند۔ دیوی ہے۔

سمن۔ شرما جی بیچارے اور کیا کرتے۔ انہوں نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ اُسے لاکر
آشرم میں رکھیں۔ اگر ان کے بھائی صاحب راضی ہو گئے۔ تب تو اچھا ہے ورنہ
اس دکھیا کو نہ معلوم کتنے دنوں تک آشرم میں رہنا پڑے گا۔ وہ کل یہاں
آجائیگی۔ اس کے سامنے جانے کا خوف۔ اُس سے آنکھیں ملانے کی شرم
مجھے مارے ڈالتی ہے۔ جب وہ ملامت کی نظروں سے میری طرف دیکھے

گی۔ اسوقت میں کیا کرونگی؟ اور جو کہیں اُس نے نفرت کے باعث مجھ سے گلے ملنے سے پرہیز کیا۔ تب تو میں اسی وقت زہر کھالونگی۔ اس ذلت سے تو مرجانا ہی بہتر ہے۔

گجانند نے سمن کو ارادتمندانہ نظروں سے دیکھا۔ انہیں محسوس ہُوا۔ کہ ایسی حالت میں میرے دل کی بھی وہی حالت ہوتی۔ جو اس وقت سمن کی ہو رہی ہے۔ بولے "سمن تمہاری باتیں سچی ہیں۔ لیکن تمہارے دل پر چاہے جو کچھ گزرے شانتا کی خاطر تمہیں سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ تمہاری ذات سے اسکی جتنی بھلائی ہو سکتی ہے۔ اتنی دوسرے کی ذات سے ممکن نہیں۔ اب تک تم اپنے لئے جیتی تھیں۔ اب دوسروں کے لئے جیو"۔

یہ کہہ کر گجانند جدھر سے آئے تھے۔ اُدھر ہی چلے گئے۔ سمن گنگا کنارے دیر تک کھڑی انکی باتوں پر غور کرتی رہی۔ تب اشنان کرکے آشرم کی طرف چلی جیسے کوئی سپاہی جنگ میں شکست کھا کر سر جھکائے ہوئے گھر کی طرف جاتا ہے۔



شانتا نے پدم سنگھ کے نام خط تو لکھ دیا تھا۔ پر اُسے جواب کی کوئی اُمید نہ تھی۔ تین دن گزر گئے۔ اُسکی مایوسی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ اگر موافق جواب نہ آیا۔ تو اُماناتھ ضرور ہی میری شادی کر دیں گے۔ یہ سوچکر اس کا دل کانپنے لگتا تھا۔ وہ دن میں کئی بار دیوی کے چبوترے پر جاتی اور طرح طرح منتیں مانتی۔ کبھی شیوجی کے مندر میں جاتی۔ اور اُن سے اپنی مراد مانگتی۔ سدن ایک

لمحہ کے لئے بھی اس کے دھیان سے نہ اترتا تھا۔ وہ اس کی تصویر سے مخاطب ہوکر کہتی۔" پران ناتھ۔ مجھے کیوں نہیں اپناتے؟ کیا بدنامی کے خیال سے؟ ہائے کیا میری جان اتنی سستی ہے۔ کہ ان داموں بکے؟ تم مجھے ترک کر رہے ہو۔ مجھے آگ میں جھونک رہے ہو۔ محض اس لئے کہ میں سمن کی بہن ہوں۔ یہی انصاف ہے! کہیں تم مجھے مل جاتے۔ میں تمہیں پکڑ لیتی۔ پھر دیکھتی۔ کہ تم مجھ سے کیسے بھاگتے ہو۔ تم پتھر نہیں ہو۔ کہ میرے آنسوؤں سے نہ پگھل جاؤ۔ تم اپنی آنکھوں سے ایک بار میرا حال زار دیکھ لیتے۔ تو پھر تم سے نہ رہا جاتا۔ ہاں تم سے ہرگز نہ رہا جاتا۔ تمہارا وسیع دل درد سے خالی نہیں ہو سکتا۔ کیا کروں؟ تمہیں اپنے دل کی حالت کیونکر دکھاؤں؟

چوتھے دن علی الصباح پدم سنگھ کا تار ملا۔ شانتا سہم گئی۔ اُس کا جذبۂ اُلفت کچھ دھیما پڑ گیا۔ اپنے آئندہ حالت کے تفکرات نے دل کو مشوش کر دیا۔

لیکن اُمانا تھ پھولے نہ سمائے۔ باجے کا انتظام کیا۔ سواریاں جمع کیں۔ سارے گاؤں میں نوید بھیجے۔ چوپال میں فرش فروش بچھوائے۔ گاؤں کے لوگ حیران تھے۔ کہ یہ کیسا گونہ ہے؟ شادی تو ہوئی ہی نہیں۔ گونہ کیسا؟ وہ سمجھتے تھے۔ کہ اماناتھ نے کوئی نہ کوئی چال چلی ہے۔ ایک ہی خُرّانٹ ہے۔ وقت معینہ پر اُماناتھ اسٹیشن گئے۔ اور باجے بجواتے ہوئے مہمانوں کو گھر لائے اور چوپال میں انہیں اُتارا۔ صرف تین آدمی تھے۔ بٹھل داس۔ پدم سنگھ اور ایک ملازم۔

دوسرے دن شام کے وقت رخصتی کی مہورت تھی۔ تیسرا پہر ہوگیا۔

مگر اماناتھ کے گھر میں گاؤں کی کوئی عورت نظر نہیں آتی۔ وہ بار بار اندر آتے ہیں۔ تیور بدلتے ہیں۔ دیواروں کو دھمکا کر کہتے ہیں۔ میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔ جاھنوی سے بگڑ کر کہتے ہیں۔ میں ان سبھوں کی خبر لوں گا لیکن وہ دھمکیاں جو کبھی نمبرداروں کا زہرہ آب کر دیا کرتی تھیں۔ آج کسی پر اثر نہیں کرتیں، برادری بیجا دباؤ نہیں برداشت کرتی۔ نخوت اور تکبر کا سر نیچا کرنے کے لئے وہ ایسے ہی موقعوں کی منتظر رہتی ہے۔

شام ہوئی۔ کہاروں نے پالکی دروازہ پر لگا دی۔ جاھنوی اور شانتا خوب گلے ملکر روئیں۔ شانتا کا دل درد محبت سے بھرا ہوا تھا۔ اس گھر میں اُس نے جو جو مصیبتیں جھیلیں وہ سب اس وقت بھول گئی تھیں۔ ان لوگوں سے اب پھر ملاقات نہ ہوگی۔ اس گھر کے در و دیوار کے پھر درشن نہ ہوں گے۔ ان سے ہمیشہ کے لئے رشتہ ٹوٹتا ہے۔ اس خیال سے اس کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا تھا۔ جاھنوی کے دل میں بھی ہمدردانہ رحم کی موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ اس غریب یتیم لڑکی کو ہماری ذات سے بہت تکلیف ہوئی۔ یہ سوچکر وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکتی تھی۔ دونوں کے دل خالص سچے اور نازک جذبات سے اُمڈے ہوئے تھے۔

اُماناتھ گھر میں آئے۔ تو شانتا ان کے پیروں سے لپٹ گئی۔ اور بین کر کے رونے لگی۔ ”تمہیں میرے باپ ہو۔ اپنی اس بدنصیب بیٹی کو بھول نہ جانا۔ میری بہنوں کو گہنے کپڑے دینا۔ ہولی اور تیجے میں بلانا۔ لیکن میں تمہارے دو حرفوں ہی کو نعمت سمجھوں گی۔“ اُماناتھ نے اُسے تشفی دیتے

ہوئے کہا۔ "بیٹی میری جیسی دو بیٹیاں ہیں۔ ویسی ہی ایک تم بھی ہو۔ پرماتما تمہیں ہمیشہ آرام سے رکھے۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگے +

شام کا وقت تھا۔ منی گائے گھر آئی۔ تو شانتا اس کے گلے سے چمٹ کر رونے لگی۔ اس نے تین چار سال تک اس گائے کی خدمت کی تھی۔ اب وہ کس کے لئے بھوسا لیکر دوڑیگی؟ کس کے گلے میں کالے ڈورے میں کوڑیاں گوندھ کر پہنائیگی؟ منی سر جھکائے اس کے ہاتھوں کو چاٹتی تھی۔ اس کا درد فراق اسکی آنکھوں سے جھلک رہا تھا +

جاہنوی نے شانتا کو لا کر پالکی میں بٹھا دیا۔ کہاروں نے پالکی اٹھائی شانتا کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا میں گہرے پانی میں بہی جا رہی ہوں +

گاؤں کی عورتیں اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی پالکی کو دیکھتی تھیں۔ اور روتی تھیں +

اُمانا تھ اسٹیشن تک لوگوں کو پہنچانے گئے۔ چلتے وقت اپنی پگڑی اتار کر پدم سنگھ کے پیروں پر رکھ دی۔ پدم سنگھ نے انہیں گلے سے لگا لیا +

جب گاڑی چلی۔ تو پدم سنگھ نے بٹھل داس سے کہا۔ "اب اس ڈراما کا سب سے مشکل حصہ آگیا" +

بٹھل داس۔ میں آپ کا منشا نہیں سمجھا +

پدم سنگھ۔ کیا شانتا سے کچھ کہے سنے بغیر ہی اُسے آشرم میں پہنچا دیجیے گا؟ اسے پہلے سے تیار کر رکھنا چاہئے +

بٹھل داس۔ ہاں۔ یہ آپ نے خوب یاد دلایا۔ تو جا کر کہدوں؟

پدم سنگھ - ذرا سوچ تو لیجئے - کیا کہئے گا، ابھی تو یہ سمجھ رہی ہے - کہ میں سسرال جا رہی ہوں - صدمہ غم میں یہ اُمید اُسے سنبھالے ہوئے ہے - لیکن جب اُسے ہماری حرکتیں معلوم ہو جائیں گی - تو اسے کتنا رنج ہو گا! مجھے افسوس ہو رہا ہے - کہ میں نے پہلے ہی یہ راز کیوں نہ کہدیا +

بٹھل داس - تو اب کہدینے میں کیا بگڑا جاتا ہے - مرزا پور میں گاڑی دیر تک ٹھہریگی - میں جاکر اُسے سمجھا دوں گا +

پدم سنگھ - مجھسے سخت غلطی ہوئی +

بٹھل داس - اگر اس غلطی پر پچھتانے ہی سے کام چل جائے - تو خوب جی بھر کر پچھتا لیجئے +

پدم سنگھ - اگر آپ کے پاس پنسل ہو تو لایئے - اُسے ایک خط لکھ کر سارا حال روشن کر دوں +

بٹھل داس - نہیں تار دیدیجئے - یہ اور بھی بہتر ہو گا - آپ عجیب آدمی ہیں - سیدھی سی بات میں اسقدر پس و پیش کرنے لگتے ہیں +

پدم سنگھ - موقع ہی ایسا آپڑا ہے - میں کیا کروں - ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے - مغلسرائے میں دیر تک رُکنا پڑے گا - بس وہیں اس کے پاس جاکر سب ماجرا کہہ سناؤں +

بٹھل داس - یہ آپ بہت دور کی کوڑی لائے - اسی لئے عقلمندوں نے کہا ہے کہ کوئی کام بلا سوچے سمجھے نہ کرنا چاہئے - آپ کی عقل راستہ پر آتی ہے - لیکن بہت چکر کھا کر - یہی بات آپ کو پہلے نہ سوجھی +

شانتا ڈیوڑھے درجہ کی زنانے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں دو عیسائی لیڈیاں اور بھی بیٹھی تھیں۔ وہ شانتا کو دیکھ کر انگریزی میں باتیں کرنے لگیں:

"معلوم ہوتا ہے۔ یہ لڑکی سسرال جارہی ہے"۔

"ایسا رو رہی ہے۔ گویا کوئی دھکیلے لئے جاتا ہو"۔

"شوہر کی ابھی تک صورت ہی نہ دیکھی ہوگی۔ محبت کیونکر ہو سکتی ہے۔ مارے خوف کے بے حال ہوئی جاتی ہے"۔

"یہ ان کے یہاں نہایت بیہودہ رواج ہے۔ بیچاری لڑکی غیروں میں بھیجدی جاتی ہے۔ جہاں کوئی اس کا ہمدرد نہیں ہوتا"۔

"یہ اسی دور توحش کی باقیات ہیں۔ جب لوگ لڑکیوں کو بزور اٹھالے جاتے تھے"۔

ایک لیڈی نے شانتا سے پوچھا "کیوں بائی جی سسرال جارہی ہو؟"

شانتا نے آہستہ سے سرہلا کر کہا۔ "ہاں"۔

"تم اتنی خوبرو ہو۔ تمہارا شوہر بھی تمہارے ہی جوڑ کا ہے؟"

شانتا نے متانت سے جواب دیا۔ "شوہر میں خوب صورتی نہیں دیکھی جاتی"۔

"اگر وہ کالا کلوٹا ہو تو؟"

شانتا نے پُرغرور لہجہ میں جواب دیا۔ "ہمارے لئے وہ دیوتا ہے چاہے کیسا ہی ہو"۔

"اچھا مان لو تمہارے سامنے دو آدمی آئیں۔ ایک خوب صورت ہو۔

دوسرا کمرو۔ تو تم کسے پسند کرو گی؟"
شانتا نے مستقل انداز سے کہا۔ "جسے ہمارے ماں باپ پسند کریں"۔
شانتا سمجھ رہی تھی۔ کہ یہ دونوں لیڈیاں ہمارے طریق ازدواج پر آوازے کس رہی ہیں۔ وہ اس کا جواب دینا ضروری سمجھتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پوچھا "میں نے سُنا ہے۔ آپ لوگ اپنے شوہر خود چُن لیتی ہیں؟"
"ہاں۔ اس معاملہ میں ہمکو کامل آزادی ہے"۔
"آپ اپنے تئیں والدین سے زیادہ عقل مند سمجھتی ہیں؟"
"ہمارے والدین کیا جان سکتے ہیں۔ کہ ہم کو اُن کے چُنے ہوئے شوہر سے محبت ہو گی یا نہیں"۔
"تو آپ شادی میں محبت کو اوّل سمجھتی ہیں؟"
"ہاں اور کیا۔ شادی محبت کا رشتہ ہے"۔
"ہم لوگ شادی کو دھرم کا رشتہ سمجھتی ہیں۔ ہماری محبت دھرم کے پیچھے پیچھے چلتی ہے"۔
نو بجے گاڑی مغلسرائے پہنچی۔ بٹھل داس نے آکر شانتا کو اُتارا۔ اور ذرا دور ہٹ کر پلیٹ فارم پر ایک قالین بچھا کر اسے بٹھا دیا۔ بنارس کی گاڑی کے کھُلنے میں آدھ گھنٹہ کی دیر تھی۔
شانتا نے دیکھا۔ کہ ہزاروں آدمی سر پر بڑے بڑے گٹھر رکھے ایک تنگ دروازہ کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور باہر نکلنے کے لئے ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں، ایک دوسرے تنگ دروازہ پر ہزاروں آدمی اندر

آنے لئے دھکم دھکا کر رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ایک چوڑے دروازہ سے انگریز لوگ چھڑی گھماتے۔ کُتوں کو لئے لیڈیوں سے ہاتھ ملاتے۔ بہ آسائش آتے جاتے ہیں، کوئی انہیں نہیں روکتا۔ کوئی ان سے نہیں بولتا۔ پولیس کے ملازم بھی جُھک جُھک کر انہیں سلام کرتے ہیں ؛

اتنے میں پنڈت پدم سنگھ اس کے قریب آئے۔ اور بولے "شانتا میں تمہارا دھرم پتا پدم سنگھ ہوں"؛

شانتا کھڑی ہو گئی۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ کر انہیں پرنام کیا۔ پدم سنگھ نے کہا۔ "تمہیں تعجب ہو رہا ہوگا۔ کہ ہم لوگ چنار کیوں نہیں اُترے۔ اس کا سبب یہی ہے۔ کہ ابھی تک میں نے بھائی صاحب سے تمہاری بابت کچھ نہیں پوچھا۔ تمہارا خط پا کر میں ایسا گھبرایا۔ کہ مجھے پہلے تمہیں اموالے سے رخصت کرا لانا سب سے ضروری معلوم ہُوا۔ بھائی صاحب سے کچھ کہنے سننے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ اس لئے ابھی کچھ دنوں تک تمہیں بنارس رہنا پڑے گا۔ میں نے تجویز کی ہے۔ کہ تمہیں اس وقت اُسی آشرم میں ٹھہراؤ جہاں آج کل تمہاری بہن سمن رہتی ہے۔ سمن کے ساتھ رہنے میں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ تم نے سمن کے متعلق جو شرمناک افواہیں سنی ہیں۔ اُنہیں دل سے نکال ڈالو۔ وہ اب دیوی ہے۔ اسکی زندگی اب نمونہ کے قابل ہو گئی ہے۔ ایسا نہ ہوتا۔ تو میں تمہیں اس کے ساتھ رکھنے پر ہرگز راضی نہ ہوتا۔ مہینہ دو مہینہ میں میں بھائی صاحب کو راضی کر لوں گا۔ اگر تمہیں یہ انتظام پسند نہ ہو تو مجھ سے صاف صاف کہدو تاکہ میں کوئی دوسری

فکر کروں +

پدم سنگھ نے ان الفاظ کو بڑی مشکل سے ختم کیا۔ سمن کی انہوں نے جو تعریف کی تھی۔ اُس پر انہیں خود اعتبار نہ تھا۔ مدن سنگھ کے متعلق بھی وہ اس سے بہت زیادہ کہہ گئے۔ جتنا وہ کہنا چاہتے تھے، انہیں اس بھولی بھالی لڑکی کو اس طرح مغالطہ دیتے ہوئے روحانی صدمہ ہو رہا تھا +

شانتا روتی ہوئی پدم سنگھ کے پیروں پر گر پڑی۔ اور یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے "میں اب آپ کی شرن ہوں۔ جو مناسب سمجھئے وہ کیجئے"۔ شرم۔ یاس اور غم کا اظہار ان سے بہتر لفظوں میں نہیں ہو سکتا تھا +

شانتا کے دل پر سے ایک بوجھ سا اُٹھ گیا۔ اب اسے اپنے مستقبل کی بابت کسی اندیشہ کی ضرورت نہ تھی۔ اُسے کچھ دنوں کے لئے اپنی زندگی کا راستہ معین نظر آنے لگا۔ اسوقت اُسکی حالت اس آدمی کی سی تھی۔ جو اپنے جھونپڑے میں آگ لگ جانے سے اس لئے خوش ہو۔ کہ کچھ دیر کے لئے وہ تاریکی کے خوف سے آزاد ہو جائے گا +

گیارہ بجے یہ لوگ آشرم میں داخل ہوئے۔ بیٹھل داس اترے۔ کہ جا کر سمن بائی کو خبر دوں۔ پر دیکھا۔ تو وہ بخار سے بیہوش پڑی ہوئی تھی۔ آشرم کی کئی عورتیں اُسکی تیمارداری میں مصروف تھیں +

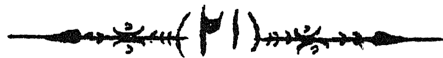
کئی عورتوں نے شانتا کو گاڑی سے اُتارا۔ شانتا آہستہ آہستہ صحن کے کمرہ میں گئی۔ اور اس کے سرہانے کھڑی ہو کر بولی "بہن!"

سمن نے آنکھیں کھولدیں۔ شانتا مورت کی طرح کھڑی اپنی بہن کو دیکھ

اور پُر آب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ یہ میری وہی پیاری بہن ہے۔ جس کے ساتھ میں تین چار سال قبل کھیلا کرتی تھی۔ وہ لمبے لمبے سیاہ گیسو کہاں ہیں؟ وہ کندن سا دمکتا ہوا رخ روشن کہاں ہے؟ وہ شوخ مسکراتی ہوئی آنکھیں کہاں گئیں؟ وہ انگور سے بھرا ہُوا جسم۔ وہ لب گلفام۔ وہ قد رعنا وہ نزاکت۔ وہ ملاحت کہاں غائب ہو گئیں؟ یہ سمن ہے یا اسکی لاش! شانتا کا دل درد اور پریم سے اُمڈ گیا۔ اس نے دوسری عورتوں کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ اور تب وہ روتی ہوئی سمن کے گلے سے لپٹ گئی۔ اور بولی "بہن کیسی طبیعت ہے؟ تمہاری شانتی کھڑی ہے"۔

سمن نے آنکھیں کھولیں۔ اور شانتا کو وحشت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ "کون شانتی؟ ہٹ جا۔ مجھے مت چھو۔ میں ابھاگنی ہوں۔ میں روسیاہ ہوں۔ تو دیوی ہے۔ تو پاک نفس ہے۔ میرے قریب مت آ۔ یہاں سے بھاگ جا"۔

یہ کہتے کہتے سمن پھر بیہوش ہو گئی۔ شانتا ساری رات سمن کے پاس بیٹھی پنکھا جھلتی رہی۔



(۲۱)

شانتا کو آشرم میں آئے۔ ایک ماہ سے زائد ہو گیا۔ لیکن پدم سنگھ نے ابھی تک اپنے گھر میں کسی سے اس کا چرچا نہیں کیا۔ کبھی سوچتے۔ بھائی صاحب کو خط لکھوں۔ کبھی سوچتے چلکر اُن سے خود کہوں۔ کبھی بھٹّل داس

کو کھینچنے کا خیال کرتے۔ لیکن کوئی قطعی رائے نہ قائم کرسکتے تھے +

ادھر اُن کے احباب اخراج کی تجویز کو بورڈ میں پیش کرنے کے لئے اصرار کررہے تھے۔ انہیں اُسکی کامیابی کی پوری اُمید تھی۔ اندیشہ ہوتا تھا۔ کہ تاخیر سے کوئی نیا رخنہ نہ پیدا ہو جائے۔ پدم سنگھ ان لوگوں کو بھی ٹالتے آتے تھے۔ یہاں تک کہ مئی کا مہینہ آگیا۔ اور اب بیٹھل داس اور پروفیسر رمیش دت نے انہیں اتنا تنگ کیا۔ کہ انہیں مجبور ہو کر بورڈ میں باضابطہ طور پر اپنی تجویز کی اطلاع کرنا پڑی۔ دن اور وقت معین ہوگیا +

جوں جوں دن قریب آتا تھا۔ پدم سنگھ کا انتشار قلب بڑھتا جاتا تھا۔ انہیں محسوس ہوتا تھا۔ کہ محض اس تجویز کے منظور ہو جانے سے مقصود نہ حاصل ہوگا + اسے عملی صورت میں لانے کے لئے شہر کے جملہ معززین کی ہمدردی اور امداد کی ضرورت ہوگی + اسی لئے وہ حاجی ہاشم کو کسی نہ کسی طرح اپنے موافق حال بنانا چاہتے تھے۔ حاجی صاحب کا شہر میں اتنا دباؤ تھا۔ کہ ارباب نشاط بھی انکی مرضی کی خلاف ورزی نہ کرسکتی تھیں + بالآخر حاجی صاحب بھی پگھل گئے۔ انہیں پدم سنگھ کی نیک نیتی پر یقین آگیا +

آج بورڈ میں یہ تجویز پیش ہوگی میونسپل کورٹ کے احاطہ میں بڑی بھیڑ بھاڑ ہے۔ فوج حسن نے خوب مسلح ہو کر اپنی پوری جمعیت سے بورڈ پر حملہ کیا ہے۔ دیکھیں بورڈ کی کیا حالت ہوتی ہے +

بورڈ کی کارروائی شروع ہوگئی۔ جملہ اراکین جلوہ افروز ہیں۔ ڈاکٹر شیاما چرن نے پہاڑ پر جانا ملتوی کر دیا ہے۔ منشی ابوالوفا کو تو آج رات بھر نیند نہیں آئی

وہ کبھی اندر جاتے ہیں کبھی باہر آتے ہیں۔ ان کا جوش اور انہماک آج اعتدال سے متجاوز ہو گیا ہے ۔

پدم سنگھ نے اپنی تجویز پیش کی۔ اور تلے ہوئے الفاظ میں اُسکی تصریح کی۔ یہ تین حصوں میں منقسم تھی ۔

(۱) طوائفوں کو شہر کے مرکزی مقامات سے ہٹا کر بستی سے دور رکھا جائے ۔

(۲) انہیں شہر کی خاص سیر گاہوں اور باغوں میں آنے کی ممانعت کیجائے ۔

(۳) رقص کی مجلسوں پر ایک شدید ٹیکس لگایا جائے۔ اور ایسے جلسے کسی حالت میں کھُلے مقامات میں نہ کئے جائیں ۔

پروفیسر رمیش دت نے اس تجویز کی تائید کی ۔

سید شفقت علی نے فرمایا۔ "مجھے اس تجویز سے اتفاق کُلی ہے۔ لیکن بغیر مناسب ترمیم کے میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔ میری رائے ہے۔ کہ تجویز کے پہلے حصہ میں یہ الفاظ بڑھا دیئے جائیں"۔ یہ استثنائے اُن کے جو نو ماہ کے اندر اپنا نکاح کر لیں۔ یا کوئی ایسا ہنر سیکھ لیں۔ جس سے وہ جائز طریق پر اپنی زندگی بسر کر سکیں" ۔

کنور انرودھ صاحب نے فرمایا "مجھے اس ترمیم سے کامل اتفاق ہے۔ ہمیں اس طبقہ کو قابل نفرت سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ ہماری عین کج فہمی ہے۔ ہم جو شب و روز رشوتیں لیتے ہیں۔ سود کھاتے ہیں۔ غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ بیکسوں کا گلا کاٹتے ہیں۔ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ

جمہور کے کسی حصّہ کو حقیر سمجھیں + سب سے ذلیل ہم ہیں۔ سب سے بڑے گنہگار۔ بدکار۔ اور سیہ کار ہم ہیں۔ جو اپنے تئیں مہذب۔ ممتاز۔ منور اور مرفح سمجھتے ہیں + ہمارے مہذب برادران وطن ہی کی بدولت دال منڈی آباد ہے۔ چوک میں چہل پہل ہے۔ چکلوں میں رونق ہے۔ یہ مینا بازار ہمیں لوگوں نے سجایا ہے۔ یہ چڑیاں ہمیں لوگوں نے پھنسائی ہیں۔ یہ کٹھ پتلیاں ہمیں نے بنائی ہیں۔ جس قوم میں جابر زمیندار۔ رشوت خوار عمال سرکار۔ خون آشام مہاجن اور خود غرض عزیز ادر دوست اعزاز اور وقار کے قابل سمجھے جائیں۔ وہاں دال منڈی کیوں نہ آباد ہو۔ حرام کی دولت حرام کاری کے سوا۔ اور کہاں جا سکتی ہے؟ جس دن نذرانہ۔ رشوت۔ سود در سود اور ناجائز منافعہ کا خاتمہ ہوگا۔ اُسی روز دال منڈی ویران ہو جائیگی۔ وہ چڑیاں اُڑ جائیں گی۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں۔ خاص تجویز اس ترمیم کے بغیر نشتر کا وہ زخم ہے۔ جس پر مرہم نہیں۔ میں اُسے قبول نہیں کر سکتا +

پنڈت پربھاکر راؤ نے فرمایا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس ترمیم کو اصل رزولیوشن سے کیا تعلق ہے۔ اسے آپ الگ ایک دوسری تجویز کی صورت میں پیش کر سکتے ہیں۔ اس طبقہ کی اصلاح کے لئے آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ تمام تر قابل ستائش ہے۔ لیکن یہ کام بستی سے ہٹکر بھی اتنا ہی آسان یا مشکل ہے۔ جتنا شہر کے اندر۔ بلکہ باہر اس کا زیادہ سہل الحصول ہونا ممکن ہے" +

منشی ابوالوفا بولے "مجھے اس ترمیم سے پورا اتفاق ہے" +

منشی عبداللطیف نے فرمایا "اس ترمیم کے بغیر تجویز ہرگز قابل پذیرائی نہیں"۔

دینا ناتھ تیواری نے بھی ترمیم پر زور دیا۔

سید تیغ علی نے فرمایا "اس ترمیم سے اصل تجویز کی منشا کے فوت ہونے کا احتمال ہے۔ آپ گویا ایک مکان کا صدر دروازہ بند کرکے عقب کی طرف ایک دوسرا دروازہ کھول رہے ہیں۔ یہ غیر ممکن ہے۔ کہ وہ عورتیں جو اب تک عیش اور تکلف کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ مشقت اور مزدوری کی زندگی بسر کرنے پر رضامند ہو جائیں۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ وہ اس ترمیم سے ناجائز فایدے اُٹھائیں گی۔ کوئی اپنے بالاخانہ پر "سنگر" کی ایک مشین رکھ کر اپنا بچاؤ کرے گی۔ کوئی موزے کی ایک مشین رکھ لے گی۔ کوئی پان کی دکان کھول لے گی۔ کوئی اپنے بالاخانہ پر سیب اور انار کے خوانچے سجا دیگی۔ نقلی نکاحوں اور فرضی شادیوں کا بازار گرم ہو جائے گا۔ اور اس پردہ کی آڑ میں پہلے سے بھی زیادہ حرام کاریاں ہونے لگیں گی۔ اس ترمیم کو منظور کرنا انسانی خصلت سے بیگانگی کا اظہار کرنا ہے"۔

حکیم شہرت خان نے کہا "مجھے سید تیغ علی صاحب کے خیالات بجا معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے ان خبیث ہستیوں کو شہر بدر کر دینا چاہیئے۔ اس کے بعد اگر وہ جائز طریق پر زندگی بسر کرنا چاہیں تو کافی اطمینان کے بعد انہیں امتحاناً شہر میں آباد ہونے کی اجازت دینی چاہیئے۔ شہر کا دروازہ کسی پر بند نہیں ہے۔ مجھے کامل یقین ہے۔ کہ ترمیم سے اس

تجویز کا مقصد غائب ہو جائے گا"۔

مسٹر شاکر بیگ نے فرمایا "ملکی معاملات میں مصلحت چاہے کتنی ہی قابل تعریف ہو۔ لیکن اخلاقی معاملات میں وہ سراسر قابل اعتراض ہے اس سے اخلاقی مکروہات پر صرف پردہ پڑ جاتا ہے۔ ان کا ازالہ نہیں ہوتا"

پنڈت پدم سنگھ خاموش بیٹھے ہوئے اراکین کی موافق اور مخالف رائیں غور سے سن رہے تھے۔ سید شفقت علی کے طرز استدلال نے اُن کے دل پر ایک خاص اثر کیا تھا۔ کنور صاحب کے پر شفقت الفاظ اس اثر کو اور بھی قوی کر رہا تھا۔ انہیں فی الواقع یہ سراسر ظلم معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان عورتوں کو بیرحمی سے شہر کے باہر نکال دیا جائے۔ دیگر اصحاب نے اس ترمیم پر جو اعتراضات کئے۔ وہ انکی نظروں میں بالکل نہ جچے وہ دیر تک شش و پنج میں رہنے کے بعد بولے "چونکہ اس تجویز سے ہمارا منشا اس طبقہ کو تکلیف دینا نہیں۔ بلکہ انکی اصلاح کرنا ہے۔ اس لئے مجھے اس ترمیم کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے"۔

صدر جلسہ نے ترمیم پر ممبروں کی رائے لی۔ آٹھ رائیں مخالف تھیں اور آٹھ موافق۔ سیٹھ بل بھدر داس نے اس کے موافق رائے دی۔ ڈاکٹر شیاما چرن نے کسی طرف سے زبان نہیں کھولی۔ ترمیم پاس ہو گئی۔

تب اصل تجویز کے پہلے حصہ پر رائیں طلب کیں۔ ۹ موافق تھیں اور آٹھ مخالف۔ یہ حصہ منظور ہو گیا۔

پروفیسر رومیش دت۔ مسٹر رستم بھائی اور پنڈت پربھاکر راؤ نے

اس ترمیم کے منظور ہونے میں اپنی شکست سمجھی۔ اور پدم سنگھ کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا گویا انہوں نے دغا کیا ہے۔

منشی ابوالوفا اور ان کے احباب ایسے خوش تھے۔ گویا انکی فتح ہوئی انکی یہ مسرت پربھاکر راؤ اور ان کے حامیوں کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔

تجویز کے دوسرے حصہ پر رائے لی گئی۔ پربھاکر راؤ اور ان کے حامیوں نے ابکے اسکی مخالفت کی۔ وہ پدم سنگھ کو انحراف کی سزا دینی چاہتے تھے۔ یہ حصہ نامنظور ہوگیا۔ منشی ابوالوفا اور ان کے احباب بغلیں بجانے لگے۔

اب تجویز کے تیسرے حصے کی باری آئی۔ کنور صاحب نے اسکی تائید کی۔ حکیم شہرت خاں۔ سید شفقت علی۔ شریف حسن اور شاکر بیگ نے بھی اس سے موافقت ظاہر کی۔ لیکن پربھاکر راؤ اور اُن کے احباب نے اسکی بھی مخالفت کی۔ ترمیم کے پاس ہوجانے کے بعد انہیں اب اس معاملہ میں اور سبھی کوششیں بے سود معلوم ہوتی تھیں۔ یہ تینوں اصحاب اُن لوگوں میں تھے۔ جو "سب یا کچھ نہیں" کے اصول پر چلتے ہیں۔ تجویز کا یہ حصہ بھی نامنظور ہوگیا۔

کچھ رات گئے جلسہ برخاست ہُوا۔ جنہیں ہار کا خوف تھا۔ وہ ہنستے ہوئے نکلے۔ جنہیں جیت کا یقین تھا۔ ان کے چہروں پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔

چلتے وقت کنور صاحب نے رستم بھائی سے کہا "یہ آپ لوگوں نے کیا کر دیا ؟"

رستم بھائی نے طنزیہ لہجہ میں کہا "جو آپ نے کیا وہی ہم نے بھی کیا آپ نے گھڑے میں سوراخ کر دیا۔ ہم نے اسے پٹک دیا۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے"۔

سب لوگ چلے گئے۔ اندھیرا گھرا ہو گیا۔ چوکیدار اور مالی بھی پھاٹک بند کر کے چل دیئے۔ لیکن پدم سنگھ وہیں گھاس پر مغموم اور متفکر بیٹھے ہوئے تھے۔



(۲۲)

پدم سنگھ کا دل کسی طرح یہ تسلیم نہ کرتا تھا۔ کہ اس ترمیم کے قبول کرنے میں مجھ سے کوئی غلطی ہوئی۔ انہیں مطلق گمان نہ تھا۔ کہ میرے احباب ایک فروعی بات پر مجھ سے ایسی مخالفت کریں گے۔ انہیں اپنی تجویز کے دو حصوں کے رد ہو جانے کا ملال نہ تھا۔ ملال یہ تھا۔ کہ اس کا الزام انہیں کے سر منڈھا جاتا تھا۔ حالاں کہ انہیں یہ سراسر اپنے معاونین کی تنگ دلی اور ناعاقبت اندیشی معلوم ہوتی تھی۔ اس ترمیم کو وہ ابھی تک ضمنی ہی سمجھتے تھے۔ اس کے ناجائز استعمال کے متعلق جو اندیشے ظاہر کئے گئے۔ ان پر انہیں مطلق اعتماد نہ تھا۔ ان پر اب یہ روشن ہوتا جاتا تھا۔ کہ موجودہ طرز معاشرت کے ہوتے ہوئے اس تجویز سے جو امیدیں کی گئی تھیں۔ اُن کے پورے

ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ کبھی کبھی پچھتاتے تھے۔ کہ میں نے ناحق یہ دردِ سر مول لیا۔ انہیں تعجب ہوتا تھا۔ کہ میں کیونکر اس خارستان میں الجھا۔ اگر اس تجویز کی بے اثری کی ساری ذمہ داری اس ترمیم کے سر جا پڑتی۔ تو وہ اپنے تئیں ایک بارِ عظیم سے سبکدوش سمجھتے۔ پر یہ ہونے والی نہیں۔ اب ساری بدنامی مجھی پر آئے گی۔ مخالفین میرا ہی مضحکہ اُڑائیں گے۔ میرے ہی طرزِ عمل پر نکتہ چینیاں کریں گے۔ اور یہ ساری رسوائی مجھے تنہا برداشت کرنی پڑے گی۔ کوئی میرا دوست نہیں۔ کوئی تشفی دینے والا نہیں بھٹل داس سے اُمید تھی۔ کہ وہ میرے ساتھ انصاف کریں گے۔ میرے روٹھے ہوئے دوستوں کو منا لائیں گے۔ لیکن بھٹل داس نے اُلٹا مجھی کو خطاوار ٹھہرایا۔ پدم سنگھ کے حامیوں میں صرف کنور انردھ سنگھ ہی ایک ایسے آدمی تھے۔ جو اُن کے دلِ پُرغم کو تسلی دیتے رہتے تھے۔

پورے مہینہ بھر پدم سنگھ کچہری نہ جا سکے۔ بس تنہا افسردگی کی حالت میں بیٹھے ہوئے اسی خلجان میں پڑے رہتے تھے۔ ان کے خیالات میں اب ایک خاص رواداری پیدا ہو گئی تھی۔ دوستوں کی مخالفت سے انہیں یہ سبق ملتا تھا۔ کہ جب ایسے بیدار مغز ایسے صائب الرائے اشخاص ایک ذرا سی بات پر اپنے مسلمہ اصولوں سے منحرف ہو سکتے ہیں تو اس قوم کا بیڑا پرماتما ہی پار لگائے۔ مانا کہ میں نے اس ترمیم کے قبول کرنے میں غلطی کی۔ جہالت کی۔ حماقت کی۔ لیکن میری حماقت نے انہیں کیوں کجروی پر مائل کیا؟

پدم سنگھ کو اس کرفت باطن کی حالت میں پہلی بار تجربہ ہُوا۔ کہ عورت میں تشفی اور غمگساری کی کتنی طاقت ہے! اسوقت اگر دنیا میں کوئی انسان تھا۔ جو انکی حالت کو کامل طور پر سمجھتا ہو تو وہ سبھدرا تھی۔ وہ اُس ترمیم کو اس سے کہیں زیادہ ضروری سمجھتی تھی۔ جتنا وہ خود سمجھتے تھے۔ وہ ان کے مخالف دوستوں پر اس سے کہیں زیادہ حرف زنی کرتی تھی۔ جتنی وہ خود کرتے تھے۔ اسکی باتوں سے پدم سنگھ کو بڑی تقویت ہوتی تھی اگرچہ وہ سمجھتے تھے۔ کہ سبھدرا میں ایسی دقیق باتوں کے سمجھنے اور تولنے کا مادہ نہیں ہے۔ اور وہ جو کچھ کہتی ہے۔ وہ میری ہی آوازِ بازگشت ہے۔ تاہم اس علم سے انکی تقویت میں کوئی کمی نہ ہوتی تھی۔

لیکن مہینہ پورا ابھی نہ ہونے پایا تھا۔ کہ پنڈت پربھاکر راؤ نے اپنے اخبار میں اس معاملہ کے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ نکالنا شروع کر دیا۔ ان میں پدم سنگھ پر ایسی پُر معنی چوٹیں ہوتی تھیں۔ کہ وہ پڑھ کر تلملا جاتے تھے۔ ایک مضمون میں حضرت نے پدم سنگھ کے گزشتہ سوانح اور اس ترمیم میں خاص تعلق ثابت کیا۔ ایک دوسرے مضمون میں اُن کے طرزِ عمل پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا۔ "یہ زمانہ حال کے خادمانِ قوم کی حالت ہے۔ جو قوم کو چاہے بھول جائیں پر اپنے تئیں نہیں بھولتے۔ جو قومی خدمت کی آڑ میں اپنا شکار کیا کرتے ہیں۔ قوم کے نوجوان غار میں گریں تو گریں۔ کاشی کے حاجی صاحب کی نظرِ شفقت رہنی چاہیئے۔" پدم سنگھ کو ان جھوٹے اتہام اور کنایوں پر جتنا غصہ آتا تھا۔ اتنا ہی تعجب بھی

ہوتا تھا۔ کہ دررت اس حد تک جا سکتی ہے۔ اس کا تجربہ انہیں اب ہوا۔ یہ حضرت شرافت اور تہذیب کے علم بردار بنتے ہیں۔ لیکن ان کا ظرف اتنا تنگ ہے! اور طرفہ یہ۔ کہ کسی میں اتنی جرأت نہیں۔ کہ ان مضامین کی تردید کرے +

شام کا وقت تھا۔ پدم سنگھ میز کے سامنے بیٹھے ہوئے اس مضمون کا جواب لکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پر کچھ سوجھتا نہ تھا۔ کہ کیا لکھیں۔ کہ اتنے میں سبھدرا نے آکر کہا "گرمی میں یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ چلو باہر بیٹھو"+

پدم سنگھ۔ پربھاکر راؤ نے آج مجھے خوب گالیاں دی ہیں۔ انہیں کا جواب لکھ رہا ہوں +

سبھدرا۔ یہ تمہارے پیچھے کیوں اس طرح پڑا ہوا ہے؟ یہ کہہ کر سبھدرا نے اخبار اُٹھا لیا۔ اور پانچ منٹ میں اس مضمون کو شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا +

پدم سنگھ نے پوچھا "کیسا مضمون ہے؟

سبھدرا۔ یہ کوئی مضمون تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو کھلم کھلا گالی ہے۔ میرا خیال تھا۔ کہ گالیوں کی لڑائی عورتوں ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن دیکھتی ہوں تو مرد ہم سے بھی بڑھے ہوتے ہیں۔ یہ عالم فاضل بھی ہوں گے؟

پدم سنگھ۔ ان کے علم کی تھاہ پانی مشکل ہے۔ دنیا کا سارا علم ان کے قلم میں ہے۔ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر وہ رائے زنی نہ کر سکتے ہوں +

سبھدرا۔ اور اس پر یہ حال!

پدم سنگھ۔ میں اس کا جواب لکھ رہا ہوں۔ ایسی خبر لوں۔ کہ وہ بھی یاد کریں۔ کہ کسی سے پالا پڑا تھا +

سبھدرا۔ مگر گالیوں کا جواب کیا ہوگا؟

پدم سنگھ۔ گالیاں +

سبھدرا۔ نہیں گالیوں کا جواب خموشی ہے۔ گالیوں کا جواب گالی تو جاہل بھی دیتے ہیں۔ پھر اُن میں اور تم میں فرق ہی کیا رہا +

پدم سنگھ نے سبھدرا کو نگاہ عقیدت سے دیکھا۔ اُس کی بات اُن کے دل میں بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی ہمیں اُن لوگوں سے بھی نصیحتیں ملتی ہیں۔ جنہیں ہم اپنے غرور میں کم ہیں سمجھتے ہیں۔ بولے "تو چُپ سادھ لوں"؟

سبھدرا۔ میری تو یہی صلاح ہے۔ اُسے جو جی میں آئے بکنے دو۔ کبھی نہ کبھی وہ ضرور شرمندہ ہوگا۔ بس وہی ان گالیوں کی سزا ہوگی +

پدم سنگھ۔ وہ شرمندہ کبھی نہ ہوگا۔ یہ لوگ شرم کا مرض نہیں پالتے۔ ابھی میں اُن کے پاس جاؤں تو میری بڑی خاطر کریں گے۔ ہنس ہنس کر باتیں کریں گے لیکن شام ہوتے ہی پھر اُن پر گالیوں کا نشہ سوار ہو جائے گا +

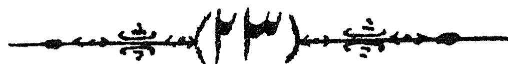
سبھدرا۔ تو کیا ان کا کام دوسروں کی مذمت کرنا ہے؟

پدم سنگھ۔ نہیں کام تو یہ نہیں ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنے خریداروں کی تفریح کے لئے اس قسم کا ایک نہ ایک شگوفہ چھوڑتے رہتے ہیں۔ ایسے سوفیانہ مضامین سے خریداروں کی تعداد میں خوب اضافہ ہوتا ہے۔ پبلک کو ایسے جھگڑوں میں خاص مزہ آتا ہے۔ اور اڈیٹر صاحبان اپنے اعلیٰ فرائض کو بھول کر پبلک کی اس نزاع پسند میلان سے فایدہ اُٹھاتے ہیں۔ پیشوائی کے اعلےٰ رتبہ سے گر کر مخلوق کی بد مذاقیوں کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ بعض اصحاب تو یہاں تک کہنے میں تامل نہیں

کرتے۔ کہ خریداروں کو خوش رکھنا ہمارا فرض ہے ہم ان کا کھاتے ہیں۔ تو انہیں کاٹ کھائیں گے +

سبھدرا۔ تب تو یہ لوگ محض پیسے کے غلام ہیں۔ ان پر غصہ کی بجائے رحم کرنا چاہئے +

پدم سنگھ میز پر سے اُٹھ آئے۔ جواب لکھنے کا خیال ترک کر دیا۔ وہ سبھدرا کو اس قدر فریس نہ سمجھتے تھے۔ انہیں آج تجربہ ہُوا۔ کہ اپنی اعلیٰ تعلیم کے باوجود میں فیاضی طبع میں اسے نہیں پہنچتا۔ یہ ناخواندہ ہو کر بھی مجھ سے کہیں زیادہ بیدار مغز ہے۔ انہیں آج معلوم ہُوا۔ کہ عورت بے اولاد ہو کر بھی شوہر کے لئے اطمینان اور راحت دل کا ایک چشمہ رواں ہے، سبھدرا نے آج اُن کے دل میں ایک نئے جذبۂ الفت کو جگا دیا۔ ایک مہر آہنی۔ جس نے برسوں کی جمی ہوئی کدورت کو صاف کر دیا، انہوں نے اُسے خلوص اور احسان مندی کی نظروں سے دیکھا۔ سبھدرا یہ رمز سمجھ گئی۔ اور اس کا دل مسرت سے سرشار ہو گیا +



سدن جب سمن کو دیکھ کر لوٹا۔ تو اس کی حالت اس غریب آدمی کی سی تھی۔ جس کی برسوں کی جمع کی ہوئی بساط چوروں نے اُڑا لی ہو +

وہ سوچتا تھا۔ سمن مجھ سے بولی کیوں نہیں؟ اُس نے میری تاکا کیوں نہیں؟ کیا وہ مجھے اتنا قابل نفرت سمجھتی ہے؟ نہیں۔ غالباً وہ اپنی پچھلی باتوں پر شرمندہ ہے۔ اور مجھے بھول جانا چاہتی ہے، ممکن ہے۔ اُسے میری شادی کی خبر مل گئی

ہو۔ اور وہ مجھے بے انصاف۔ بے رحم سمجھ رہی ہو۔ اُسے ایکبار پھر سمن سے ملاقات کرنیکی پرزور خواہش ہوئی۔ دوسرے دن وہ بدھوا آشرم کے گھاٹ کی طرف چلا۔ لیکن آدھے راستہ سے لوٹ آیا۔ اُسے خوف ہُوا۔ کہ کہیں شانتا کا ذکر آگیا۔ تو میں کیا جواب دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے سوامی گجانند کی تنبیہ کا بھی خیال آگیا۔

سدن اب کبھی کبھی شانتا کے متعلق اپنے فرائض پر غور کیا کرتا۔ مہینوں تک تمدنی مسائل پر تقریریں سننے کا اس پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ وہ دل میں یہ تسلیم کرنے لگا تھا۔ کہ ہم لوگوں نے شانتا کے ساتھ ضرور بے انصافی کی ہے۔ مگر ابھی تک اس میں وہ قوت عمل نہ پیدا ہوئی تھی۔ جو بدنامی کو حقیر سمجھتی ہے۔ اور ضمیر کی آواز کے سامنے کسی کی پروا نہیں کرتی۔

اِن دنوں اسے کتب بینی اور مطالعہ سے خاص ذوق ہو گیا تھا۔ دال منڈی اور چوک کی سیر سے نفور اس کے منچلے پن نے یہ نئی صورت اختیار کی تھی۔ آریہ سماج کے جلسوں میں اُس نے ایسی کئی تقریریں سُنی تھیں۔ جس میں تہذیب نفس کی اہمیت ظاہر کی گئی تھی۔ اس کا یہ خیال مٹنے لگا تھا۔ کہ مجھے جو کچھ ہونا چاہئے تھا۔ وہ ہو چکا۔ وہاں اسے بتلایا گیا تھا۔ کہ حصول علم تہذیب نفس کی دلیل نہیں۔ تہذیب کے مقابلہ میں علم کی وقعت بہت کم ہے۔ اُسی دن سے سدن اخلاقی تصانیف کا گرویدہ ہو گیا۔ اور روز بروز اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی تھی۔ اسے اب تجربہ ہونے لگا تھا۔ کہ میں کتابی علم کے بغیر بھی دُنیا میں کچھ کام کر سکتا ہوں۔ ان تصانیف میں خواہشات کو زیر کرنے اور نفس کو قابو میں رکھنے

کے لئے جو ہدایتیں کی گئی تھیں۔ انہیں وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بھولتا تھا ۔

وہ میونسپل بورڈ کے اس جلسہ میں موجود تھا۔ جس میں اخراج کی تجویز پیش تھی۔ اس ترمیم کو وہ نہایت مُضر خیال کرتا تھا۔ اور اپنے چچا کی غلطی کو تسلیم کرتا تھا۔ لیکن جب پربھاکر راؤ نے پدم سنگھ پر اعتراضات کی بوچھار شروع کی۔ تو وہ بے اختیار ان کی حمایت پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے دو تین مضامین لکھے اور ڈاک کی معرفت پربھاکر راؤ کے پاس بھیجے۔ کئی دن تک ان کے شایع ہونیکی اُمید کرتا رہا۔ اُسے یقین تھا۔ کہ ان مضامین کے چھپتے ہی ایک شور برپا ہو جائے گا۔ دنیا میں شاید کوئی انقلاب آ جائے گا۔ جونہی ڈاکیہ اخبار لاتا وہ اپنے مضامین کی تلاش میں نگاہیں دوڑاتا۔ لیکن ان کی بجائے اُسے وہی دلآزار اور مذمت آمیز مضامین نظر آتے۔ انہیں پڑھ کر اُس کے دل میں آگ سی جلنے لگتی تھی۔ لیکن آخری مضمون کو پڑھ کر اسے یارائے ضبط نہ رہا۔ اس نے ارادہ کیا۔ کہ اب چاہے جو کچھ ہو۔ اڈیٹر صاحب کی خبر لینی چاہیے۔ اگر ان میں شرافت ہوتی۔ تو وہ میرے مضامین کو ضرور چھاپتے۔ زبان غلط ہی سہی۔ لیکن مضامین دلیلوں سے خالی نہ تھے۔ انہیں چھپا رکھنے سے صاف ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ حضرات واجب و ناواجب کا فیصلہ نہیں کرنا چاہتے۔ صرف عوام کو خوش رکھنے کے لئے کذب و افترا سے کام لے رہے ہیں۔ اس نے اپنے خیالات کسی سے ظاہر نہیں کئے ۔

شام کے وقت ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر "جگت" کے دفتر میں جا پہنچا۔ دفتر بند ہو چکا تھا۔ لیکن پنڈت پربھاکر راؤ اپنے گوشۂ ادارت میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے۔ سدن بے دھڑک اندر جا کر ان کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ پربھاکر راؤ

نے سر اُٹھایا۔ تو ایک قوی ہیکل نوجوان کو ڈنڈ لئے کھڑے دیکھا۔ غصہ سے بولے "آپ کون ہیں؟"

سدن۔ میرا مکان یہیں ہے۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ اتنے دنوں سے پنڈت پدم سنگھ کو گالیاں کیوں دے رہے ہیں؟

پربھاکر راؤ۔ اچھا۔ آپ ہی نے دو تین مضامین میرے پاس نہیں بھیجے تھے؟

سدن۔ جی ہاں۔ میں نے ہی بھیجے تھے۔

پربھاکر۔ تو ان کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آیئے تشریف رکھئے میں تو خود آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ لیکن آپ کا پتہ نہ معلوم تھا۔ آپ کے مضامین نہایت محققانہ اور مدلل ہیں۔ میں انہیں کبھی کا چھاپ دیتا۔ لیکن گمنام مضامین شایع کرنا اصول کے خلاف ہے۔ اس لئے مجبور تھا۔ اسم شریف؟

سدن نے اپنا نام بتلایا۔ اس کا غصہ فرو ہو رہا تھا۔

پربھاکر۔ آپ شرما جی کے بڑے معتقد ہیں۔

سدن۔ میں ان کا بھتیجا ہوں۔

پربھاکر۔ اچھا! تب تو آپ گھر ہی کے آدمی ہیں۔ کہئے شرما جی کا مزاج تو اچھا ہے۔ وہ ادھر عرصہ سے نظر نہیں آتے۔

سدن۔ ابھی تو بخیریت ہیں۔ لیکن آپ کے مضامین کا یہی سلسلہ جاری رہا۔ تو خیر نہیں۔ ان کی کیا حالت ہو۔ آپ ان کے خیر خواہ اور معاون ہو کر اتنے بدظن کیونکر ہو گئے؟

پربھاکر راؤ۔ بدظن ہو گیا! یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ میں اُن سے ذرہ بھر بھی

بدظن نہیں ہوں۔آپ ہم ایڈیٹروں کے فرائض سے غالباً واقف نہیں ہیں۔ ہم عوام کے سامنے اپنا دل کھولکر رکھ دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اپنے دلی جذبات کو پوشیدہ رکھنا ہمارے طرز عمل کے خلاف ہے۔ ہم نہ کسی کے دوست ہیں۔ اور نہ کسی کے دشمن۔ ہم قومی معاملات میں کسی کی غلطیوں کو معاف نہیں کر سکتے۔ اسی لئے۔ کہ ایسا کرنے سے ان غلطیوں کا اثر اور بھی مضرت ناک ہو جاتا ہے۔ پدم سنگھ میرے خاص دوست ہیں۔ اور میں دل سے اُنکی عزت کرتا ہوں مجھے ان سے صرف اصولی اختلاف تھا۔ لیکن پرسوں ہی مجھے ایسے ثبوت ہاتھ آئے ہیں۔ جن سے واضح ہوتا ہے۔ کہ اس ترمیم کے قبول کرنے میں انکی کوئی اور غرض بھی مخفی تھی۔ آپ سے کہنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ کہ کئی ماہ ہوئے انہوں نے سمن بائی نام کی ایک بازاری عورت کو بدھوا آشرم میں خفیہ طور پر داخل کر دیا۔ اور تقریباً ایک ماہ سے اس کی چھوٹی بہن کو بھی اُسی آشرم میں ٹھہرا رکھا ہے۔ میرا دل اب بھی چاہتا ہے۔ کہ یہ خبر غلط ہو۔ لیکن میں بہت جلد کسی اور نیت سے نہیں۔ تو محض اس کی تردید کرانے کے لئے اس خبر کو شایع کر دوں گا +

سدن۔ یہ باتیں آپ سے کس نے کہیں ؟

پربھاکر راؤ۔ یہ میں نہیں بتلا سکتا۔ لیکن آپ شرما جی سے کہہ دیجئے گا۔ کہ اگر یہ بیجا اتہام ہو تو مجھے آگاہ کر دیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے۔ کہ اس تجویز کے بورڈ میں آنے کے پہلے شرما جی روزانہ حاجی ہاشم سے ملنے جاتے تھے۔ ایسی حالت میں آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ کہ میں ان کی نیت کو کہاں تک صاف سمجھ سکتا ہوں +

سدن کا غصّہ ٹھنڈا ہو گیا۔ پربھاکر راؤ کی باتوں نے اسے رام کر لیا۔ وہ دل میں ان کا معتقد ہو گیا۔ اور کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے لوٹ آیا۔ اُسے اب سب سے بڑی فکر یہ تھی۔ کہ کیا شانتا سچ مچ آشرم میں لائی گئی ہے ❖

رات کو کھانا کھاتے وقت اس نے بہت چاہا کہ شرما جی سے اس امر کے متعلق کچھ گفتگو کروں۔ لیکن ہمت نہ پڑی۔ وہ ساری رات مضطرب اور پریشان رہا۔ شانتا آشرم میں کیوں آئی ہے؟ چچا صاحب نے اُسے یہاں کیوں بلایا ہے؟ کیا اماناتھ نے اسے اپنے گھر میں رکھنے سے انکار کیا۔ اسی قسم کے سوالات اس کے دل میں پیدا ہوتے رہے۔ علی الصباح وہ بدھوا آشرم کے گھاٹ کی طرف چلا۔ کہ اگر سمن سے ملاقات ہو جائے۔ تو اس سے ساری حقیقت دریافت کروں۔ اُسے گھاٹ پر بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ کہ سمن آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے پیچھے ایک اور عورت سر جھکائے چلی آتی تھی۔ اس کے چہرہ پر گھونگھٹ پڑا ہُوا تھا ❖

سدن کو دیکھتے ہی سمن ٹھٹک گئی۔ وہ ادھر کئی دنوں سے سدن سے ملنا چاہتی تھی۔ اگرچہ پہلے اس نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا تھا۔ کہ سدن سے کبھی نہ بولوں گی۔ پر اب شانتا کی خاطر اس عہد کو قائم رکھنا محال تھا۔ اس نے شرماتے ہوئے سدن سے کہا "سدن سنگھ آج بڑے نصیبوں سے تمہارے درشن ہوئے۔ تم نے تو ادھر آنا ہی چھوڑ دیا۔ خیریت سے تو ہو؟"

سدن جھینپتا ہُوا بولا۔ "ہاں سب خیریت ہے"❖

سمن۔ دُبلے بہت نظر آتے ہو۔ بیمار تھے کیا؟

سدن۔ نہیں بہت اچھی طرح ہوں۔ مجھے موت کہاں؟

ہم اکثر اپنی خفت مٹانے کے لئے مصنوعی جذبات کی آڑ لیا کرتے ہیں۔ تاکہ ہمارے حال پر دوسروں کو ترس آئے۔

سمن۔ چپ رہو۔ کیسا اشگون زبان سے نکالتے ہو۔ بھلا میں مرنے کو منائی تو ایک بات تھی۔ جس کے کارن یہ سب ہو رہا ہے۔ سدن میں سچ کہتی ہوں۔ اس رام لیلا کی کیکئی میں ہی ہوں۔ خود بھی ڈوبی اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبی۔ کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ مجھے آج تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ معاف کرنا۔ اب میں تمہیں بھیا کہوں گی۔ اب میرا تم سے بھائی بہن کا ناتا ہے۔ میں تمہاری بڑی سالی ہوں۔ اگر کوئی کڑی بات منہ سے نکل جائے۔ تو برا مت ماننا۔ میرا حال تو تمہیں معلوم ہی ہوگا۔ تمہارے چچا صاحب نے اس عذاب سے مجھے رہائی دی۔ اور اب میں آشرم میں پڑی اپنے برے دنوں کو روتی ہوں۔ اور سدا روؤں گی۔ ادھر ایک ماہ سے میری بد نصیب بہن بھی یہاں آ گئی ہے۔ اما ناتھ کے گھر اس کا نباہ نہ ہو سکا۔ شرما جی کو پرماتما ہمیشہ خوش رکھیں۔ وہ خود امولا گئے۔ اور اسے ساتھ لے آئے۔ لیکن یہاں لا کر انہوں نے بھی اسے بھلا دیا۔ میں تم سے پوچھتی ہوں۔ بھلا یہ کہاں کا دستور ہے۔ کہ ایک بھائی چوری کرے۔ اور دوسرا بھائی پکڑا جائے۔ سزا پائے؟ اب تم سے کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ اپنے کھوٹے نصیب سے۔ دنوں کے پھیر سے۔ اپنے پہلے جنم کے پاپوں سے۔ مجھ ابھاگنی نے دھرم کا راستہ چھوڑ دیا۔ اس کی سزا مجھے ملنی چاہئے تھی۔ اور وہ ملی۔ لیکن اس غریب نے کیا خطا کی تھی۔ جس کے لئے تم لوگوں نے اسے ترک کر دیا؟ اس کا جواب تمہیں دینا پڑے گا

دیکھو بزرگوں کی آڑ مت لینا۔ یہ کم ہمت آدمیوں کی عادت ہے۔ سچے دل سے بتلاؤ۔ یہ ظلم تھا یا نہیں؟ اور تم نے کیونکر اس ظلم کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے دیا؟ کیا تمہیں ایک بیکس لڑکی کی زندگی کو ہمیشہ کے لئے خراب کرتے ہوئے ذرا بھی افسوس نہ ہوا؟

اگر شانتا وہاں نہ ہوتی۔ تو شاید سدن اس وقت دل کی باتیں زبان سے نکالنے کی جرأت کر جاتا۔ وہ اس ظلم کو قبول کر لیتا۔ لیکن شانتا کے روبرو وہ یکایک اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہ ہو سکا۔ اس کے ساتھ ہی خاندانی وقار کا سہارا لیتے ہوئے بھی اُسے شرم آتی تھی۔ وہ مُنہ سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکالنا چاہتا تھا۔ جس سے شانتا کو ملال ہو۔ اس کے ساتھ ہی کوئی ایسی بات بھی نہ کر سکتا تھا۔ جو جھوٹی اُمیدیں پیدا کرے۔ اس کی اُڑتی ہوئی نگاہ نے جو شانتا پر پڑی تھی۔ اُسے دُبدھے میں ڈال دیا تھا۔ اُس کی حالت اُس لڑکے کی سی تھی۔ جو کسی مہمان کی لائی ہوئی شیرینی کو للچاتی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ مگر ماں کے خوف سے نکال کر کھا نہیں سکتا۔ بولا۔ "بائی جی۔ آپ نے پہلے ہی میرا مُنہ بند کر دیا ہے۔ اس لئے کیسے کہوں۔ کہ جو کچھ کیا وہ میرے بزرگوں نے کیا۔ میں ان کے سر الزام رکھ کر اپنا گلا چھڑانا نہیں چاہتا۔ اس وقت بدنامی سے میں بھی ڈرتا تھا۔ اتنا تو آپ بھی مانیں گی۔ کہ دنیا میں رہ کر دنیا کی چال چلنی پڑتی ہے۔ میں یہ مانتا ہوں۔ کہ جبر ہوا ہے۔ لیکن یہ جبر ہم نے نہیں کیا۔ وہ اس سماج نے کیا ہے۔ جس میں ہم لوگ رہتے ہیں"۔

سمن۔ بھیا۔ تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ میں تم سے باتوں میں نہیں پیش پا سکتی۔

جو تمہیں مناسب معلوم ہو۔ وہ کرو۔ ظلم ظلم ہی ہے۔ چاہے کوئی ایک آدمی کرے۔ یا ساری ذات کرے۔ دوسروں کے خوف سے کسی پر تم ظلم نہیں کرنا چاہئے۔ شانتا یہاں کھڑی ہے۔ اس لئے میں اس کا راز دل نہیں کھولنا چاہتی لیکن اتنا ضرور کہوں گی۔ کہ دوسری جگہ تمہیں چاہے دولت۔ حسن۔ اور عزت مل جائے پر یہ پریم نہ ملے گا۔ اگر تمہارا ہی جیسا اس کا دل بھی ہوتا۔ تو یہ آج اپنی نئی سسرال میں آرام سے بیٹھی ہوتی۔ لیکن صرف تمہاری محبت نے اُسے یہاں کھینچا۔ تم اُسے جو جی چاہے۔ کہو۔ وہ عمر بھر تمہارے نام پر بیٹھی رہے گی۔

سدن نے دیکھا۔ کہ شانتا کی آنکھوں سے آنسو بہ بہ کر اس کے پیروں پر گر رہے ہیں۔ اُس کا قلب تشنہ درد سے بیتاب ہو گیا۔ نہایت بیکسانہ انداز سے بولا "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کیا کروں۔ ایشور جانتا ہے۔ کہ مجھے کتنا صدمہ ہے۔

سمن۔ تم مرد ہو۔ سب کچھ کر سکتے ہو۔

سدن۔ مجھے جو کچھ کہئے کرنے کو تیار ہوں۔

سمن۔ وعدہ کرتے ہو؟

سدن۔ میرے دل کی جو حالت ہو رہی ہے۔ وہ دل ہی جانتا ہے۔ زبان سے کیا کہوں؟

سمن۔ مردوں کی باتوں پر یقین نہیں آتا۔

یہ کہکر وہ مسکرائی۔ سدن نے شرمندہ ہو کر کہا "اگر اپنے قابو کی بات ہوتی تو اپنا دل نکال کر آپ کو دکھا دیتا"۔

سمن۔ اچھا تو آپ اسی گنگا کے کنارے شانتا کا ہاتھ پکڑ کر کہئے۔ کہ تم میری

بیوی ہو۔ اور میں تمہارا شوہر ہوں۔ میں ہمیشہ تمہاری حفاظت اور پرورش کرونگا۔
سدن کی اخلاقی جرأت نے جواب دیدیا۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ گویا اپنا منہ چھپانے کے لئے کوئی جگہ ڈھونڈ رہا ہے۔ اسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ گنگا مجھے نکلنے کے لئے بڑھی چلی آتی ہیں۔ اس نے ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح آسمان کی طرف دیکھا۔ اور دل میں اپنی بے غیرتی کو محسوس کرتا ہوا۔ رک رک کر بولا۔ سمن مجھے اس کے لئے سوچنے کا موقع دو۔"

سمن نے ملائمت سے کہا۔ "ہاں خوب سوچ لو۔ کوئی ایسی جلدی نہیں ہے میں تمہیں دھرم سنکٹ میں نہیں ڈالنا چاہتی۔"

یہ کہکر وہ شانتا سے بولی۔ "دیکھ تیرا شوہر تیرے سامنے کھڑا ہے۔ مجھ سے جو کچھ کہتے سنتے بنا۔ وہ میں نے کہا سنا۔ لیکن وہ نہیں پسیجتا۔ وہ اب ہمیشہ کے لئے تیرے ہاتھ سے جاتا ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہے۔ اور اس میں کچھ طاقت ہے۔ تو اسے روک لے۔ اور اس سے یہ عہد کرا لے۔"

یہ کہکر سمن گنگا کی طرف چلی۔ شانتا بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ اس کی محبت کو غرور نے زیر کر دیا۔ جس کے نام پر وہ تازیست مصیبتیں جھیلنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جس کے قدموں پر وہ دل میں اپنے تئیں نثار کر چکی تھی۔ اسی سے وہ اس وقت تن بیٹھی۔ اس نے اس کی حالت کو نہ دیکھا۔ اسکی مشکلات پر غور نہ کیا۔ یہ نہ سوچا۔ کہ ابھی وہ اپنا مالک نہیں۔ دوسروں کا محتاج ہے اس وقت اگر وہ سدن کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی۔ تو یقیناً اسکی مرادیں بر آتیں۔ سدن اتنا سنگدل نہ تھا۔ لیکن اس نے التجا کی بہ نسبت غرور کرنا زیادہ

مناسب سمجھا۔

سدن ایک لمحہ وہاں کھڑا رہا۔ اور تب با دلِ مجروح گھر کی طرف چلا۔



سدن دل میں ایسا شرمندہ تھا۔ گویا اس سے کوئی بڑا بھاری گناہ ہو گیا ہو۔ وہ بار بار اپنے الفاظ کو یاد کرتا اور اسی نتیجہ پر پہنچتا۔ کہ میں بڑا بے رحم ہوں۔ دردِ محبت نے اسے وارفتہ بنا دیا تھا۔

وہ سوچتا تھا مجھے دُنیا کا اتنا خوف کیوں ہے؟ دنیا مجھے کیا دیدیتی ہے؟ کیا محض جھوٹھی بدنامی کے خوف سے میں اس نعمت سے دستبردار ہو جاؤں جو معلوم نہیں میرے پہلے جنم کے کتنے نیک کاموں کا ثمرہ ہے۔ اس دولت کو ترک کر دوں۔ جو مجھے ساری دُنیا کی نعمتوں سے مستغنی بنا سکتی ہے۔ اگر راہِ راست پر چلنے کے لئے میرے عزیز او ریگانے مجھے چھوڑ دیں تو کیا پرواہ؟ بدنامی کا خوف اس لئے ہے۔ کہ وہ ہمیں بُرے کاموں سے بچاتا ہے۔ اگر وہ راہِ فرض میں جارج ہو تو اس سے ڈرنا بزدلی ہے۔ اگر ہم کسی بیگناہ پر جھوٹا مقدمہ چلائیں تو دنیا ہمیں بدنام نہیں کرتی۔ وہ اس کام میں ہماری مدد کرتی ہے۔ ہم کو گواہ اور وکیل دیتی ہے۔ ہم کسی کا روپیہ ہضم کر جائیں۔ کسی کی جائداد دبا بیٹھیں۔ تو دنیا ہم کو کوئی سزا نہیں دیتی۔ یا دیتی بھی ہے۔ تو بہت خفیف۔ لیکن ایک ایسے نام کے لئے جس میں گناہ کا شائبہ بھی نہیں۔ وہ ہم کو بدنام کرتی ہے۔ ہمارے ماتھے پر بدنامی کا داغ لگا دیتی ہے۔ ہم کو زندہ درگور کر دیتی ہے۔ دنیا اژدرِ زبانِ خلق

کے خوف سے میں اسے ترک کردوں۔ اسے منجدھار میں ڈوبنے دوں؟ نہیں دنیا جو چاہے کہے۔ مجھ سے یہ ظلم نہ ہوگا ؁

میں مانتا ہوں۔ کہ ماں باپ کا حکم ماننا میرا فرض ہے۔ انہوں نے مجھے پیدا کیا ہے۔ میری پرورش کی ہے۔ باپ کی گود میں کھیلا ہوں۔ ماں کا خون جگر پی کر پلا ہوں۔ میں ان کے اشارے پر زہر کا پیالہ پی سکتا ہوں۔ تلوار کی دھار پر چل سکتا ہوں۔ شعلوں میں کود سکتا ہوں۔ لیکن ان کے ضد یا اصرار پر میرا ہاتھ ایک بے گناہ عورت پر نہ اٹھے گا۔ نہ کہ اس عورت پر جس کے نباہ کا میں نے عہد کیا ہے۔ والدین مجھ سے ضرور ناراض ہو جائیں گے۔ ممکن ہے۔ مجھے ترک کردیں۔ مجھے مردہ سمجھ لیں۔ لیکن کچھ دنوں کے غصہ و غم کے بعد انہیں تسکین ہو جائیگی۔ وہ مجھے بھول جائیں گے۔ زمانہ ان کے زخم کو بھر دے گا ؁

آہ! میں کتنا سنگدل ہوں۔ وہ نازنین جو کسی رنواس کا سنگار بن سکتی ہے۔ وہ حسینہ جو تنویر صبح کی طرح سرور انگیز اور شفق کی طرح شگفتہ ہو۔ میرے روبرو ایک بیکس فریادی کی طرح سر جھکائے کھڑی رہے۔ اور میں ذرا بھی نہ پسیجوں! وہ ایسا موقع تھا۔ کہ میں اس کے پیروں پر سر رکھ دیتا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہتا۔ "دیوی میری خطا معاف کرو۔" گنگا سے گنگا جل لاتا۔ اور اس کے پیروں پر چڑھاتا۔ پر میں پتھر کی مورت کی طرح کھڑا اپنے خاندانی اعزاز کا بے سرا راگ الاپتا رہا۔ وائے نصیب! میری ان یاوہ گوئیوں سے اس کی طبع نازک کو کتنا صدمہ ہوا ہوگا۔ اس کا ثبوت اس کی بے نیازی ہے۔ اس نے مجھے خشک۔ بے مہر۔ متکبر۔ دغاباز سمجھا ہوگا میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ واقعی میں اسی قابل ہوں!

یہ تاسف انگیز خیالات کئی دن تک سدن کے دل کو پامال کرتے رہے۔ آخر اس نے فیصلہ کیا۔ کہ مجھے اپنا جھونپڑا الگ بنانا چاہیئے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیئے اس کے بغیر نباہ ہونا مشکل ہے۔ والدین کے گھر کا دروازہ میرے لئے بند ہے شاید کھٹکھٹانے سے بھی نہ کھلے۔ چچا صاحب مجھے شوق سے لیں گے۔ لیکن ان کے یہاں رہ کر گھر میں بیر کا بیج بونا اچھا نہیں۔ بس میرے لئے اس کے سواء اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔ کہ اپنی کھچڑی الگ پکاؤں +

وہ روز ارادہ کرتا۔ کہ چل کر عذر تقصیر کر آؤں۔ لیکن چلنے کے وقت ہمت جواب دے دیتی۔ دل میں سوال اُٹھتا۔ کس برتے پر؟ گھر کہاں ہے؟

یہ کاوش غم محبت کی خلش سے کم جانکاہ نہ تھی۔ وہ ہر دم اسی فکر میں ڈوبا رہتا کہ کیونکر اس عقدہ کو حل کروں۔ لیکن عقل کچھ کام نہ کرتی۔ اس نے سارے شہر کی خاک چھان ڈالی۔ کبھی دفتروں کی طرف جاتا۔ کبھی بڑے بڑے کارخانوں کے چکر لگاتا۔ اور دو چار گھنٹے گھوم کر لوٹ آتا۔ اس دوڑ دھوپ کے باوجود منزل مقصود کا سواد بھی نہ نظر آتا تھا۔ اب تک اسکی زندگی بیفکری اور لاابالی میں گزری تھی۔ مزاج میں ایک قسم کی متکبرانہ بے نیازی تھی۔ عرض حال کے لئے اس کے لبوں نے کھلنا نہ سیکھا تھا۔ التجا اور منت سے اس کی طبیعت بیگانہ تھی۔ وہ نہ جانتا تھا۔ کہ دنیا کی بارگاہ میں بہت سر جھکانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں اسی کی دعا قبول ہوتی ہے۔ جو پتھر کے بے رحم آستانوں پر ماتھا رگڑنا جانتا ہے۔ جو اپنی ساری دعاؤں کو صرف دربان کر سکتا ہے۔ جو جفاکش ہے۔ جاں نثار ہے۔ ماہر ہے۔ منکسر ہے۔ حلیم ہے۔ جس نے کسی سنیاسی کی طرح غصہ کو جیت لیا ہے۔ جو گوشمالیوں کو احسان

سمجھتا ہے۔ ذلت کو دودھ کی طرح پی جاتا ہے۔ اور جس نے غیرت کو پیروں تلے کچل ڈالا ہے۔ اس دربار میں وہی سرخرو اور کارگزار ہے۔ جو بے زبان ہے۔ بے دلیل ہے۔ بے عذر ہے۔ اسے معلوم نہ تھا۔ کہ وہی اوصاف جو فرشتوں سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ اس دربار میں بے وقعت ہیں۔ وہ ایماندار تھا۔ راست گو تھا۔ بے لوث تھا۔ آزاد تھا۔ جو بات کہتا مُنہ پر۔ لگی لپٹی رکھنا نہ جانتا تھا۔ پر اُسے خبر نہ تھی کہ ان اوصاف کی اخلاقی وقعت چاہے جو کچھ ہو۔ دُنیا کی نگاہ میں سند اور سفارش کی وقعت ان سے کہیں زیادہ ہے۔ سدن کو اب بہت افسوس ہوتا۔ کہ میں نے ناحق اپنی عمر تلف کی، کوئی ایسا ہنر نہ سیکھا۔ جس سے کسب معاش کر سکتا۔ اس طرح کوچہ گردی کرتے کرتے ایک مہینہ گزر گیا۔ اور کاربراری کی صورت نہ پیدا ہوئی۔

اس مایوسی نے رفتہ رفتہ اس میں بیزاری کا جذبہ پیدا کیا۔ اُسے اپنے والدین پر۔ اپنے چچا پر۔ دنیا پر۔ اور اپنے آپ پر غصہ آتا۔ اُسے ارباب ثروت و اختیار سے ایک بغض للّٰہ سا ہو گیا۔ ابھی چند روز قبل وہ خود فٹن پر سیر کرنے نکلتا تھا۔ لیکن اب کسی کو فٹن پر آتے دیکھ کر اُس کا خون اُبلنے لگتا۔ وہ کسی فیشنیبل آدمی کو پیدل چلتے دیکھتا۔ تو خواہ مخواہ اس سے شانہ ملا کر چلتا۔ اور منتظر رہتا۔ کہ یہ ذرا بھی زبان ہلائے۔ تو اس کی خبر لوں۔ بسا اوقات وہ کوچبانوں کی چیخ پکار کی بھی پروا نہ کرتا۔ چھیڑ چھیڑ کر لڑنا چاہتا۔ یہ لوگ بن ٹھن کر ہوا خوری کرنے جاتے ہیں۔ میں ان کا غلام ہوں۔ کہ انہیں راستہ دیتا رہوں!

گھر پر معقول جائداد ہونے کے باعث سدن کو فکر معاش نے کبھی نہ ستایا

تھا۔ والدین نے بھی اسی لئے اس کی تعلیم ضروری نہ سمجھی تھی۔ پر اب دفعتہً جو یہ مسئلہ اس کے سامنے آیا۔ تو اسے معلوم ہُوا۔ کہ میں اسے حل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ اس نے انگریزی نہ پڑھی تھی۔ پر اِدھر اس نے اُردو۔ ہندی کی کافی استعداد حاصل کر لی تھی۔ وہ مہذب طبقہ کو قومی زبانوں سے اُنس نہ رکھنے کے باعث ملک اور قوم کا دشمن سمجھتا تھا۔ جب سے اس کے مضامین 'جگت' میں شایع ہوئے تھے۔ وہ انگریزی خوان فرقہ کو متکبرانہ نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ یہ سب کے سب غرض کے غلام ہیں۔ انہوں نے محض غریبوں کو ٹھگنے کے لئے محض اپنا پیٹ پالنے کے لئے انگریزی پڑھی ہے۔ کوئی وکیل بنا پھرتا ہے۔ کوئی ہرٹیٹ کالر لگائے گھومتا ہے۔ سب کے سب قوم کا خون چوسنے والے ہیں۔ اس پر قوم کے پیشوا بننے کا دعویٰ۔ سب فیشن کے غلام ہیں۔ جن کی تعلیم نے انہیں انگریزوں کا منہ چڑھانا سکھا دیا ہے۔ جن میں دَرد نہیں۔ دھرم نہیں۔ اپنی قومی زبان سے محبت نہیں۔ اخلاقی ہمت نہیں۔ خودداری نہیں۔ قومی آن نہیں۔ یہ بھی کوئی آدمی ہیں؟ ایسے ہی خیالات اُس کے دل میں آیا کرتے تھے۔ لیکن اب جو وہ فکرِ معاش سے دوچار ہُوا۔ تو اُسے معلوم ہُوا۔ کہ میں اس فرقہ سے بیجا طور پر بدظن تھا۔ یہ بیچارے رحم کے قابل ہیں۔ میں ہندی بھاشا کا پنڈت نہ سہی پر بہتیروں سے اچھی بھاشا جانتا ہوں۔ میرے خصائل پاکیزہ نہ ہوں۔ پر بہتیروں سے اچھے ہیں۔ میرے خیالات بلند نہ ہوں۔ پر ایسے نیچے بھی نہیں۔ لیکن میرے لئے سب دروازے بند ہیں۔ میں یا تو کہیں چپراسی ہو سکتا ہوں۔ یا بہت ہوگا۔ تو کانسٹیبل ہو جاؤں گا۔ بس یہی میری ہستی ہے۔ ہمارے ساتھ یہ

کتنی زیادتی ہے! ہم کیسے ہی باسیرت ہوں۔ کتنے ہی فہیم ہوں۔ کتنے ہی بیدار مغز ہوں۔ پر انگریزی زبان سے ناآشنا ہوں۔ تو ان کمالات کی کوئی وقعت نہیں! ہم سے زیادہ بدنصیب اور کون ہوگا۔ جو اس ظلم کو خموشی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔ نہیں۔ بلکہ اس پر غرور کرتے ہیں۔ اس کا جس گاتے ہیں۔ اور اپنی موجودہ حالت پر پھولے نہ سما کر اُسے اپنا وسیلہ نجات سمجھتے ہیں! نہیں۔ مجھے ملازمت کا خیال دل سے نکال ڈالنا چاہئے۔

سدن کی حالت اس آدمی کی تھی۔ جو رات کو جنگل میں بھٹکتا ہوا۔ اندھیری رات پر جھنجھلاتا ہے۔

اسی فکر اور نارسائی کی حالت میں ٹہلتا ہوا۔ وہ ایک دن ندی کے کنارے اس مقام پر جانکلا۔ جہاں بہت سی کشتیاں لگی ہوئی تھیں۔ ندی میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں۔ ادھر اُدھر اٹھلاتی پھرتی تھیں۔ بعض بعض کشتیوں میں سے سریلی تانوں کی صدائیں آرہی تھیں۔ کئی ناؤں پر سے ملاح بورے اُتار رہے تھے۔ سدن ایک ناؤ پر جا بیٹھا۔ کنار دریا کی شاعرانہ لطافت اور شام کی خیال انگیز تنہائی نے اسپر محویت کا عالم طاری کر دیا۔ وہ سوچنے لگا۔ کیسی لطف کی زندگی ہے! کاش میں بھی ساری دُنیا سے الگ۔ ایسے ہی ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا ندی کی لہروں پر چلتا اور خوشی کے راگ گاتا۔ یہیں ندی کے کنارے میری ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہوتی۔ شانتا دروازے پر کھڑی میری راہ دیکھا کرتی اور کبھی کبھی ہم دونوں ناؤ پر بیٹھ کر دریا کی سیر کرتے۔ اس کی رنگین طبیعت نے اس سادہ اور قانع زندگی کی ایسی دلکش تصویر کھینچی۔ کہ وہ وفورِ شوق سے بیتاب

ہو گیا۔ وہاں کی ایک ایک چیز سرور اور شعر میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اٹھا اور ایک ملاح سے پوچھا "کیوں جی چودھری۔ یہاں کوئی ناؤ بکاؤ بھی ہے؟"

ملاح بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ سدن کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ اور اُسے کئی ناویں دکھائیں۔ سدن نے ایک نئی کشتی پسند کی۔ مول جول ہونے لگا۔ کتنے ہی اَور ملاح جمع ہو گئے۔ آخر تین سو روپیہ میں معاملہ طے ہو گیا۔ یہ بھی طے ہو گیا۔ کہ جسکی ناؤ ہے وہی اُسے چلانے کے لئے نوکر ہو گا ؀

سدن گھر کی طرف چلا۔ تو ایسا خوش تھا۔ گویا اُسے زندگی میں اب اور کوئی آرزو نہیں ہے۔ گویا اس نے کسی جنگ میں فتح پائی ہے۔ ساری رات اسکی آنکھوں میں نیند نہیں آئی۔ وہی کشتیاں جو بادبان کھولے افق کی طرف سے چلی آ رہی تھیں۔ اسکی آنکھوں کے سامنے پھرتی رہیں۔ وہی دلفریب نظارے اُسے دکھائی دیتے رہے۔ خیال نے کنارِ دریا پر ایک خوب صورت جھونپڑا تعمیر کیا۔ ہری بھری لتاؤں سے سجا ہوا۔ تب شانتا کی دلاویز تصویر اس میں جلوہ افروز ہوئی جھونپڑا جگمگا اٹھا۔ رفتہ رفتہ یہ جھونپڑا ایک عالی شان محل بنا۔ اس میں ایک پُر فضا باغ سجا۔ اور سدن اس کی کنجوں میں شانتا کے ساتھ محو خرام ہو گیا۔ ایک طرف ندی کا سہانا راگ تھا۔ دوسری طرف چڑیوں کی خوشنوائیاں کی ہمیں جس سے محبت ہوتی ہے۔ اُسے ہم ہمیشہ ایک ہی انداز میں دیکھتے ہیں۔ اُسی انداز میں ہم اسے یاد کرتے ہیں۔ وہی وضع۔ وہی عالم۔ ہمارے لوح دل پر منقوش ہو جاتا ہے۔ سدن شانتا کو اُسی عالم میں دیکھتا تھا۔ جب وہ ایک سادی ساڑھی پہنے۔ سر جھکائے۔ گنگا کے کنارے کھڑی تھی۔ یہ تصویر اس کی آنکھوں

سے نہ اُترتی تھی ÷

سدن کو اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس پیشہ میں سراسر فائدہ ہی فایدہ ہے۔ نقصان کا امکان بھی اس کے ذہن میں نہ آتا تھا۔ سب سے طرفہ بات یہ تھی۔ کہ ابھی تک اُس نے یہ نہ سوچا تھا۔ کہ اتنے روپے کہاں سے آئیں گے

صبح ہوتے ہی اُسے روپوں کی فکر دامنگیر ہوئی۔ کس سے مانگوں ؟ کون دے گا ؟ مانگوں کس بہانہ سے ؟ چچا صاحب سے کہوں ؟ نہیں آج کل وہ خود ہی زیر بار ہیں۔ مہینوں سے کچہری نہیں جاتے۔ اور دادا سے مانگنا تو پتھر سے تیل نکالنا ہے۔ کیا کروں ؟ اگر اس وقت نہ گیا۔ تو چودھری اپنے دل میں کیا کہیگا وہ چھت پر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ منصوبوں کا جو رفیع محل اُس نے ذرا دیر قبل کھڑا کیا تھا۔ پامال ہونے لگا۔ شباب کی اُمید پوال کی آگ ہے۔ جس کے جلنے اور بجھنے میں دیر نہیں لگتی۔ یا کسی نادار کا وقار۔ جو شام کو بنتا اور صبح کو بگڑ جاتا ہے ÷

دفعتہً سدن کو ایک خیال آگیا۔ وہ زور سے کھل کھلا کر ہنسا۔ جیسے کوئی اپنے دشمن کو زمین پر گرا کر بے ہنسی کی ہنسی ہنستا ہے۔ واہ! میں بھی کیسا احمق ہوں۔ میرے صندوق میں میری موہن مالا رکھی ہوئی ہے۔ تین سو سے کچھ زیادہ ہی کی ہوگی۔ کیوں نہ اُسے بیچڈالوں۔ جب کوئی مانگے گا۔ تو دیکھا جائے گا۔ کون مانگتا ہے۔ اور کسی نے پوچھا بھی تو صاف کہدوں گا۔ کہ بیچکر کھا گیا۔ جو کچھ کرنا ہوگا کر لیں گے۔ اور اگر اس وقت تک ہاتھ میں روپے آگئے۔ تو نکال کر پھینک دوں گا۔ اس نے صندوق سے مالا نکالی۔ اور سوچنے لگا کہ اسے کیونکر بیچوں۔ بازار میں کوئی زیور بیچنا۔ اپنی عزت بیچنے سے کم ذلت کی

بات نہیں ہے۔ اسی فکر میں اداس بیٹھا تھا۔ کہ جیتن کہار کمرے میں جھاڑو دینے آیا۔ سدن کو متفکر دیکھ کر بولا۔ "بھیا آج اُداس ہو۔ آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں۔ رات سوئے نہیں کیا؟"

سدن۔ ہاں۔ آج نیند نہیں آئی۔ سر پر ایک فکر سوار ہے +

جیتن۔ ایسی کونسی فکر ہے۔ میں بھی سُنوں +

سدن۔ تم سے کہدوں تو تم ابھی سارے گھر میں دُہائی دیتے پھرو گے +

جیتن۔ بھیا تمہاری ہی غلامی میں عمر بیت گئی۔ ایسا پیٹ کا ہلکا ہوتا۔ تو ایک دن نباہ نہ ہوتا۔ اس سے نشا کھاتر رہو +

جس طرح ایک نادار لیکن بامروت آدمی کے مُنہ سے انکار نکلتا ہے۔ بہت کشش و پیچ۔ بہت معذوری و مجبوری۔ بہت ندامت اور رکاوٹ کے ساتھ۔ اُسی طرح سدن کے مُنہ سے نکلا۔ "میرے پاس ایک موہن مالا ہے۔ اُسے کہیں بیچ دو۔ مجھے روپوں کی ضرورت ہے" +

جیتن۔ تو یہ کون بڑا کام ہے۔ اتنی سی بات کے لئے کیوں پھکر کرتے ہو۔ لیکن روپے لیکر کیا کرو گے؟ مالکن سے کیوں نہیں مانگ لیتے؟ وہ کبھی ناہیں نہ کریں گی۔ ہاں مالک سے کہو گے تو نہ ملے گا۔ اس گھر میں مالک کچھ نہیں ہیں۔ جو ہیں مالکن ہیں +

سدن۔ میں گھر میں کسی سے نہیں مانگنا چاہتا +

جیتن نے مالا لیکر دیکھی۔ اُسے ہاتھوں سے تولا۔ اور شام تک اُسے بیچ لانے کا وعدہ کر کے چلا گیا + مگر وہ بازار نہ گیا۔ بلکہ وہ سیدھا اپنی کوٹھڑی کی طرف

چلا۔ دونوں کیواڑ بند کر لئے۔ اور اپنی کھاٹ کے نیچے کی زمین کھودنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ایک مٹی کی ہانڈی نکل آئی۔ یہی اس کی عمر بھر کی کمائی تھی۔ ساری زندگی کی کفایت شعاری۔ بخل۔ قطع و برید۔ بددیانتی۔ دلالی۔ گول مال اسی ہانڈی کے اندر ان روپوں کی صورت میں بند تھا۔ شاید اسی وجہ سے روپے کے چہرے بھی داغدار اور سیاہ ہو گئے تھے۔ لیکن مدت العمر کے گناہوں کا کتنا مختصر نتیجہ تھا! گناہ کتنے سستے بکتے ہیں +

جنتن نے روپے گن کر بیس بیس کی ڈھیریاں لگائیں۔ کل ستر ڈھیریاں تھیں۔ تب اس نے ترازو پر ملنے کو روپوں سے تولا۔ پندرہ روپیہ سے کچھ زیادہ وزن تھا۔ سونے کا نرخ بازار میں چڑھا ہوا تھا۔ پر اس نے ایک تولہ کی قیمت پچیس ہی روپے قائم کی۔ پھر پچیس پچیس روپیوں کی ڈھیریاں بنائیں۔ تیرہ گڈیاں ہوئیں۔ اور پندرہ روپے بچ رہے۔ اس کے کل روپے مالے کی قیمت سے ۳۵ روپے کم تھے۔ اُس نے دل میں کہا۔ اب یہ سودا ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔ کہدوں گا۔ مالا تیرہ ہی روپے بھر تھی۔ ۱۵ روپے اور بچ جائیں گے چلو مالا رانی! تم اس ڈربے میں آرام سے بیٹھو +

ہانڈی پھر زمین کے نیچے چلی گئی۔ ثمرۂ گناہ اور بھی مختصر ہو گیا +

جنتن اس وقت مارے خوشی کے اچھلا پڑتا تھا۔ اس نے بات کی بات میں پچاس روپوں پر ہاتھ مارا تھا۔ ایسا موقع اُسے زندگی میں کبھی نہ ملا تھا۔ اس نے سوچا۔ آج ضرور کسی بھلے آدمی کا مُنہ دیکھ کر اُٹھا تھا۔ بگڑی ہوئی آنکھوں کی طرح بگڑے ہوئے ایمان میں بھی روشنی کا گزر نہیں ہوتا +

دس بجے۔ جیتن نے ۲۲۵ روپے لاکر سدن کے ہاتھ میں رکھے۔ سدن کو گویا پڑا ہُوا دھن ملا۔

روپے دے کر جیتن نے بے غرضانہ انداز سے مُنہ پھیرا۔ سدن نے پانچ روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے اور بولا۔ "یہ تو تمباکو پینا"۔

جیتن نے ایسا مُنہ بنایا جیسے کوئی بھگت شراب کا پیالہ دیکھ کر جھجکتا ہے۔ اور بولا۔ "بھیا تمہارا دیا تو کھاتا ہی ہوں۔ یہ کہاں بچیں گے"؟

سدن۔ نہیں نہیں۔ میں خوشی سے دیتا ہوں۔ لے لو۔ کوئی ہرج نہیں ہے"۔

جیتن۔ نہیں بھیّا یہ نہ ہوگا۔ ایسا کرتا تو اب تک چار پیسے کا آدمی ہو جاتا۔ نارائن تمہیں بنائے رکھے۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ سدن کو یقین ہو گیا۔ کہ یہ بڑا ایماندار اور نیک نیت آدمی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ سلوک کروں گا۔

شام کو سدن کی ناؤ گنگا کی لہروں پر اس طرح چل رہی تھی۔ جیسے آسمان پر بادل چلتے ہیں۔ لیکن اس کے چہرہ پر مسرت کی شگفتگی کے بجائے فکر فردا کی جھلک نمایاں تھی۔ جیسے کوئی طالب علم کامیابی کا تمغہ حاصل کرنے کے بعد فکر میں ڈوب جاتا ہے۔ اُسے تجربہ ہوتا ہے۔ کہ اب تک جو باندھ مجھے دنیا کے سیلاب سے بچائے ہوئے تھا۔ وہ ٹوٹ گیا ہے۔ اور میں اتھاہ ندی میں کھڑا ہوں۔ سدن سوچ رہا تھا۔ میں نے ناؤ تو ندی میں ڈالدی۔ لیکن یہ پار بھی لگے گی! اُسے اب معلوم ہو رہا تھا۔ کہ پانی گہرا ہے۔ ہوا تیز ہے۔ اور زندگی کا سفر اتنا خوشگوار نہیں ہے۔ جتنا میں سمجھتا تھا۔ لہریں اگر میٹھے سُروں میں گاتی

ہیں۔ تو خوفناک آواز سے گرجتی بھی ہیں۔ ہوا اگر لہروں کو تھپکیاں دیتی ہے۔ تو کبھی کبھی اُنہیں اُچھال بھی دیتی ہے ⁂

(۲۵)

پربھاکر راؤ کا غصہ کچھ تو سدن کے مضامین سے فرو ہو گیا تھا۔ اور جب پدم سنگھ نے سدن کے اصرار سے سمن کی پوری سرگزشت انہیں لکھ بھیجی۔ تو وہ مطمئن ہو گئے ⁂

اخراج کی تجویز کو منظور ہوئے تین ماہ گزر گئے۔ لیکن اس کی ترمیم کے متعلق تیغ علی اور دیگر اصحاب کو جو اندیشے تھے۔ وہ باطل ثابت ہوئے۔ نہ دال منڈی کے بالاخانوں پر دُکانیں ہی آراستہ ہوئیں۔ اور نہ ارباب نشاط نے رشتۂ عقد ہی سے کوئی خاص دلچسپی ظاہر کی۔ ہاں کئی بالاخانے خالی البتہ ہو گئے اُن کے مکینوں نے اخراج کے خوف سے دوسری جگہ رہنے کا انتظام کر لیا۔ کسی قانون کی خلاف ورزی کے لئے اس سے زیادہ نظام بندیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جتنی کہ اس کے اجرا کے لئے۔ پربھاکر راؤ کی طمانیت خاطر کا یہ دوسرا سبب تھا ⁂

پدم سنگھ نے اس تجویز کو تحریک نفرت سے ہاتھ میں لیا تھا۔ لیکن اس مسئلہ پر غور کرتے کرتے انکی نفرت بہت کچھ انسانیت اور ہمدردی کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ انہیں جذبات نے انہیں ترمیم سے متفق ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ سوچتے یہ بیچاریاں نفسانی خواہشات کا شکار ہو رہی ہیں۔ نشۂ ہوس نے

انکی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ ایسی حالت میں ان کے ساتھ رحم اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اگر اُن پر ستم روا رکھا گیا۔ تو انکی قوت اصلاح اور بھی زائل ہو جائے گی۔ اور جن روحوں کو ہم نصیحت سے۔ محبت سے۔ تعلیم سے۔ تشفی سے بچا سکتے ہیں۔ وہ بھی ہمیشہ کے لئے ہمارے قابو سے نکل جائیں گے + ہم جو خود مکروہات کے غلام ہیں۔ انہیں سزا دینے کا کوئی مجاز نہیں رکھتے۔ اُن کے فعل ہی انہیں کیا کم ذلیل و خوار کر رہے ہیں۔ کہ ہم اُن پر یہ ستم کر کے انکی زندگی کو اور بھی خراب و خستہ کریں!

خیالات فعل کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ پدم سنگھ نے جھجھک۔ اور پس و پیش کو ترک کر کے دائرہ عمل میں قدم رکھا۔ وہی شخص جو سمن کے سامنے سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اب دن دوپہر دال منڈی کے بالاخانوں پر بیٹھا نظر آنے لگا + اُسے اب زبان خلق کا خوف نہ تھا۔ تضحیک اور تحقیر کا اندیشہ نہ تھا۔ اُس کا ضمیر جاگ اٹھا تھا۔ اس کے دل میں سچی خدمت کا جوش پیدا ہو گیا تھا۔ کچا پھل پتھر مارنے سے بھی نہیں گرتا۔ لیکن پک کر وہ خود بخود زمین کی طرف مائل ہو جاتا ہے +

بٹھل داس اس معاملہ میں پدم سنگھ سے متفق نہ ہو سکے۔ انہیں ایسی ارواح خبیثہ کی اصلاح پر اعتماد نہ تھا + سید شفقت علی بھی جو اس ترمیم کے موجد تھے۔ پدم سنگھ سے کنی کاٹ گئے۔ اور کنور صاحب کو تو اپنے سرود و ستار۔ سیر و بہار ہی سے فرصت نہ تھی۔ صرف سوامی گجانند نے پدم سنگھ کی مدد کی اور کامل طریق پر۔ اس نفس پاک نے اپنے تئیں خدمت پر قربان کر دیا تھا +

(۲۶)

ایک مہینہ گزر گیا۔ سدن نے اپنے اس نئے مشغلہ کا ذکر گھر میں کسی سے نہ کیا۔ وہ روز سویرے اُٹھتا اور گنگا اشنان کرنے کے بہانہ سے چلا جاتا۔ وہاں سے دس بجے گھر آتا۔ کھانا کھا کر پھر چل دیتا۔ اور تب کا گیا گیا گھڑی رات گئے لوٹتا۔ اب اسکی ناؤ گھاٹ پر کی سب ناؤں سے زیادہ سجی ہوئی خوش نما تھی۔ اس پر دو ایک مونڈھے رکھے رہتے تھے۔ اور ایک فرش بچھا رہتا تھا۔ اس لئے شہر کے اکثر تفریح پسند لوگ اُس پر سیر کیا کرتے تھے۔ سدن کرایہ اور مزدوری کی بابت خود کچھ بات چیت نہ کرتا۔ یہ سب اس کا ملازم ملاح جھینگر کیا کرتا تھا۔ وہ کبھی تو کنارے ایک تخت پر بیٹھا رہتا۔ یا کسی کشتی پر جا بیٹھتا۔ وہ اپنے تئیں اکثر سمجھاتا۔ کہ کام کرنے میں کیا شرم؟ میں نے کوئی بُرا کام تو نہیں کیا ہے۔ کسی کا غلام تو نہیں ہوں۔ کوئی مجھے آنکھیں تو نہیں دکھا سکتا۔ ایمان درست رہنا چاہیئے۔ لیکن جونہی وہ کسی شریف آدمی کو اپنی کشتی کی جانب آتے دیکھتا۔ خود بخود اس کے قدم پیچھے ہٹ جاتے۔ اور شرم سے آنکھیں جُھک جاتیں۔ وہ ایک زمیندار کا لڑکا تھا۔ اور ایک وکیل کا بھتیجا۔ اس درجہ سے اُتر کر اب ملاح کا پیشہ کرنے میں اُسے فطرتاً ایک ذلت محسوس ہوتی تھی۔ اور اُسے استدلال کا کوئی پہلو دور نہ کر سکتا تھا۔ اس بیہودہ شرم سے اس کا بہت نقصان ہو جاتا تھا۔ جس کام کے لئے وہ آسانی سے ایک روپیہ وصول کر سکتا تھا۔ اسی کے لئے اسے اِس سے نصف میں راضی ہونا پڑتا تھا۔ اونچی

دُکان پکوان پھیکے ہونے پر بھی بازار میں ممتاز ہوتی ہے۔ یہاں تو پکوان اچھے تھے۔ صرف ایک سجیلے دُکاندار کی ضرورت تھی۔ وضع و قطع ہر ایک پیشہ میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ آپ کسی سفید پوش حجام کو معمولی سے زیادہ اُجرت دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کسی خوش وضع یکہ بان کو خواہ مخواہ اُجرت سے کچھ زیادہ ہی دے آتے ہیں۔ سدن اس نکتہ کو سمجھتا تھا۔ پر طبیعت سے مجبور تھا۔ تاہم اوسطاً اسے ڈیڑھ دو روپے روز مل جاتے تھے۔ اور اب وہ زمانہ قریب آتا جاتا تھا۔ جب ندی کنارے اس کا جھونپڑا بنے گا۔ اور آباد ہوگا۔ وہ اب اپنے بل بوتے پر کھڑے ہونے کے قابل ہوتا جاتا تھا۔ اس خیال سے اس کی غیر تمیز طبیعت مخمور ہو جاتی تھی۔ وہ اکثر رات کی رات انہیں آرزوؤں کا خواب دیکھنے میں کاٹ دیتا تھا ◆

اسی اثنا میں میونسپل بورڈ نے ارباب نشاط کے لئے شہر سے ذرا ہٹ کر مکانات تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ لالہ بھگت رام کو اس کام کا ٹھیکہ ملا۔ انہیں اس پار کوئی ایسی زمین نہ مل سکی۔ جہاں وہ اینٹ کے پژادے لگاتے اور چونے کے بھٹے بناتے۔ اس لئے انہوں نے ندی پار زمین لی تھی۔ اور سب سامان وہیں تیار کرتے تھے۔ اس پار سے ان چیزوں کو لانے کے لئے انہیں ایک ناؤ کی ضرورت ہوئی۔ وہ ناؤ طے کرنے کے لئے ندی کنارے آئے۔ سدن سے ملاقات ہوگئی۔ سدن نے اپنی ناؤ دکھائی۔ بھگت رام نے پسند کی۔ جھینگر سے مزدوری طے ہوئی۔ دو کھیوے روز لانے کا وعدہ ہوا۔ بھگت رام نے بیعانہ دیا۔ اور چلے گئے ◆

روپیہ کی چاٹ بُری ہوتی ہے۔ سدن اب وہ اُڑاؤ۔ لٹاؤ۔ فضول خرچ نوجوان نہیں تھا۔ اس کے سر پر اب فکروں کا بوجھ ہے۔ قرض کا قرض ہے۔ وہ اس بار سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ اُس کی نگاہ ایک ایک پیسے پر رہتی ہے۔ اسے اب روپیہ کے کمانے اور گھر بنوانے کی دھن ہے۔ اس دن وہ گھڑی رات رہے اُٹھ کر ندی کنارے پر چلا آیا۔ اور جھینگر کو جگا کر ناؤ کھلوادی۔ دن نکلتے نکلتے اس پار جا پہنچا۔ واپسی کے وقت اُس نے خود ڈانڈا لے لیا۔ اور ہنستے ہوئے دو چار ہاتھ چلائے۔ مگر جب کشتی کی چال میں نمایاں فرق دیکھا۔ تو اس نے زور زور سے ہاتھ چلانے شروع کئے۔ شہزور آدمی تھا۔ کشتی کی رفتار دونی ہوگئی۔ جھینگر پہلے تو مسکراتا رہا۔ لیکن اب حیرت میں آگیا۔ آج سے وہ سدن کا دباؤ کچھ زیادہ ماننے لگا۔ اُسے معلوم ہوگیا۔ کہ یہ بابو صاحب نرے مٹی کے لوندے نہیں ہیں۔ کام پڑنے پر یہ اکیلے ہی کشتی کو پار لے جا سکتے ہیں۔ اور اب مجھے زیادہ اترانے کی گنجائش نہیں ہے۔

اُس دن دو کھیوے ہوئے۔ دوسرے دن ایک ہی ہُوا۔ کیونکہ سدن کو آنے میں دیر ہوگئی۔ تیسرے دن اُس نے نو بجے رات کو تیسرا کھیوا پورا کیا۔ لیکن پسینہ میں ڈوبا ہُوا تھا۔ ایسا تھک گیا تھا۔ کہ گھر تک آنا پہاڑ ہوگیا۔ اسی طرح متواتر دو ماہ تک اس نے کام کیا۔ اور اُسے خاصا نفع ہُوا۔ اُس نے دو ملاح اور رکھ لئے۔

سدن اب ملاحوں کا سرغنہ تھا۔ اُس کا جھونپڑا تیار ہوگیا تھا۔ اندر ایک تخت تھا۔ دو پلنگ۔ دو لیمپ۔ کچھ معمولی برتن۔ ایک کمرہ بیٹھنے کا تھا

ایک کھانا پکانے کا۔ ایک سونے کا۔ دروازہ پر اینٹوں کا ایک چبوترہ تھا۔ اس کے اردگرد گملے رکھے ہوئے تھے۔ دو ناندوں میں بیلیں لگی ہوئی تھیں۔ جس کی لتائیں جھونپڑے کے اوپر چڑھتی آتی تھیں۔ یہ چبوترہ اب ملاحوں کا اڈا تھا۔ وہ اکثر یہیں بیٹھے تمباکو پیا کرتے تھے۔ سدن نے ان کے ساتھ ایک بڑا سلوک کیا تھا۔ حکام سے خط وکتابت کر کے اُس نے انہیں آئے دن کی بیگار سے نجات دلوا دی تھی۔ اس دلیرانہ طرز عمل نے اس کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اُس کے پاس کچھ روپے جمع ہو گئے تھے۔ اور وہ ملاحوں کو ضرورت پر بلا سود کے قرض دے دیا کرتا تھا۔ اُسے اب ایک بائسکل کی فکر تھی۔ شوقین اصحاب کی تفریح کے لئے وہ ایک بجرا بھی لینا چاہتا تھا۔ اور ہارمونیم کے لئے تو اس نے فرمائش بھی لکھ بھیجی تھی۔ وہ اس دیوی کے استقبال کی تیاریاں کر رہا تھا۔ جو اس کاشانے کو رشک فردوس بنائیگی۔

سدن کی حالت بیشک ایسی ہو گئی تھی۔ کہ وہ خانہ داری کا بار اُٹھا سکے لیکن چچا کی مرضی کے بغیر وہ شانتا کو لانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ وہ گھر پر شرما جی کے ساتھ کھانے بیٹھتا۔ تو دل میں مصمم ارادہ کر لیتا۔ کہ آج اس معاملہ کو طے کر دوں گا۔ لیکن عین موقعہ پر ناطقہ دغا دے جاتا۔ بات مُنہ سے نہ نکل سکتی۔ اگرچہ اُس نے پدم سنگھ سے خود اپنی کشتی رانی کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن انہیں لالہ بھگت رام سے سب حالات معلوم ہو گئے تھے۔ وہ سدن کی اس حرفت پسندی پر دل میں بہت خوش تھے۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ دو کشتیاں اور لے لی جائیں۔ اور کاروبار بڑھا دیا جائے لیکن چونکہ سدن خود کچھ نہیں

کہتا تھا۔ تو وہ بھی اس معاملہ میں خاموش رہنا مناسب سمجھتے تھے۔ وہ پہلے ہی سے اُسکی خاطر کرتے تھے۔ اب کچھ عزت بھی کرنے لگے۔ اور سُبھدرا کے برتاؤں میں تو اب واضح فرق ہو گیا تھا۔ وہ اب اسے لڑکے کی طرح چاہنے لگی تھی +

ایک روز رات کو سدن اپنے جھونپڑے میں بیٹھا ہُوا ندی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آج نہ جانے کیوں ناؤ کے آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ سامنے لیمپ جل رہا تھا۔ سدن کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا پر اُس کا جی پڑھنے میں نہ لگتا تھا۔ ناؤ کے نہ آنے سے اُسے کسی سانحہ کا اندیشہ ہوتا تھا۔ اس نے اخبار رکھ دیا۔ اور باہر نکل آیا۔ ریت پر چاندنی کا سنہرا فرش بچھا ہُوا تھا۔ اور چاند کی شعائیں سطح ساکت پر ایسی معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے کسی وادیٔ تاریک میں سے شفاف پانی کا چشمہ بتدریج چوڑا ہوتا ہُوا نکلتا ہے۔ چبوترے پر کئی ملّاح بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ دفعتہً سدن نے دو عورتوں کو شہر کی جانب سے آتے دیکھا۔ اُن میں سے ایک نے ملّاحوں سے پوچھا۔ "ہم کو اس پار جانا ہے۔ کوئی ناؤ لے چلے گا؟"

سدن نے آواز پہچانی۔ یہ سمن تھی۔ سدن کے سینہ میں ایک گُدگُدی سی ہوئی۔ آنکھوں میں ایک سرور سا آیا۔ وہ لپک کر چبوترے کے پاس آیا۔ اور سمن سے بولا۔ "بائی جی۔ تم یہاں کہاں؟"

سمن نے غور سے سدن کی طرف دیکھا۔ گویا اسے پہچانتی ہی نہیں۔ اس کے ساتھ والی عورت نے گھونگھٹ بڑھا لیا۔ اور لالٹین کی روشنی سے کسی

قدم ہٹ کر اندھیرے میں چلی گئی۔ سمن نے تعجب سے کہا "کون۔ سدن؟"
ملاحوں نے اُٹھ کر گھیر لیا۔ لیکن سدن نے کہا "تم لوگ جاؤ۔ یہ ہمارے گھر کی عورتیں ہیں۔ آج یہیں رہیں گی"۔ اس کے بعد وہ سمن سے بولا۔ "بائی جی۔ خیریت تو ہے۔ کیا ماجرا ہے؟"

سمن۔ سب خیریت ہے۔ بھاگ میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہی بھوگ رہی ہوں۔ آج کا اخبار تم نے ابھی نہ پڑھا ہوگا۔ پربھاکر راؤ نے نہ جانے کیا چھاپ دیا کہ آشرم میں ہلچل مچ گئی۔ ہم دونوں وہاں ایک دن بھی اور رہ جاتیں تو آشرم بالکل خالی ہو جاتا۔ وہاں سے نکل بھاگنا ہی مصلحت تھی۔ اب اتنی عنایت کرو کہ ہمیں اس پار لے جانے کے لئے ایک ناؤ ٹھیک کر دو۔ وہاں ہم یکہ کرکے مغلسرائے چلی جائیں گی۔ امولا کے لئے کوئی نہ کوئی گاڑی مل ہی جائے گی۔ یہاں سے رات کو کوئی نہیں جاتی۔

سدن۔ اب تو تم اپنے گھر ہی پہنچ گئیں۔ امولا کیوں جاؤ گی؟ تم لوگوں کو تکلیف تو بہت ہوئی۔ پر اس وقت تمہارے آنے سے مجھے جتنی خوشی ہوئی۔ وہ بیان نہیں کر سکتا۔ میں خود کئی دن سے ارادہ کر رہا تھا۔ کہ تمہارے پاس آؤں لیکن کام سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ میں تین چار مہینہ سے ملاحی کا پیشہ کرنے لگا ہوں۔ یہ تمہارا جھونپڑا ہے۔ چلو اندر چلو۔

سمن اندر گئی لیکن شانتا وہیں اندھیرے میں چُپ چاپ سر جھکائے کھڑی رہی۔ جب سے اس نے سدن سنگھ کی زبان سے اس کا دلشکن فیصلہ سُنا تھا۔ اُس دُکھیا نے رو رو کر دن کاٹے تھے۔ اُسے بار بار اپنے غرور پر

افسوس ہوتا۔ وہ سوچتی اُسوقت اگر میں اُن سے منت کرتی۔ تو انہیں مجھ پر ضرور رحم آجاتا۔ سدن کی صورت اس کی آنکھوں میں پھرتی۔ اور اس کی باتیں کانوں میں گونجتی تھیں۔ باتیں دلشکن تھیں۔ لیکن شانتا کو ان میں ہمدردی اور محبت کی بو آتی تھی۔ اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا۔ کہ یہ سب میری کھوٹی تقدیر کا پھل ہے۔ سدن کا بالکل قصور نہیں۔ وہ سچ مچ مجبور ہیں۔ اپنے ماں باپ کی بات ماننی ان کا فرض ہے۔ یہ میرا کمینہ پن ہے کہ انہیں فرض کے راستہ سے ہٹانا چاہتی ہوں۔ ہائے میں نے اپنے سوامی سے غرور کیا۔ اپنی سفلہ غرض کی دھن میں ان کی بے عزتی کی۔ جوں جوں دن گزرتے تھے شانتا کی روحانی کلفت بڑھتی جاتی تھی۔ اس غم۔ فکر اور صدمہ فراق سے وہ نازنین اس طرح سوکھ گئی تھی۔ جیسے جیٹھ میں ندی سوکھ جاتی ہے +

سمن جھونپڑے میں چلی گئی۔ تو سدن آہستہ آہستہ شانتا کے سامنے آیا۔ اور کانپتے ہوئے بولا "شانتا!" یہ کہتے کہتے اُس کا گلا پھنس گیا +

شانتا سرورِ الفت سے سرشار ہو گئی۔ اس نے دل میں کہا۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ معلوم نہیں زندہ رہوں۔ نہ رہوں۔ ان کے درشن پھر ہوں یا نہ ہوں۔ ایکبار ان کے قدموں پر سر رکھ کر رونے کی آرزو کیوں دل میں رہ جائے۔ اس سے بہتر اور کون سا موقعہ ملے گا؟ یہ ایکبار مجھے اپنے ہاتھوں سے اُٹھا کر میرے آنسو پونچھ دیں گے۔ تو مجھے تسکین ہو جائیگی۔ میرا جنم سُپھل ہو جائے گا۔ میں جب تک جیونگی اسی خوبی قسمت کو یاد کر کے اپنے دل کو خوش کرونگی۔ مجھے تو یہ امید بھی نہ تھی۔ کہ کبھی تمہارے درشن

پاؤں گی۔ لیکن جب ایشور نے وہ دن دکھایا تو دل کی حسرت کیوں باقی رہے۔ زندگی کے صحرائے خشک میں یہ ہرا بھرا درخت مل گیا ہے۔ تو کیوں نہ اس کے سایہ میں دم لے کر اپنے دل سوزاں کو ٹھنڈا کر لوں +

یہ سوچکر شانتا روتی ہوئی سدن کے پیروں پر گر پڑی۔ لیکن ٹوٹا ہوا دل ان جذبات کا بار نہ سنبھال سکا۔ مرجھایا ہوا پھول ہوا کا جھونکا لگتے ہی ریزہ ریزہ ہو گیا۔ سدن جھکا۔ کہ اُسے اُٹھا کر سینے سے لگائے چمٹائے۔ لیکن شانتا کی حالت دیکھ کر بے اختیار اس کے جگر سے ایک صدائے درد نکل آئی۔ جب اس نے پہلے دریا کے کنارے دیکھا تھا۔ تو وہ حسن کی ایک نوشگفتہ کونپل تھی۔ پر آج وہ ایک برگ خزاں رسیدہ تھی۔ خشک اور زرد!

سدن کا دل دریا میں چمکتی ہوئی چاند کی کرنوں کی طرح تھرتھرا رہا تھا اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس تن بے جاں کو اُٹھا لیا۔ خلوص درد میں اسے ایشور کی یاد آئی۔ روتے ہوئے بولا ”ایشور مجھ سے بڑا گناہ ہوا ہے میں نے ایک نرم اور نازک دل کو بڑی بیدردی سے مسلا ہے۔ لیکن اس کی یہ سزا بہت سخت ہے۔ تم رحیم ہو۔ مجھ پر رحم کرو“+

شانتا کو سینہ سے لگائے ہوئے سدن جھونپڑے میں گیا۔ اور اُسے پلنگ پر لٹا کر بیکسانہ انداز سے بولا ”سمن دیکھو۔ یہ کیسی ہوتی جا رہی ہیں میں ڈاکٹر کے پاس دوڑا جاتا ہوں“+

سمن نے قریب آکر بہن کو دیکھا۔ پیشانی پر پسینہ کے قطرے نمودار تھے۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ نبض کا پتہ نہیں۔ چہرہ پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ اُس

نے فوراً پنکھا اُٹھالیا۔ اور جھلنے لگی وہ غصہ جو مہینوں سے اس کی حالت دیکھ دیکھ کر اس کے دل میں جمع ہو رہا تھا۔ پھوٹ نکلا۔ سدن کی طرف ملامت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولی "یہ تمہارے ظلم کا پھل ہے۔ یہ تمہاری کرنی ہے۔ تمہارے ہی بیرحم ہاتھوں نے اس پھول کو اتنی بیدردی سے مسلا ہے۔ تمہارے ہی پیروں نے اس پودے کو اتنی بیرحمی سے کچلا ہے۔ تو اب تمہارا گلا چھوٹا جاتا ہے۔ سدن جس دن سے تم نے زہریلے تیروں سے اسے مارا اُس دن سے اس غریب نے سر نہیں اُٹھایا۔ اس کے ہونٹوں پر کبھی ہنسی نہیں آئی۔ اسکی آنکھیں کبھی خشک نہیں ہوئیں۔ بہن گلا دبانے سے دو چار لقمے کھالیا کرتی تھی۔ اور تم نے یہ سزا اُسے صرف اس لئے دی۔ کہ وہ میری بہن ہے۔ حالانکہ میرے ہی پیروں پر تم نے برسوں ناک رگڑی ہے۔ میرے تلوے تم نے برسوں سہلائے ہیں۔ میری ناپاک محبت میں تم برسوں متوالے رہے ہو۔ اس وقت بھی تو تم اپنے ماں باپ کے سعادتمند بیٹے تھے۔ یا کوئی اور تھے؟ اسوقت بھی تو تم اسی اونچے خاندان کے چراغ تھے۔ یا کوئی اور تھے؟ تب تمہاری ناپاک حرکتوں سے خاندان کی ناک نہ کٹتی تھی؟ آج تم آکاش کے دیوتا بنے پھرتے ہو! اندھیرے میں جھوٹا کھانے سے پرہیز نہیں۔ اُجالے میں دعوت سے بھی انکار یہ نری مکاری ہے۔ نری دغابازی۔ جیسا تم نے اس اناتھ کے ساتھ کیا ہے۔ اس کا پھل تمہیں ایشور کے یہاں سے ملے گا۔ اس کو تو جو بھگتنا تھی بھگت چکی۔ آج نہ مری کل مر جائے گی۔ لیکن تم اسے یاد کر کے روؤ گے کوئی دوسری عورت ہوتی۔ تو تمہاری باتیں سن کر پھر تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر

بھی نہ دیکھتی۔ لیکن یہ غریب سدا تمہارے نام پر مرتی رہی۔ لاؤ تھوڑا سا ٹھنڈا پانی" +

سدن مجرم کی طرح سر جھکائے سنتا رہا۔ اس ملامت سے اس کا دل کچھ ہلکا ہوا۔ سمن نے اگر غصہ میں گالیاں دی ہوتیں۔ تو شاید اسے اور بھی تسکین ہوتی۔ وہ اپنے تئیں اس طعن وتشنیع کا سراسر سزاوار پاتا تھا۔ جب ہم سے کوئی ایسا فعل ہوجاتا ہے۔ جس پر ہم خود نادم ہوں۔ تو کسی غیر کی لعن طعن ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن یہ حالت صرف معمولی خطاؤں میں ہوتی ہے۔ ہماری قوت تحمل درجہ گناہ کے اعتبار سے بڑھتی جاتی ہے +

سدن نے ٹھنڈے پانی کا گلاس لاکر سمن کو دیا اور خود پنکھا جھلنے لگا۔ سمن نے شانتا کے منہ پر پانی کے کئی چھینٹے دیئے۔ اس پر بھی جب شانتا نے آنکھیں نہ کھولیں۔ تو سدن ڈرتے ڈرتے بولا "جاکر ڈاکٹر کو بلا لاؤں نہ؟"

سمن۔ نہیں۔ گھبراؤ مت۔ ٹھنڈک پہنچتے ہی ہوش آجائے گا۔ ڈاکٹر کے پاس اس مرض کی دوا نہیں ہے +

سدن کو کچھ تسلی ہوئی۔ بولا "سمن چاہے تم سمجھو۔ کہ میں بات بنا رہا ہوں۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ کہ اسی منحوس گھڑی سے میری روح کو ایک لمحہ بھی اطمینان نہیں نصیب ہوا۔ میرا دل بار بار مجھے نفریں کرتا تھا۔ کئی بار ارادہ کیا۔ کہ چل کر اپنی خطائیں معاف کراؤں۔ لیکن یہی خیال آتا۔ کہ کس بوتے پر جاؤں؟ گھر والوں سے ہمدردی کی امید نہ تھی۔ اور مجھے تو تم جانتی ہو۔ کہ ہمیشہ کوتل بنا رہا۔ بس اسی فکر میں ڈوبا رہتا تھا۔ کہ کسی طرح چار پیسے

ہوں گے۔

سدن۔ آج نہ جاؤں گا۔

سمن۔ نہیں نہیں وہ لوگ گھبرائیں گے۔ شانتا اب بالکل اچھی ہے۔ دیکھو کیسے مزے سے سوتی ہے۔ اتنے دنوں میں آج ہی میں نے اُسے یوں سوتے دیکھا ہے۔

سدن نے نہیں مانا۔ وہیں برآمدے میں آکر تخت پر لیٹ رہا۔ اور سوچنے لگا۔



(۲۷)

بابو بٹھل داس منصف مزاج آدمی تھے۔ جس طرف انصاف کھینچ لے جاتا اُدھر ہی چلے جاتے تھے۔ اس میں اُنہیں ذرا بھی تامل نہ ہوتا تھا۔ جب انہوں نے پدم سنگھ کو جادۂ حق سے ہٹتے دیکھا۔ تو اُن کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور کئی ماہ تک ان کے گھر نہ آئے۔ لیکن جب پربھاکر راؤ نے آشرم پر حملے کرنے شروع کئے۔ اور سمن کے متعلق چند پوشیدہ باتیں ظاہر کردیں۔ تو بٹھل داس کا ان سے بھی بگاڑ ہوگیا۔ اب سارے شہر میں ان کا کوئی ہمدم نہ تھا۔ اب انہیں تجربہ ہو رہا تھا۔ کہ ایک ایسے دار الخیر کے منتظم ہوکر جسکا وجود دوسروں کی ہمدردی اور اعانت پر قائم ہو۔ میرا کسی فریق سے مخصوص ہونا حد درجہ نازیبا ہے۔ شام کا وقت تھا۔ وہ بیٹھے ہوئے سوچ رہے تھے۔ کہ ان حملوں کا کیا جواب دوں۔ باتیں بہت کچھ سچی ہیں۔ سمن فی الواقع بازاری عورت تھی۔ میں نے یہ جانتے

ہوتے بھی اسے آشرم میں داخل کیا۔ انتظامیہ کمیٹی سے اس کے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کی منظوری نہیں حاصل کی۔ دراصل میں نے آشرم کو اپنی ذاتی چیز خیال کیا۔ میرا مقصد چاہے کتنا ہی قابل تعریف ہو۔ پر اُسے مخفی رکھنا ہرگز مناسب نہ تھا÷

بٹھل داس ابھی کچھ فیصلہ نہ کرنے پائے تھے۔ کہ آشرم کی معلمہ نے آکر کہا۔ "بابوجی آنندی۔ راجکماری اور گوری گھر جانے کو تیار بیٹھی ہوئی ہیں میں نے بہت سمجھایا پر وہ کسی طرح نہیں مانتیں"÷

بٹھل داس نے جھنجھلا کر کہا۔ "کہدو چلی جائیں۔ مجھے اس کا خوف نہیں ہے۔ ان کے لئے میں سمن اور شانتا کو کہیں نکال سکتا"÷

معلمہ چلی گئی۔ اور بٹھل داس پھر خیال میں ڈوبے۔ "یہ عورتیں اپنے تئیں کیا سمجھتی ہیں؟ کیا سمن اس درجہ گری ہوئی ہے۔ کہ یہ سب اس کے ساتھ رہ بھی نہیں سکتیں۔ اُن کا اعتراض ہے۔ کہ آشرم بدنام ہو گیا ہے۔ اور یہاں رہنے میں ہماری بدنامی ہے۔ ہاں ضرور بدنامی ہے۔ جاؤ۔ میں تمہیں نہیں روکتا"÷

اس وقت ڈاکیہ چٹھیاں لے کر آیا۔ بٹھل داس کے نام پانچ خطوط تھے۔ ایک میں لکھا تھا۔ میں اپنی لڑکی ودیا دتی کو آشرم میں رکھنا مناسب نہیں خیال کرتا۔ میں اسے لینے آرہا ہوں۔ دوسرے صاحب نے دھمکایا تھا۔ کہ اگر طوائفوں کو آشرم سے نکالا نہ جائے گا۔ تو میں چندہ دینا بند کر دوں گا۔ تیسرے خط کا بھی یہی منشا تھا۔ باقی دونوں چٹھیاں بٹھل داس نے نہ کھولیں ان دھمکیوں سے وہ خائف نہیں ہوئے۔ بلکہ اور بھی جھلا گئے۔ یہ لوگ سمجھتے

ہوں گے۔ کہ میں انکی گیدڑ بھپکیوں سے کانپنے لگوں گا۔ یہ نہیں سمجھتے۔ کہ بٹھل داس کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ آشرم چاہے ٹوٹ جائے۔ لیکن شانتا اور سمن کو میں ہرگز علیحدہ نہ کروں گا۔ بٹھل داس کے غرور نے ان کے احساس حق کو زائل کر دیا۔ سینہ زوری اور ثبات دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ فرق صرف ان کے عمل میں ہے +

سمن دیکھ رہی تھی۔ کہ میرے ہی باعث یہ بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ اُسے افسوس ہو رہا تھا۔ کہ میں یہاں کیوں آئی۔ اس نے دل و جان سے بدواؤں کی خدمت کی تھی۔ اُس کا یہ نتیجہ نکلا۔ وہ جانتی تھی۔ کہ بٹھل داس کبھی مجھے یہاں سے نہ جانے دیں گے۔ اس لئے اس نے ارادہ کیا۔ کہ کیوں نہ میں خود چپکے سے چلی جاؤں۔ تین عورتیں چلی گئی تھیں۔ تین چار مستورات جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ اور کئی عورتوں نے اپنے اپنے گھر خطوط بھیجے تھے۔ صرف وہی عورتیں خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔ جن کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ پر وہ بھی سمن سے آنکھیں چراتی پھرتی تھیں۔ سمن یہ بے عزتی نہ برداشت کر سکی۔ اُس نے شانتا سے مشورہ کیا۔ شانتا بڑی کشمکش و پیچ میں پڑی۔ پدم سنگھ کی اجازت کے بغیر وہ آشرم سے نکلنا غیر مناسب سمجھتی تھی۔ لیکن جب سمن نے قطعی طور سے کہدیا۔ کہ تم رہنی ہو تو رہو۔ لیکن میرا یہاں رہنا ممکن نہیں۔ تو شانتا بھی مجبور ہو گئی۔ اس جنگل میں بھٹکتے ہوئے آدمی کی طرح جو کسی دوسرے آدمی کو دیکھکر محض اس لئے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ کہ ایک سے دو ہو جائیں گے۔ شانتا اپنی بہن کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی +

سمن نے پوچھا۔ "اور جو پدم سنگھ ناراض ہوں"؟

شانتا۔ انہیں ایک خط لکھ کر پوری سرگزشت سنا دوں گی +

سمن۔ اور جو سدن سنگھ بگڑے ؟

شانتا۔ جو سزا دیں گے۔ وہ بھگت لوں گی +

سمن۔ خوب سوچ لو۔ ایسا نہ ہو پھر پچھتانا پڑے +

شانتا۔ رہنا تو مجھے یہیں چاہئے۔ پر تمہارے بغیر مجھ سے رہا نہ جائے گا۔ ہاں یہ تو بتلاؤ کہاں چلوگی ؟

سمن۔ تمہیں امولا پہنچا دوں گی +

شانتا۔ اور تم ؟

سمن۔ میرا ایشور مالک ہے۔ کہیں تیرتھ جاترا کرنے چلی جاؤں گی +

دونوں بہنوں میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ پھر دونوں ملکر روئیں۔ جونہی آٹھ بجے اور بٹھل داس کھانا کھانے کے لئے اپنے گھر گئے۔ دونوں بہنیں سب کی نگاہ بچا کر چل کھڑی ہوئیں +

رات بھر کسی کو خبر نہ ہوئی۔ سویرے چوکیدار نے آکر بٹھل داس کو یہ خبر سنائی۔ وہ گھبرائے اور لپکے ہوئے سمن کے کمرہ میں جا پہنچے۔ سب چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ صرف دونوں بہنوں کا پتہ نہ تھا۔ بیچارے بڑی تشویش میں پڑے۔ پدم سنگھ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ انہیں اس وقت سمن پر غصہ آیا۔ یہ سب اسی کی حرکت ہے۔ وہ شانتا کو بھی بھگا کر لے گئی ہے دفعتہً انہیں سمن کی چارپائی پر ایک خط پڑا ہوا ملا۔ اسے اٹھا لیا۔ اور پڑھنے لگے۔

سمن نے چلتے وقت یہ خط لکھ کر رکھ دیا تھا۔ اُسے پڑھ کر بھٹل داس کو گونہ اطمینان ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ملال ہوا۔ کہ سمن کے باعث مجھے آج نیچا دیکھنا پڑا۔ انہوں نے دل میں فیصلہ کیا تھا۔ کہ میں دھمکی دینے والوں کو نیچا دکھاؤں گا۔ یہ موقعہ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب لوگ یہی سمجھیں گے۔ کہ میں ڈر گیا۔ اس خیال سے بھٹل داس آشفتہ خاطر ہوئے ۔

آخر وہ کمرہ سے نکلے۔ اور سیدھے پدم سنگھ کے پاس پہنچے ۔

شرماجی نے یہ خبر سنی تو سناٹے میں آگئے۔ بولے "اب کیا ہو؟"

بھٹل داس۔ وہ امولا پہنچ گئی ہوں گی ۔

پدم سنگھ۔ ہاں ممکن ہے ۔

بھٹل۔ سمن اتنی دور کا سفر آسانی سے کر سکتی ہے ۔

پدم سنگھ۔ ہاں۔ بہت آسانی سے ۔

بھٹل۔ سمن تو امولا گئی نہ ہوگی؟

پدم۔ کون جانے دونوں بہنیں ڈوب مری ہوں ۔

بھٹل۔ ایک تار بھیج کر پوچھ کیوں نہ لیا جائے؟

پدم۔ کون مُنہ لے کر پوچھوں۔ جب مجھ سے شانتا کی خبر گیری تک نہ ہو سکی۔ تو اس کے متعلق کچھ پوچھنا نہایت شرمناک ہے۔ مجھے آپ کے اُوپر کامل اعتماد تھا۔ اگر جانتا۔ کہ آپ اتنی لاپروائی کریں گے۔ تو اسے اپنے ہی گھر رکھتا ۔

بھٹل۔ آپ تو ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ گویا میں نے عمداً انہیں آشرم سے نکال دیا۔

شرما۔ آپ اُن کی تشفی کرتے رہتے۔ تو وہ کبھی بھی نہ جاتیں۔ آپ نے مجھے

بھی اس وقت اطلاع دی ہے۔ جب موقعہ ہاتھ سے نکل گیا +

بٹھل۔ آپ ساری ذمہ داری میرے ہی سر ڈالنا چاہتے ہیں +

شرما۔ اور کس کے سر ڈالوں۔ آشرم کے منتظم آپ ہی ہیں۔ یا کوئی اور؟

بٹھل۔ شانتا کو آشرم میں رہتے تین ماہ گزر گئے۔ آپ بھول کر بھی آشرم کی طرف گئے؟ اگر آپ کبھی کبھی وہاں جا کر اس کی خیر و عافیت پوچھتے رہتے۔ تو اسے اطمینان رہتا۔ جب آپ نے کبھی اس کی بات تک نہ پوچھی۔ تو وہ کس اُمید پر وہاں پڑی رہتی۔ میں اپنی ذمہ داری کو تسلیم کرتا ہوں۔ پر آپ بھی الزام سے نہیں بچ سکتے +

پدم سنگھ آج کل بٹھل داس سے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ انہیں کے ایما اور تحریک سے بازار حسن کی اصلاح پر آمادہ ہوئے تھے۔ پر جب آخر کار کام کرنے کا موقعہ آیا۔ تو وہ صاف نکل گئے۔ اور بٹھل داس بھی ارباب نشاط سے ان کی ہمدردی دیکھ کر انہیں شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دونوں اصحاب اپنے اپنے دل میں غبار بھرے ہوئے ایک دوسرے کو متہم کرنیکی کوشش کر رہے تھے۔ پدم سنگھ انہیں خوب جھنجھوڑنا چاہتے تھے۔ پر یہ دندان شکن جواب پا کر انہیں خاموش ہونا پڑا۔ بولے۔" ہاں اتنی خطا ضرور میری ہے "+

بٹھل داس۔ نہیں آپ کو خطاوار ثابت کرنا میرا مقصود نہیں ہے۔ خطا سب میری ہے۔ آپ نے انہیں میرے سپرد کر دیا۔ تو آپ کا انکی طرف سے مطمئن ہو جانا ایک قدرتی امر تھا +

پدم سنگھ۔ نہیں فی الواقع یہ میری بزدلی اور سہل انگاری کا نتیجہ ہے۔ آپ انہیں جبراً تھوڑے ہی رکھ سکتے تھے +

پدم سنگھ نے اپنی خطا تسلیم کرکے بازی پلٹ دی تھی۔ ہم آپ جھک کر دوسرے کو جھکا سکتے ہیں۔ پر تن کو جھکانا مشکل ہے +

بٹھل۔ شاید سدن کو کچھ معلوم ہو۔ ذرا اُنہیں بُلائیے +

پدم۔ وہ تو رات ہی سے غائب ہے۔ ندی کنارے ایک جھونپڑا بنوا لیا ہے اور ایک ناؤ چلاتا ہے۔ شاید رات وہیں رہ گیا +

بٹھل۔ کیا عجب ہے۔ دونوں بہنیں وہیں پہنچ گئی ہوں۔ کہئے تو جاکر دیکھوں؟

پدم۔ اجی نہیں آپ کس خیال میں ہیں۔ وہ اتنا روشن خیال نہیں ہے۔ ان کے سایہ سے بھاگتا ہے +

دفعتہً سدن کمرہ میں داخل ہوا۔ پدم سنگھ نے پوچھا "تم رات کہاں رہ گئے؟ ساری رات تمہاری انتظار میں گزری" +

سدن نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا "میں خود ہی شرمندہ ہوں لیکن ایک ایسی ضرورت آپڑی۔ کہ مجھے مجبوراً رُکنا پڑا۔ اتنا موقع ہی نہ ملا۔ کہ آکر کہہ جاتا میں نے آپ سے شرم کے مارے کبھی ذکر نہیں کیا۔ لیکن ادھر کئی ماہ سے میں نے ایک ناؤ چلانی شروع کی ہے۔ وہیں ندی کنارے ایک جھونپڑ بنوا لیا ہے۔ میرا ارادہ ہے۔ کہ اس کام کو جم کر کروں۔ آپ سے اس جھونپڑے میں ... چلنے کی التجا چاہتا ہوں" +

پدم سنگھ۔ اس کا چرچا تو ایک بار لالہ بھگت رام نے مجھ سے کہا تھا۔ لیکن ملال یہی ہے۔ کہ اب تک تم نے مطلق ذکر نہ کیا۔ ورنہ شاید میں بھی تمہاری کچھ مدد کرسکتا خیر۔ میں اُسے بُرا نہیں سمجھتا۔ بلکہ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر میں بہت خوش

ہوں۔ لیکن میں اِسے کبھی نہ مانوں گا۔ کہ تم اپنا گھر رہتے ہوئے اپنی ہانڈی الگ چڑھاؤ۔ کیا ایک کشتی اور رکھ لی جائے۔ تو کچھ زیادہ فایدہ ہوسکتا ہے"؟

سدن۔ جی ہاں۔ میں خود اسی فکر میں ہوں۔ لیکن اس کے لئے میرا گھاٹ پر رہنا ضروری ہے +

پدم سنگھ۔ بھئی یہ بُری شرط ہے۔ شہر میں رہکر تم مجھ سے الگ رہو۔ یہ مجھے گوارا نہیں۔ اس میں چاہے تمہیں کچھ نقصان بھی ہو۔ لیکن میں نہ مانوں گا +

سدن۔ آپ میری یہ عرض قبول کیجئے۔ میں بہت مجبور ہوکر آپ سے یہ عرض کرنے کی جُرأت کر رہا ہوں +

پدم سنگھ۔ آخر وہ کیا بات ہے۔ جو تمہیں اس قدر مجبور کر رہی ہے۔ تم مجھے غیر کیوں سمجھتے ہو؟ جو تردد ہو وہ صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟

سدن۔ میں اب اس گھر میں رہکر آپ کو بدنام نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے اب اُس فرض کو پورا کرنے کا کر لیا ہے۔ جسے کچھ دنوں تک اپنی حماقت اور کچھ دنوں تک اپنی کاہلی اور بُزدلی سے ٹالتا آتا تھا۔ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔ کہ ایک خون ناحق میں والد صاحب کی اعانت کروں۔ اور نہ یہ ہوسکتا ہے۔ کہ آپ پر اپنے فعل کی ذمہ واری رکھ کر اُن میں اور آپ میں نفاق پیدا کروں + میں آپ کا لڑکا ہوں۔ جب مجھے کوئی ضرورت ہوگی۔ آپ کو ستاؤں گا۔ کوئی تکلیف ہوگی۔ آپ کا دامن پکڑوں گا۔ لیکن رہوں گا الگ۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ آپ میری تجویز کو پسند کریں گے +

بٹھل داس نے پر پہنچ گئے۔ پوچھا۔ کل سمن اور شانتا سے تمہاری ملاقات تو

نہیں ہوئی؟"

سدن کا چہرہ شرم سے سُرخ ہوگیا۔ جیسے کسی نازنین کے چہرہ سے نقاب اُٹھ جائے۔ دبی زبان سے بولا۔ "جی ہاں"۔

پدم سنگھ دریائے تفکر میں غوطے کھانے لگے۔ نہ ہاں کہہ سکتے تھے۔ نہ نہیں کہتے بنتا تھا۔ اب تک وہ اس معاملہ میں اپنے تئیں بالکل پاک سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس ظلم کا سارا الزام اپنے بھائی کے سر ڈال دیا تھا۔ اور سدن کو تو وہ کاٹھ کا پُتلا سمجھتے تھے۔ لیکن اب اس نرغہ میں پڑکر وہ اِدھر اُدھر بھاگ نکلنے کی راہ دیکھتے پھرتے تھے۔ دُنیا کا خوف تو انہیں نہیں تھا۔ خوف یہ تھا۔ کہ کہیں بھائی صاحب یہ نہ سمجھ لیں۔ کہ یہ سب میرے ہی اشارہ سے ہوا ہے۔ اور میں نے ہی سدن کو گمراہ کیا ہے۔ یہ خیال ان کے دل میں جاگزیں ہوگیا۔ تو وہ ساری عمر مجھے معاف نہ کریں گے۔

پدم سنگھ کئی منٹ تک اسی اُلجھن میں پڑے رہے۔ آخر بولے۔ "سدن یہ معاملہ ایسا نازک ہے۔ کہ میں اپنی ذمہ واری پر کچھ نہیں کرسکتا۔ بھائی صاحب کی منشا جانے بغیر ہاں یا نہیں۔ کیونکر کردوں۔ تم میرے اصولوں کو جانتے ہو۔ میں تمہاری اخلاقی جرأت کی تعریف کرتا ہوں۔ کہ پرماتما نے تمہیں حق پر آمادہ کیا۔ لیکن میں بھائی صاحب کی مرضی کو مقدم سمجھتا ہوں۔ یہ ہوسکتا ہے۔ کہ تم ان دونوں کے رہنے کا انتظام کردو۔ بس یہیں تک۔ اس کے آگے میں کچھ نہیں کرسکتا۔ بھائی صاحب کی جو مرضی ہو وہ کرو"۔

سدن نے کسی قدر بے صبری سے کہا۔ "کیا آپ کو معلوم نہیں ہے۔ کہ وہ

کیا جواب دیں گے"؟

پدم۔ ہاں۔ معلوم کیوں نہیں +

سدن۔ تو اُن سے پوچھنا بے سود ہے۔ ماں باپ کے حکم سے میں اپنی جان دے سکتا ہوں۔ جو انکی دی ہوئی ہے۔ لیکن کسی بیگناہ کی گردن پر تلوار نہیں چلا سکتا +

پدم۔ تمہیں اس میں کیا عذر ہے۔ کہ دونوں بہنیں الگ مکان میں ٹھہرا دی جائیں +

سدن نے تیز ہو کر کہا۔" یہ تو میں تب کروں۔ جب مجھے چھپانا ہو۔ میں کوئی گناہ کرنے نہیں جا رہا ہوں۔ جو اُسے چھپاؤں + اپنی زندگی کا نہایت اہم فرض ادا کرنے جاتا ہوں۔ اُسے چھپانیکی ضرورت نہیں۔ میں اس کام کو کار خیر یا رحم سمجھ کر نہیں کرتا۔ بلکہ اپنا روحانی اور انسانی فرض سمجھ کر + ابتک شادی کے جو مراسم ادا نہیں ہوئے ہیں۔ وہ کل ندی کے کنارے ادا کئے جائیں گے۔ اگر آپ تشریف لائیں گے۔ تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ ورنہ ایشور کے دربار میں بغیر گواہوں کے بھی معاہدے ہو جاتے ہیں" +

یہ کہتا ہوا سدن اُٹھا۔ اور گھر میں چلا گیا۔ سبھدرا نے کہا۔" واہ خوب غائب ہوتے ہو۔ ساری رات جی لگ رہا۔ کہاں رہ گئے تھے"؟

سدن نے رات کی ساری سرگزشت مفصل بیان کی۔ چچی سے بات کرنے میں اُسے وہ جھجھک نہ ہوئی۔ جو شرماجی کے روبرو ہوئی تھی۔ سبھدرا نے اسکی ہمت کی تعریف کی۔ اور بولی۔" ماں باپ کے ڈر سے کوئی اپنی بیاہتا کو تھوڑے ہی چھوڑ دیتا ہے۔ دنیا ہنسے گی تو ہنسا کرے۔ کیا اُس کے خوف سے اپنے گھر کے آدمی کی جان لے لی جائے گی؟ تمہاری اماں سے ڈرتی ہوں۔ نہیں تو ا

اپنے گھر رکھتی"+

سدن۔ مجھے اماں یادادا کی پروا نہیں ہے+

سبھدرا۔ بہت پروا تو کی۔ اتنے دنوں تک بچاری کو گھلا گھلا کر مار ڈالا۔ کوئی دوسرا لڑکا ہوتا تو پہلے ہی دن ماں باپ کو پھٹکار سنا دیتا۔ تمہیں ہو۔ کہ اتنا برداشت کرتے ہو+

سبھدرا! اگر یہی باتیں تم نے خالص ہمدردی سے کی ہوتیں تو ہم تمہاری کتنی عزت کرتے۔ مگر تم اس وقت حسد اور کینہ کے بس میں ہو۔ تم سدن کو اُبھار کر اپنی جٹھانی کو زک دینا چاہتی ہو۔ تم ایک ماں کے معصوم دل پر وار کر کے اس کے تڑپنے کا لطف اُٹھانا چاہتی ہو+

سدن چلا گیا۔ تو بٹھل داس نے پدم سنگھ سے کہا "یہ تو آپ کے دل کی بات ہوئی۔ اس میں آپ کو اتنا پس وپیش کیوں ہے"؟

پدم سنگھ نے جواب نہیں دیا+

بٹھل داس۔ یہ تحریک آپ کی طرف سے ہونی چاہئے تھی۔ لیکن اب آپ کو اس کے قبول کرنے میں اس قدر تامل ہے؟

پدم سنگھ نے اس کا بھی کچھ جواب نہ دیا+

بٹھل داس۔ اگر وہ اپنی بیوی کے ساتھ الگ رہنا چاہتا ہے۔ تو اس میں کیا ہرج ہے؟ آپ نہ اپنے ساتھ رکھیں گے۔ نہ الگ رہنے دیں گے۔ اس کے کیا معنی؟

پدم سنگھ نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ "بھائی صاحب جب اپنے اوپر پڑتی

ہے۔ تب انسان جانتا ہے۔ جیسے مجھے آپ راہ دکھا رہے ہیں۔ اُسی طرح میں بھی دوسروں کو راہ دکھاتا رہا ہوں۔ آپ ہی ابھی طوائفوں کی اصلاح پر دھواں دھار تقریریں کرتے پھرتے ہو۔ لیکن کام کرنے کا موقعہ آیا۔ تو صاف نکل گئے۔ اسی طرح دوسروں کو بھی سمجھئے۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ پر اپنے بھائی کو ناراض نہیں کر سکتا۔ مجھے کوئی اصول اتنا عزیز نہیں ہے۔ جو میں انکی مرضی پر قربان نہ کر سکوں"۔

بٹھل داس۔ میں نے آپ سے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ کہ خاندانی طوائفوں کو دیویاں بنا دوں گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں۔ کہ اُن عورتوں میں جو گھر والوں کے ظلم یا بدمعاشوں کے بہکانے سے خراب ہو جاتی ہیں۔ اور خاندانی طوائفوں میں کوئی فرق نہیں ہے؟ میرے خیال میں اُن دونوں میں اتنا ہی فرق ہے۔ جتنا ممکن اور محال میں ہے۔

پدم سنگھ۔ کم سے کم آپ کو میری مدد تو کرنی چاہیئے تھی۔ آپ اگر ایک گھنٹہ کے لئے میرے ساتھ دال منڈی چلیں۔ تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ جسے آپ محال سمجھتے ہیں۔ وہ بالکل ممکن ہے۔ اچھے اور بُرے آدمی ہر جگہ ہوتے ہیں طوائفیں بھی اس کُلیّہ سے خارج نہیں۔ آپ کو یہ دیکھ کر تعجب ہو گا۔ کہ ان میں کتنی مذہبی ارادت۔ اس مکروہ زندگی سے کتنی نفرت اور اپنی اصلاح کی کتنی تمنا ہے۔ مجھے خود اس پر تعجب ہوتا ہے۔ اُنہیں صرف ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ جسے پکڑ کر وہ غار سے باہر نکل آئیں۔ پہلے تو وہ میری صورت سے گریز کرتی تھیں۔ لیکن جب میں نے اُنہیں سمجھایا۔ کہ میں نے یہ تجویز خاص تمہاری بہبودی کے

لئے کی ہے۔ تاکہ تم فاسقوں اور ہوس پروروں کی دسترس سے باہر رہ سکو۔ تو اُنہیں مجھ پر کچھ کچھ اعتماد ہونے لگا۔ نام تو نہ بتاؤں گا۔ لیکن کئی مالدار طوائفیں مجھے مالی امداد دینے پر آمادہ ہیں۔ کئی ایسی ہیں۔ جو اپنی لڑکیوں کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن ابھی اُن عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جو نشہ میں ہیں۔ اور اس عیش کو چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ اور میری ہنسی اڑاتی ہیں۔ کہتی ہیں ابھی چین کرتے دیجئے۔ بڑھاپے میں توبہ کرلیں گے۔ لیکن مجھے اُمید ہے۔ کہ سوامی گجانند کی تلقین کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔ افسوس یہی ہے۔ کہ میرا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں ہے۔ ہاں مضحکہ اڑانے والے ڈھیروں ہیں۔ اس وقت ایک ایسے یتیم خانہ کی ضرورت ہے۔ جہاں طوائفوں کی لڑکیاں رکھی جاسکیں۔ اور انکی تعلیم کا معقول انتظام ہو سکے۔ لیکن میری کون سنتا ہے +

بٹھل داس بڑے غور سے یہ باتیں سنتے رہے۔ پدم سنگھ نے جو کچھ کہا تھا۔ وہ اُن کا ذاتی تجربہ تھا۔ اور ذاتی تجربات ہمیشہ یقین انگیز ہوتے ہیں۔ بٹھل داس کو محسوس ہوا۔ کہ میں جس کام کو محال سمجھتا تھا۔ وہ فی الواقع محال نہیں ہے۔ بولے "اُن دونوں سنگھ سے آپ نے اس کی بابت کچھ کہا یا نہیں؟"

پدم سنگھ۔ وہاں لچھے دار باتوں اور مزے دار چٹکیوں کے سوا اور کیا رکھا ہے +

بٹھل داس پھر خیال میں غرق ہو گئے +



سدن کا عقد شانتا کے ساتھ ہو گیا۔ جھونپڑا خوب سجایا گیا تھا۔ وہی منڈپ کا

کام دیرہا تھا۔ لیکن زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ تھی۔ بابو بیٹھل داس۔ لالہ بھگت رام اور چند دیگر اصحاب شریک ہو گئے تھے۔

پدم سنگھ اُسی دن مکان چلے گئے۔ پنڈت مدن سنگھ سے ساری کیفیت بیان کی۔ وہ یہ سنتے ہی آگ ہو گئے۔ بولے "میں اس چھوکرے کا سر کاٹ لوں گا۔ وہ اپنے کو سمجھتا کیا ہے۔" بھاما نے کہا "میں آج ہی جاتی ہوں۔ اُسے سمجھا کر لوا لاؤنگی۔ ابھی نادان لڑکا ہے۔ اُس کُٹنی سمن کی باتوں میں آگیا ہے۔ میرا کہنا ضرور مان جائیگا۔" لیکن مدن سنگھ نے بھاما کو ڈانٹا اور دھمکا کر کہا "اگر تم نے اُدھر جانے کا نام لیا۔ تو اپنا اور تمہارا گلا ایک ساتھ گھونٹ دوں گا۔ وہ آگ میں کودتا ہے۔ کودنے دو۔ ایسا دودھ پیتا بچہ نہیں ہے۔ یہ سب اُسکی ضد ہے۔ بچا تو بھیک منگوا کر نہ چھوڑوں تو کہنا۔ سوچتے ہوں گے۔ دادا مر جائیں گے۔ تو چین سے زندگی کا لُطف اُٹھاؤنگا منہ دھو رکھیں۔ یہ کوئی موروثی جائداد نہیں ہے۔ یہ میری اپنی کمائی ہے۔ سب کی سب کرشن کے نام پر وقف کر دوں گا۔ ایک کانی کوڑی تو ملے گی نہیں"۔

گاؤں میں چاروں طرف سرگوشیاں ہونے لگیں۔ لالہ بیجناتھ کو یقین کامل ہو گیا۔ کہ دُنیا سے دھرم اُٹھ گیا۔ جب لوگوں کو ایسے ایسے نیچ کام کرنیکی جرأت ہونے لگی۔ تو دھرم کہاں رہا۔ نہ ہوئی نوابی۔ نہیں تو آج بچہ کی دھجیاں اُڑ جاتیں۔ اب دیکھیں کون مُنہ لیکر گاؤں میں آتے ہیں۔

پدم سنگھ رات کو بہت دیر تک بھائی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ لیکن جوں ہی سدن کا کچھ ذکر چھیڑتے۔ مدن سنگھ انکی طرف ایسی غضبناک نظروں سے دیکھتے کہ انکی بولنے کی ہمت نہ پڑتی۔ آخر جب وہ سونے چلے تو پدم سنگھ نے مایوسانہ

ہمت کے ساتھ کہا "بھیا سدن آپ سے الگ رہے۔ تب بھی وہ آپ کا لڑکا ہی کہلائیگا۔ وہ جو کچھ نیک یا بد کرے گا۔ اس میں سارا خاندان شریک سمجھا جائے گا۔ جو لوگ اصلی حالات سے واقف ہیں۔ وہ چاہے ہم لوگوں کو معذور سمجھیں۔ لیکن عوام ہمارے اور سدن کے درمیان کوئی تفریق نہیں کر سکتے۔ تو اس سے کیا فائدہ کہ سانپ بھی نہ مرے اور لاٹھی بھی ٹوٹ جائے۔ ایک طرف دو برائیاں ہیں۔ بدنامی بھی ہوتی ہے اور لڑکا بھی ہاتھ سے جاتا ہے۔ دوسری طرف ایک ہی برائی ہے۔ بدنامی ہو گی۔ لیکن لڑکا اپنے ہاتھ میں رہے گا۔ اس لئے مجھے تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم لوگ چل کر سدن کو سمجھائیں۔ اور اگر وہ کسی طرح راضی نہ ہو۔ تو . . . . . "

مدن سنگھ نے بات چھین کر کہا "تو اس چڑیل سے اس کا بیاہ ٹھان دیں۔ کیوں یہی نہ کہنا چاہتے ہو۔ یہ مجھ سے نہ ہو گا۔ ایکبار نہیں۔ ہزار بار نہیں"۔

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔ اور ذرا دیر کے بعد پدم سنگھ کو تعریض کرتے ہوئے بولے "تعجب یہ ہے۔ کہ سب کچھ تمہارے سامنے ہوا۔ اور تمہیں ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ اس نے ناؤ لی۔ جھونپڑا بنایا۔ دونوں چڑیلوں سے سانٹھ گانٹھ کی اور تم آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے۔ میں نے تو اسے تمہارے بھروسے پر وہاں بھیجا تھا۔ یہ کیا جانتا ہے۔ کہ تم کان میں تیل ڈالے بیٹھے رہتے ہو۔ اگر تم نے ذرا بھی ہوشیاری سے کام لیا ہوتا۔ تو یہ نوبت نہ آتی۔ اب جب ساری گوٹیاں پٹ گئیں۔ سارا کھیل بگڑ گیا۔ تو چلے ہو وہاں سے مجھے صلاح دینے۔ میں صاف صاف کہتا ہوں۔ کہ مجھے تمہاری طرف سے اگر علانیہ حمایت نہیں۔ تو چشم پوشی کا شک

ضرور ہے۔ میں نے تمہارے سے بہت بُرے سلوک کئے تھے۔ اس کا تم نے بدلہ لیا۔ خیر۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ کل صبح اُٹھ کر ایک ہبہ نامہ لکھ دو۔ تین پائی جو موروثی جائداد ہے۔ اُسے چھوڑ کر میں باقی ساری جائداد کرشن کے نام پر وقف کرتا ہوں۔ یہاں نہ لکھ سکو۔ تو وہاں سے لکھ کر بھیج دینا۔ میں اُسے دیکھ کر دستخط کر دوں گا۔ اور اُسکی رجسٹری ہو جائے گی۔"

یہ کہہ کر مدن سنگھ سونے چلے گئے۔ لیکن پدم سنگھ کے قلب پر ایسا قاتل وار کر گئے۔ کہ وہ ساری رات تڑپتے رہے۔ جس الزام سے بچنے کے لئے انہوں نے اپنے اصولوں کی بھی پروا نہ کی۔ اور اپنے طبقہ میں محجوب ہونا پسند کیا۔ وہ الزام سر پر آ ہی گیا۔ اتنا ہی نہیں۔ بھائی کے دل میں بیل پڑ گئی۔ انہیں اب اپنی غلطی نظر آ رہی تھی۔ بیشک اگر انہوں نے زیادہ معاملہ فہمی سے کام لیا ہوتا۔ تو یہ نوبت نہ آتی۔ لیکن یہ خیال کسی قدر تسکین کا باعث تھا۔ کہ جو کچھ ہوا سو ہوا۔ ایک بیگناہ کی زندگی تو ٹھکانے لگ گئی۔

صبح کو جب وہ گھر سے چلنے لگے۔ تو بھابی روتی ہوئی آئی۔ اور بولی۔" بھیا اُنکی ضد تو دیکھ ہی رہے ہو۔ کہ لڑکے کی جان لینے پر آمادہ ہیں۔ لیکن تم ذرا سوچ سمجھ کر کام کرنا۔ بھول چوک بڑے بڑے بڑوں سے ہو جاتی ہے۔ وہ بیچارہ تو ابھی نادان لڑکا ہے۔ تم اسکی طرف سے من موٹا نہ کرنا۔ اُسے کسی کی ٹیڑھی نگاہ کی برداشت نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں دیس بدیس کی راہ لے۔ تو میں کہیں کی نہ رہوں۔ اُسکی سدھ لیتے رہنا۔ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ یہاں رہتا تھا۔ تو ایک بھینس کا دودھ پی جاتا تھا۔ دال میں اُسے گھی اچھا نہ لگتا تھا

لیکن میں اس سے چھپا کر لونڈے کے لونڈے ڈال دیتی تھی۔ اب اتنی سیوا جتن کون کرے گا۔ نہ جانے بیچارہ کیسے ہوگا۔ یہاں گھر پر کوئی کھانے والا نہیں۔ وہاں وہ انہیں چیزوں کے لئے ترستا ہوگا۔ کیوں بھیّا کیا اپنے ہی ہاتھ سے ناؤ چلاتا ہے؟

پدم سنگھ۔ نہیں دو ملاّح رکھ لئے ہیں +

بھاما۔ تب بھی دن بھر دوڑ دھوپ کرنی ہی پڑتی ہوگی۔ مجور لوگ بنا دیکھے بھالے تھوڑے ہی کام کرتے ہیں۔ میرا تو یہاں کچھ بس نہیں ہے۔ اُسے تمہارے سپرد کرتی ہوں۔ اُسے اناتھ سمجھ کر کھوج خبر لیا کرنا۔ میرا رویاں رویاں تمہیں اشیرباد دے گا۔ اب کے کاتکی اسنان ہیں بیں اُسے ضرور دیکھنے آؤنگی۔ کہدینا تمہاری اماں تمہیں بہت یاد کرتی تھیں۔ بہت روتی تھیں۔ یہ سُن کر اُسے ڈھارس ہو جائے گی۔ اس کا دل بڑا کچّا ہے مجھے یاد کر کے روز روتا ہوگا۔ یہ تھوڑے سے روپے ہیں لیتے جاؤ۔ اس کے پاس بھجوا دینا +

پدم سنگھ۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو وہاں ہوں ہی۔ میرے دیکھتے اُسے کسی بات کی تکلیف نہ ہونے پائے گی۔ تم اطمینان رکھو +

بھاما۔ نہیں لیتے جاؤ کیا ہُوا۔ اس ہانڈی میں گھی ہے۔ یہ بھی بھجوا دینا۔ بازاری گھی گھر کے گھی کو کہاں پہنچتا ہے۔ نہ یہ سگندھ نہ یہ سواد۔ اُسے اماوٹ کی چٹنی بہت اچھی لگتی ہے۔ تھوڑی سی امارٹ بھی رکھے دیتی ہوں۔ میٹھے میٹھے آم چُن کر رس نکالا تھا۔ سمجھا کر کہہ دینا "بیٹا کوئی فکر مت کرو۔ جب تک تمہاری ماں جیتی ہے تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے گی۔ میری تو وہی ایک اندھے کی لکڑی ہے۔ اچھا ہے تو۔ بُرا ہے تو۔ اپنا ہی ہے۔ دنیا کی لاج سے آنکھوں سے چاہے دور کر دوں۔

لیکن من سے تھوڑے ہی دور کر سکتی ہوں +

(۲۹)

جیسے نادر تخیل سے شعر میں جان پڑ جاتی ہے۔ اور خوش نما رنگ سے تصویروں میں اسی طرح دونوں بہنوں کے آنے سے جھونپڑے میں جان پڑ گئی ہے۔ اب وہ عاشق کا کلبۂ احزان نہیں۔ حسن کا مسکن اور ناز کی جلوہ گاہ ہے۔ اندھی آنکھوں میں پتلیاں پڑ گئی ہیں۔ ٹھونٹھ میں پھول کھل گئے ہیں +

وہ مرجھائی ہوئی کلی شانتا اب کھل کر ایک خوشنما۔ جاں نواز پھول ہو گئی ہے۔ سوکھی ہوئی ندی امنگوں پر ہے۔ جس طرح جیٹھ بساکھ کے دھوپ کی ماری ہوئی گائیں ساون میں نکھر جاتی ہیں۔ اور چراگاہوں میں کلیلیں کرنے لگتی ہیں اسی طرح وہ برہ کی ستائی ہوئی حسینہ اب نکھر گئی ہے۔ پریم میں مگن ہے +

روز صبح کو جھونپڑے سے دو تارے نکلتے ہیں۔ اور جا کر گنگا میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان میں ایک بہت روشن اور تیز رو ہے۔ دوسرا مدھم اور متین۔ صبح کی زریں شعاعوں میں ان تاروں کی روشنی ماند نہیں ہوتی۔ وہ اور بھی جگمگا اٹھتے ہیں +

شانتا گاتی ہے۔ سمن کھانا پکاتی ہے۔ شانتا اپنا سنگار کرتی ہے۔ سمن کپڑے سیتی ہے۔ ایک حال میں خوش ہے۔ دوسری یاد ماضی سے بیزار۔ شانتا بھوکے آدمی طرح تھال پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ سمن کسی مریض کی طرح اپنی پچھلی بے اعتدالیوں پر ہاتھ مل رہی ہے +

سدن کے طور و طریق میں بھی اب تغیر ہو گیا ہے۔ وہ اب دن چڑھے اُٹھتا ہے۔ گھنٹوں نہاتا ہے۔ بال سنوارتا ہے۔ کپڑے بدلتا ہے۔ عطر ملتا ہے۔ نو بجے سے پہلے وہ اپنی نشستگاہ میں نہیں آتا۔ اور آتا بھی ہے۔ تو جم کر بیٹھتا نہیں۔ اس کا دل کہیں اور رہتا ہے۔ پل پل بھر میں اندر جاتا ہے۔ اور اگر کسی سے بات چیت کرنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ تو اُکتانے لگتا ہے۔ شانتا اس کے دل و دماغ میں بس گئی ہے۔

سمن گھر کا بھی سارا کام کاج کرتی ہے۔ اور باہر کا بھی۔ وہ گھڑی رات رہے اُٹھتی ہے۔ نہانے کے بعد سدن کا ناشتہ پکاتی ہے۔ پھر ندی کنارے جا کر ناؤ کھلواتی ہے۔ ملاحوں کی نگرانی کرتی ہے۔ اور نو بجے پھر کھانا پکانے بیٹھ جاتی ہے۔ گیارہ بجے یہاں سے فرصت پا کر وہ پھر کوئی نہ کوئی کام کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ ۹ بجے رات کو جب سب لوگ سونے چلے جاتے ہیں۔ تو وہ پڑھنے بیٹھتی ہے۔ تلسی کی رامائن سے اُسے عشق ہے۔ کبھی بھگت مال پڑھتی ہے۔ کبھی سوامی دیویکانند کی تقریریں اور کبھی سوامی رام تیرتھ کے مضامین۔ وہ باکمال خواتین کے حالات بہت شوق سے پڑھتی ہے۔ میرا سے اسے بے حد عقیدت ہے۔ وہ زیادہ تر مذہبی کتابیں ہی پڑھتی ہے۔

ملاحوں کی عورتوں میں اُسکی بڑی عزت ہے۔ وہ ان کے جھگڑے چکاتی ہے۔ کسی کے بچے کے لئے کُرتہ ٹوپی سیتی ہے۔ کسی کے لئے انجن یا گُھٹی بنا دیتی ہے۔ اُن میں کوئی بیمار پڑتی ہے۔ تو اس کے گھر جاتی ہے۔ اور دوا درپن کی فکر کرتی ہے۔ وہ اپنی گری ہوئی دیوار کو از سر نو اُٹھا رہی ہے۔ اس چوا میں سب مرد عورت

اسکی تعریف کرتے ہیں۔ اور اُس کا جس گاتے ہیں۔ ہاں اگر قدر نہیں ہے تو اپنے گھر میں، محبت ایک محویت ہے۔ ایک جنون۔ جو انسان کو خود غرض بنا دیتا ہے۔ سمن اس طرح جی توڑ کر سارے گھر کا بوجھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ لیکن سدن کے مُنہ سے کبھی شکریہ یا حوصلہ افزائی کا ایک کلمہ بھی نہیں نکلتا شانتا بھی اس کی کاوش اور تندھی کی کچھ وقعت نہیں کرتی۔ دونوں اس کی طرف سے بیفکر ہیں۔ گویا وہ گھر کی لونڈی ہے۔ اور چکّی میں جُتتے رہنا ہی اس کا کام ہے۔ کبھی کبھی اس کے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ کبھی دوڑ دھوپ سے بخار چڑھ آتا ہے۔ تب بھی وہ گھر کا کام حسب معمول کرتی رہتی ہے۔ لیکن ان دونوں کی نگاہیں بصارت سے اس قدر عاری ہو گئی ہیں۔ کہ انہیں اسکی حالت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ کبھی کبھی تنہائی میں اپنی حالت پر گھنٹوں روتی ہے لیکن کوئی ہمدردی کرنیوالا۔ کوئی آنسو پونچھنے والا نہیں۔

سُمن خلقتہً خود پسند مغرور عورت تھی۔ وہ جہاں کہیں رہتی تھی۔ رانی بنکر رہتی تھی۔ اپنے شوہر کے گھر وہ سب تکلیفیں اُٹھا کر بھی رانی تھی۔ بازار حسن میں وہ جب تک رہی اس کا سکّہ چلتا رہا۔ آشرم میں وہ دوسروں کی خدمت کر کے سب کی مخدومہ بنی ہوئی تھی۔ وہ ممتاز بن کر رہنے کی خوگر تھی۔ اس لئے یہاں اُسے کس مپرسی کی حالت میں رہنا انتہا درجہ شاق گزرتا تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ محنت کرتی۔ اور خوش رہتی۔ اگر سدن کبھی کبھی اُس کی تعریف کیا کرتا۔ اس سے مشورہ لیا کرتا۔ اپنے گھر کی مالکن سمجھتا۔ اگر شانتا کبھی کبھی اس کے پاس بیٹھ کر اس کا دل خوش کرتی۔ اس کے سر میں تیل ڈالتی۔ اُس کا جُوڑا باندھتی۔ لیکن وہاں تو

دونوں محبت کے نشے میں متوالے ہو رہے تھے۔ نشانہ لگاتے وقت نگاہ صرف ایک مرکز پر رہتی ہے۔ محبت میں انسان کا یہی حال ہوتا ہے +

لیکن سدن اور شانتا کا یہ تغافل صرف محویت اور جنون کے باعث تھا۔ اس میں شک ہے، سدن اُس سے اس طرح محترز رہتا تھا۔ جیسے ہم جذام کے مریض سے دور رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہمدردی ہونے پر بھی اس کے قریب جانیکی ہمت نہیں رکھتے۔ شانتا سمن سے بدگمان رہتی تھی۔ اس کے حُسن سے خائف تھی۔ یہی خیریت تھی۔ کہ سدن خود ہی اُس سے دور دور رہتا تھا۔ ورنہ شانتا فکر کے مارے مر ہی جاتی + دونوں چاہتے تھے۔ کہ یہ روئے سیاہ اور یہ مار آستین آنکھوں سے دور ہو جائے + لیکن تنگ ظرفی کے الزام کے خوف سے اُن کو باہم بھی اس مسئلہ پر زبان کھولنے کی جُرأت نہ ہوتی تھی +

سمن کو رفتہ رفتہ یہ حقیقت صاف صاف نظر آتی جاتی تھی +

ایک بار جیتن کہار شرما جی کے یہاں سے کچھ سوغات لے کر آیا اس کے قبل بھی وہ کئی بار آیا تھا۔ لیکن اسے دیکھتے ہی سمن چھپ جایا کرتی تھی + اب جیتن کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ پھر کیا تھا۔ اس کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ وہ پتھر کھا کر پچا سکتا تھا۔ لیکن کسی بات کے پچانے کی طاقت اس میں نہ تھی۔ ملّاحوں کے چودھری کے پاس حقہ تمباکو کے بہانے سے اور زبر اگل آیا۔ ارے! یہ تو کسبی ہے۔ خصم نے گھر سے نکال دیا۔ تو ہمارے یہاں کھانا پکاتی رہی۔ وہاں سے نکالی گئی تو چوک میں جا بیٹھی۔ اب دیکھتا ہوں۔ تو یہاں براج رہی ہے + چودھری سناٹے میں آگیا۔ عورتوں میں اشارہ یا زباں ہونے لگیں۔ اس دن

سے کوئی ملاّح سدن کے گھر کا پانی نہ پیتا تھا۔ ان کی عورتوں نے بھی سمن کے پاس آنا جانا ترک کر دیا +

اسی طرح ایک بار لالہ بھگت رام اینٹوں کی لدوائی کا حساب کرنے آئے۔ پیاس معلوم ہوئی تو ملاّح سے پانی لانے کو کہا۔ ملاّح کنوئیں سے پانی لایا۔ سدن کے گھر میں بیٹھے ہوئے باہر سے پانی منگوا کر پینا سدن کے سینہ میں چھری مارنے سے کم نہ تھا +

بالآخر دوسرا سال جاتے جاتے یہاں تک نوبت پہنچی۔ کہ سدن ذرا ذرا سی بات پر سمن سے جھنجھلا جاتا۔ اور چاہے کوئی لاگو بات نہ کہے۔ لیکن لہجہ کلام کانی طور پر دلشکن ہو جاتا تھا +

سمن کو معلوم ہو گیا۔ کہ اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا + اُس نے سمجھا تھا۔ کہ یہیں بہن بہنوئی کے ساتھ عمر تمام ہو جائیگی۔ گھر کا کام کاج کروں گی۔ ایک ٹکڑا کھاؤں گی۔ اور ایک گوشہ میں پڑی رہونگی۔ لیکن افسوس! یہ تختہ بھی اس کے پیروں کے نیچے سے سرک گیا۔ اور اب وہ بے رحم لہروں کے پیروں تلے تھی +

لیکن سمن کو اپنی حالت پر افسوس کتنا ہی ہوا ہو۔ اُسے شانتا یا سدن سے گلہ نہ تھا کچھ تو دینیات کے مطالعہ اور کچھ اپنی حالت کے صحیح علم نے اُسے غایت درجہ حلیم اور منکسر بنا دیا تھا۔ وہ بہت سوچتی کہاں جاؤں۔ جہاں سب بیگانے ہوں۔ کوئی اپنا شناسا نہ ہو۔ لیکن اسے ایسا کوئی مامن نظر آتا تھا۔ اس کا قلب ضعیف ابھی تک ایک سہارے کا محتاج تھا۔ بلا کسی

کے سہارے سے کے بسر اوقات کرنے کا خیال کر کے اس کا کلیجہ تھر تھر کانپنے لگتا تھا۔ وہ تنہا۔ بیکس۔ طوفان دنیا کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔ کون میری حفاظت کرے گا؟ کون مجھے سنبھالے گا؟ یہ خوف اُسے وہاں سے پاؤں نہ نکالنے دیتا تھا +

ایک دن سدن دس بجے کہیں سے گھوم کر آیا۔ اور بولا" کھانا تیار ہونے میں کتنی دیر ہے۔ جلدی کرو مجھے پنڈت امانا تھ سے ملنے جانا ہے چچا صاحب کے یہاں آئے ہوئے ہیں"؛

شانتا نے پوچھا" یہاں کیسے آئے"؟

سدن۔ اب یہ مجھے کیا معلوم۔ ابھی جتین آکر کہہ گیا ہے۔ کہ وہ آئے ہوئے ہیں۔ اور آج ہی چلے جائیں گے۔ یہاں آنا چاہتے تھے۔ لیکن (سمن کی طرف اشارہ کر کے) کسی وجہ سے نہیں آئے +

شانتا نے سمن کی طرف آنکھیں مٹکا کر کہا" تو ذرا بیٹھ جاؤ۔ ابھی یہاں گھنٹوں کی دیر ہے"+

سمن نے جھنجھلا کر کہا" دیر کیا ہے۔ سب کچھ تو تیار ہے۔ آسن بچھا دو پانی رکھ دو۔ میں تھالی پرستی ہوں"+

شانتا۔ ارے تو ذرا ٹھہر ہی جائیں گے۔ تو کیا ہوگا۔ کوئی ڈاک چھوٹی جاتی ہے کچا پکا کھانے سے کیا فائدہ؟

سدن۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ دن بھر کیا ہوتا رہتا ہے۔ ذرا سا کھانا پکنے میں اتنی دیر ہو جاتی ہے +

سدن جب کھانا کھا کر چلا گیا۔ تو سمن نے شانتا سے پوچھا "کیوں شانتی۔ سچ بتا تجھے میرا یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا؟ تیرے دل میں جو کچھ ہے۔ وہ میں جانتی ہوں۔ لیکن جب تک تو اپنی زبان سے دُتکار نہ دیگی۔ میں جانے کا نام نہ لونگی۔ میرے لئے کہیں ٹھکانہ نہیں ہے"۔

شانتا۔ بہن کیسی باتیں کرتی ہو؟ تمہارے رہنے سے گھر سنبھلا ہُوا ہے۔ نہیں تو میرے کئے کیا ہوتا۔

سمن۔ یہ مُنہ دیکھی باتیں مت کرو۔ میں ایسی نادان نہیں ہوں میں تم دونوں کو اپنی طرف سے کچھ کھنچا ہوا پاتی ہوں۔

شانتا۔ تمہاری آنکھوں کی کیا بات ہے۔ وہ تو دل تک کی باتیں دیکھ لیتی ہیں۔

سمن۔ نظریں ملا کر بولو۔ کیا جو کچھ میں کہتی ہوں۔ جھوٹ ہے؟

شانتا۔ جب تمہیں معلوم ہی ہے۔ تو پوچھتی کیوں ہو؟

سمن۔ اسی لئے کہ سب کچھ دیکھ کر بھی آنکھوں پر اعتبار نہیں ہوتا۔ سنسار مجھے چاہے کتنا ہی حقیر سمجھے۔ مجھے اُس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ میرے دل کے حالات سے واقف نہیں ہے۔ لیکن تم سب کچھ دیکھ کر بھی مجھے حقیر سمجھتی ہو۔ اس کا تعجب ہے۔ میں تمہارے ساتھ قریب دو سال سے ہوں۔ اتنے دنوں میں میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو گئی ہو گی۔ کم سے کم ہونا چاہئے تھا۔

شانتا۔ نہیں بہن پرماتما سے کہتی ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہمارے اوپر اتنا بڑا الزام مت لگاؤ۔ تم نے میرے ساتھ جو سلوک کئے ہیں۔ وہ میں کبھی نہ بھولونگی

لیکن بات یہ ہے۔ کہ انکی بدنامی ہو رہی ہے۔ لوگ من مانی باتیں اڑایا کرتے ہیں وہ (سدن) کہتے تھے۔ کہ سبھدرا یہاں آنے کو تیار تھیں۔ لیکن تمہارے یہاں رہنے کا حال سُنا تو نہیں آئیں۔ بہت بُرا نہ ماننا۔ جب دنیا کا یہ حال ہو رہا ہے۔ تو ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں +

سمن نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اُسے اجازت مل گئی۔ اب صرف ایک رکاوٹ اور تھی۔ شانتا تھوڑے ہی دنوں میں بچے کی ماں ہونے والی تھی۔ سمن نے اپنے تئیں سمجھایا۔ اس وقت اسے چھوڑ کر چلی جاؤں۔ تو اسے تکلیف ہو گی۔ کچھ دن اور جھیل لوں۔ جہاں اتنے دن کاٹے ہیں۔ مہینہ دو مہینہ اور سہی + میرے ہی باعث یہ اپنے عزیزوں سے الگ پڑے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں انہیں چھوڑ کر جانا میرا فرض نہیں ہے +

طائر پر بریدہ قفس میں ہی عافیت پاتا ہے +



(۳۰)

پنڈت پدم سنگھ کے چار پانچ مہینوں کے حُسن عمل کا یہ نتیجہ ہُوا۔ کہ بیس پچیس طوائفوں نے اپنی لڑکیوں کو یتیم خانہ میں بھیجنا قبول کر لیا۔ تین عورتوں نے اپنی جایداد یتیم خانہ کے لئے وقف کر دی۔ اور پانچ عورتیں نکاح کرنے پر راضی ہو گئیں + نیک ارادے کبھی بے اثر نہیں ہوتے۔ اگر سماج کو یقین ہو جائے کہ آپ اس کے سچے خادم ہیں۔ تو وہ آپ کے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتی ہے لیکن یہ یقین خالص خادمانہ جوش کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک ضمیر پاک

اور روشن نہ ہو۔ وہ اپنا عکس دوسروں پر نہیں ڈال سکتا۔ پدم سنگھ کے دل میں یہ جوش پیدا ہو گیا تھا۔ ہم میں کتنے ہی ایسے اصحاب ہیں۔ جن کے دماغ میں کوئی قومی خدمت انجام دینے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اکثر اس خیال کی محرک ہماری حرص نمود ہوتی ہے۔ ہم وہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے ہمارا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہو۔ کوئی ایسی تصنیف یا مضمون لکھنا چاہتے ہیں۔ جس کی لوگ قدر کریں۔ اور اکثر ہماری کوششوں کا کچھ نہ کچھ صلہ بھی مل جاتا ہے۔ لیکن ہم جمہور کے دلوں میں گھر نہیں کر سکتے۔ کوئی شخص چاہے وہ کیسی ہی مصیبت میں مبتلا ہو۔ اس آدمی سے اپنا درد دل کہنا نہیں چاہتا۔ جسے وہ اپنا سچا ہمدرد نہ سمجھتا ہو۔

پدم سنگھ کو اب دالمنڈی میں جانے کے بہت موقعے ملتے تھے۔ اور وہ ارباب نشاط کے طرز زندگی کا جتنا بھی مطالعہ کرتے اتنا ہی انہیں صدمہ ہوتا تھا۔ ایسی ایسی نازک اندام۔ پری جمال۔ حسینوں کو محض حظ نفس کے لئے اپنا سب کچھ گنواتے دیکھکر اُن کا دل درد سے بیتاب ہو جاتا تھا۔ آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ انہیں اب محسوس ہو رہا تھا۔ کہ یہ عورتیں اوصاف باطن سے خالی نہیں۔ جذبات حسنہ سے عاری نہیں۔ نیک و بد کے امتیاز سے بے بہرہ نہیں ہیں لیکن نفس کی مطیع ہو کر انکی ساری اخلاقی قوتیں مُردہ ہو گئی ہیں۔ ہوس نے ان کی قوا باطن کو مفلوج اور بے حس کر دیا ہے۔ پدم سنگھ اس دام ہوس کو توڑنا چاہتے تھے۔ ان گم گشتہ حوروں کو راستہ پر لانا چاہتے تھے۔ اس بیخبری کو دور کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جال اتنا مضبوط تھا۔ اور نیند اتنی گہری۔ کہ پہلے چھ مہینوں میں انہیں اس سے زیادہ کامیابی نہ ہو سکی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ شراب کے نشہ میں

انسان کی جو کیفیت ہو جاتی ہے۔ وہی حالت ان عورتوں کی ہو گئی تھی ۔

اُدھر پربھاکر راؤ اور ان کے رفیقوں نے اخراج کی تجویز کے منسوخ شدہ حصوں کو پھر بورڈ میں پیش کیا۔ انہوں نے محض پدم سنگھ سے بدگمان ہو جانے کے باعث ان دونوں حصوں کی مخالفت کی تھی۔ پر اب ان کا جوش اصلاح دیکھ کر وہ انہیں کے بنائے ہوئے اسلحہ سے ان پر وار کر بیٹھے۔ پدم سنگھ اس دن بورڈ میں نہیں گئے۔ ڈاکٹر شیاما چرن نینی تال گئے ہوئے تھے۔ وہ دونو حصے بالاتفاق پاس ہو گئے ۔

بورڈ کی طرف سے علی پور کے قریب طوائفوں کے لئے مکانات بنوائے جا رہے تھے۔ لالہ بھگت رام بڑی مستعدی سے کام کرا رہے تھے۔ کچھ کچے مکانات تھے۔ کچھ پکے۔ کچھ دو سہ منزلے۔ ایک مختصر سا بازار۔ ایک چھوٹا سا شفاخانہ۔ اور ایک مدرسہ بھی زیر تعمیر تھا۔ حاجی ہاشم نے ایک مسجد کی تعمیر شروع کر دی تھی۔ اور سیٹھ چمن لال کی طرف سے ایک مندر بن رہا تھا۔ دینا ناتھ تیواری نے ایک باغ کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ امید تو تھی۔ کہ وقت معین پر کام مکمل ہو جائے گا۔ لیکن بہت عجلت کرنے پر بھی تعمیر میں پورا ایک سال لگ گیا۔ بس اسی کی دیر تھی۔ دوسرے ہی دن طوائفوں کو دال منڈی چھوڑ کر ان نئے مکانات میں آباد ہو جانے کا نوٹس دیدیا گیا۔

لوگوں کو اندیشہ تھا۔ کہ طوائفوں کی جانب سے سخت مخالفت ہو گی لیکن انہیں یہ دیکھ کر پر استعجاب مسرت ہوئی۔ کہ طوائفوں نے خوشی سے اس حکم کی تعمیل کی۔ ساری دال منڈی ایک ہی دن میں خالی ہو گئی۔ جہاں

شب و روز رونق کی بہار رہتی تھی۔ وہاں شام ہوتے ہوتے سناٹا چھا گیا۔

محبوب جان ایک متمول بوڑھی طوائف تھی۔ اُس نے اپنی ساری ملکیت یتیم خانہ کے لئے وقف کر دی تھی۔ شام کو سب طوائفیں اس کے مکان پر جمع ہوئیں۔ وہاں ایک عظیم الشان جلسہ ہُوا۔ شہزادی نے دوران تقریر میں کہا۔ "بہنو آج ہماری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ خداوند تعالےٰ ہمارے ارادوں میں برکت دے۔ اور ہمیں نیک راستہ پر لائے۔ ہم نے بہت دنوں تک بے شرمی اور ذلت کی زندگی بسر کی۔ بہت دنوں تک شیطان کی قید میں رہیں۔ بہت دنوں تک اپنی روح اور ایمان کا خون کیا۔ اور بہت دنوں تک مستی اور عیش پرستی میں غافل رہیں۔ اس دالمنڈی کی زمین ہمارے گناہوں سے سیاہ ہو رہی ہے۔ آج خداوند کریم نے ہماری حالت پر رحم کر کے ہمیں قید معصیت سے نجات دی ہے۔ اس لئے ہمیں اس کا شکر کرنا چاہئے اس میں شک نہیں۔ کہ ہماری اکثر بہنوں کو یہاں سے جلاوطن ہونے کا قلق ہوتا ہوگا۔ اور اس میں بھی شک نہیں۔ کہ اُنہیں آنیوالے دن تاریک نظر آتے ہوں گے۔ ان بہنوں سے میری یہی التجا ہے۔ کہ خدا نے رزق کا دروازہ کسی پر بند نہیں کیا ہے۔ آپ کے پاس وہ ہنر ہے۔ جس کے قدردان ہمیشہ رہیں گے لیکن خدانخواستہ ہم کو آیندہ تکلیفیں بھی ہوں۔ تو جائے ملال نہیں۔ ہمیں جتنی بھی مصیبتیں جھیلنی پڑیں گی۔ اتنا ہی ہمارے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہوگا۔ میں پھر خدا سے دعا کرتی ہوں۔ کہ وہ ہمارے دلوں کو اپنی روشنی سے منور کرے۔ اور ہمیں راہ نیک پر چلنے کی توفیق دے۔

رام بھولی مائی بولیں "ہمیں پنڈت پدم سنگھ شرما کا دل سے ممنون ہونا چاہئے پرماتما انہیں سدا سکھی رکھے"۔

زہرہ جان نے فرمایا "میں اپنی بہنوں سے یہی عرض کرنا چاہتی ہوں۔ کہ وہ آیندہ سے حلال اور حرام کا خیال رکھیں۔ گانا بجانا ہمارے لئے حلال ہے۔ اسی ہنر میں کمال حاصل کرو۔ بدکار رئیسوں کی شہوت کا کھلونا بننا چھوڑ دو۔ بہت دنوں تک گناہوں کی غلامی کی۔ اب ہمیں اپنے تئیں آزاد کرنا چاہیئے۔ ہمیں کیا خدا نے اسی لئے پیدا کیا ہے۔ کہ اپنا حسن۔ اپنی جوانی۔ اپنی روح۔ اپنا ایمان اپنی عزت۔ اپنی حیا۔ حرام کار۔ شہوت پرست آدمیونکی نذر کریں۔ جب کوئی منچلا نوجوان رئیس ہمارے اوپر دیوانہ ہو جاتا ہے۔ تو ہمیں کتنی خوشی ہوتی ہے۔ ہماری نائکہ پھولی نہیں سماتی۔ سفروائی بغلیں بجانے لگتے ہیں۔ اور ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا سونے کی چڑیا پھنس گئی۔ لیکن بہنو یہ ہماری حماقت ہے۔ ہم نے اسے اپنے دام میں نہیں پھنسایا۔ بلکہ خود اس کے دام میں پھنس گئیں۔ اس نے سیم وزر سے ہمیں خرید لیا۔ ہم اپنی عصمت جیسی بے بہا جنس کو کھو بیٹھیں۔ آیندہ سے ہمارا یہ وطیرہ ہونا چاہیئے۔ کہ اگر اپنے میں کسی کو کجروری پر مائل دیکھیں تو اسے برادری سے خارج کر دیں"۔

سندر بائی نے دُرفشانی کی "زہرہ بہن نے یہ بہت اچھی تجویز کی ہے۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ اگر ہمارے یہاں کسی کی آمدورفت ہونے لگے۔ تو ہمیں سوچنا چاہیئے۔ کہ یہ کیسا آدمی ہے۔ اگر ہمیں اس سے محبت ہو۔ اور اُسے بھی ہم سے اُنس ہو۔ تو شادی کر لینی چاہیئے۔ لیکن اگر وہ محض شہوت پرستی کے ارادہ

سے آتا ہو۔ تو اُسے فوراً انکار دینا چاہئے۔ ہمیں اپنی عزت کوڑیوں پر نہ بیچنی چاہئے"۔

رام پیاری نے کہا "سوامی گجانند نے ہمیں ایک کتاب دی ہے جس میں لکھا ہے۔ کہ خوب صورتی ہمارے پہلے جنم کے نیک کاموں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن ہم اپنی پہلی کمائی کو بھی اس جنم میں اُڑا دیتی۔ جو بہنیں زہرہ جان کی تجویز کو پسند کرتی ہوں۔ وہ ہاتھ اُٹھا دیں"۔

اس پر بیس پچیس عورتوں نے ہاتھ اُٹھائے۔

رام پیاری نے پھر کہا "جو بہنیں اس تجویز کو پسند نہ کرتی ہوں۔ وہ بھی اپنے ہاتھ اُٹھا دیں"۔

اس پر ایک ہاتھ بھی نہ اُٹھا۔

ضعیفہ محبوب جان نے فرمایا "مجھے کچھ کہتے ہوئے خوف ہوتا ہے۔ کہ تم لوگ کہو گی۔ سوچوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔ پر آج کے ساتویں دن میں سچ مچ حج کرنے چلی جاؤنگی۔ میری زندگی تو جیسے کٹی ویسے کٹی پر اس وقت آپ کی یہ نیت دیکھ کر مجھے جتنی خوشی ہوتی ہے۔ وہ میں ظاہر نہیں کر سکتی۔ خدا تمہارے پاک ارادوں کو پورا کرے"۔

چند مستورات آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ ان کے چہروں سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ یہ باتیں انہیں ناگوار گزر رہی ہیں۔ لیکن انہیں زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ سفلہ خیالات پاک جذبات کے سامنے دب جاتے ہیں۔

مجلس ختم ہوئی۔ سارا مجمع برہنہ پا علی پور کی طرف چلا۔ جیسے زائرین متبرک مقامات کی طرف چلتے ہیں۔

دالمنڈی میں اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔ نہ طبلوں کی گمک تھی۔ نہ سارنگیوں کی الاپ۔ نہ نغمۂ دلنواز۔ نہ رنگین مزاجوں کے جمگھٹے۔ اناج کے کٹ جانے پر کھیت کی جو حالت ہو جاتی ہے۔ وہی حالت بازار حسن کی ہو رہی تھی +



پنڈت مدن سنگھ کی کئی ماہ تک یہ کیفیت تھی۔ کہ جو کوئی ان کے پاس آتا۔ اُسی سے سدن کی بُرائی کرتے۔ ناخلف ہے۔ آوارہ ہے۔ شُہدا ہے۔ لُچا ہے۔ ایک کانی کوڑی تو دوں گا نہیں۔ بھیک مانگتے پھریں گے۔ تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا + پدم سنگھ کو جبہ نامہ لکھنے کے لئے کئی بار یاد دلایا۔ بھاما کبھی سدن کا چرچا کرتی تو اس سے بگڑ جاتے + گھر سے نکل جانیکی دھمکی دیتے۔ بوگی ہو جاؤں گا۔ سنیاسی ہو جاؤں گا۔ مگر اس چھوکرے کا مُنہ نہ دیکھوں گا +

اس کے بعد ان کے مزاج میں ایک انقلاب ہُوا۔ انھوں نے سدن کا ذکر کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اگر کوئی اس کی بُرائی کرتا۔ تو کچھ اَن سنے سے ہو جاتے کہتے بھائی اب کیوں اُسے کوستے ہو؟ جیسا اُس نے کیا ہے۔ اُسکی سزا آپ بھگتے گا + اچھا ہے یا بُرا ہے۔ میرے پاس سے تو دور ہے۔ اپنے چار پیسے کماتا ہے۔ کھاتا ہے۔ پڑا ہے۔ پڑا رہنے دو + لالہ بیجناتھ ان کے بہت مُنہ لگے تھے۔ ایکدن وہ خبر لائے۔ کہ اُماناتھ نے سدن کو کئی ہزار روپے دیئے ہیں۔ اب ندی پار ایک مکان بن رہا ہے۔ ایک باغیچہ لگ رہا ہے۔ چونا پیسنے کی ایک کل لے لی ہے۔ خوب روپے کماتا ہے۔ اور اُڑاتا ہے۔ مدن سنگھ نے جھنجھلا کر کہا۔ تو کیا

چاہتے ہو۔ کہ وہ بھیک مانگے؟ دوسروں کی روٹیاں توڑے؟ اُمانات بیچارے اُسے کیا روپے دیں گے۔ خود ٹکے ٹکے کو محتاج ہو رہے ہیں۔ سدن نے جو کچھ کیا ہوگا۔ اپنے قوت بازو سے کیا ہوگا۔ وہ لاکھ بُرا ہو۔ لیکن اپاہج نہیں ہے۔ نکما نہیں ہے۔ ابھی جوان ہے۔ شوقین ہے۔ اگر کماتا ہے۔ اور اُڑاتا ہے۔ تو کسی کو کیوں بُرا لگے؟ تمہارے اس گاؤں میں کتنے ہی لونڈے ایسے ہیں۔ جو ایک پیسہ نہیں کماتے۔ لیکن گھر سے روپے اُڑائے جاتے ہیں۔ اور گل چھرے اُڑاتے ہیں۔ سدن اُن سے تو اچھا ہی ہے۔ منشی بیجناتھ بہت خفیف ہوئے۔

مسلہ حرکت کے مطابق کچھ عرصہ کے بعد مدن سنگھ کے دل پر ایک عمل معکوس نے غلبہ کیا۔ دل ایک انتہا سے دوسری انتہا پر جا پہنچا۔ اب سدن کی صورت ہر دم آنکھوں میں پھرا کرتی۔ اُسی کی باتیں یاد آیا کرتیں۔ سب سے اسی کا ذکر کیا کرتے۔ "دیکھو تو کیسا ظالم ہے۔ بے ایمان۔ مجھ سے روٹھنے چلا ہے۔ گویا میں گھر۔ زمین۔ مال اور اسباب۔ سب اپنے سر پر لاد کر لے جاؤں گا۔ ایک بار یہاں آتے نہیں بنتا۔ پیروں میں مہندی رچا کے بیٹھا ہے۔ بیجا کہیں کا۔ بے رحم مجھ سے دماغ کرتا ہے۔ کڑھ کڑھ کر مر جاؤں گا۔ تو بیٹھا میرے نام کو رو دے گا۔ تب بھلے وہاں سے دوڑا آئے گا۔ ابھی نہیں آتے بنتا۔ اچھا دیکھیں تم مجھ سے بھاگ کر کہاں جاتے ہو۔ وہیں چلکر تمہاری خبر لیتا ہوں"۔

کھا پی کر اطمینان سے لیٹتے۔ تو بھاما سے سدن کی باتیں کرنے لگتے "یہ لونڈا لڑکپن میں بھی ضدی تھا۔ جس چیز کے لئے اڑ جاتا تھا۔ اُسے لے ہی کر چھوڑتا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا۔ ایکبار میری پوجا کی جھولی کے لئے کتنا منہا منھ مچایا۔

اور اُسے لے ہی کر چُپ ہُوا۔ بڑا ھٹیلا ہے۔ دیکھو اسکی سخت دلی۔ ایک خط بھی نہیں ڈالتا۔ چپ چاپ کان میں تیل ڈالے بیٹھا ہے۔ گویا ہم لوگ مر گئے" بھاما یہ باتیں سنتی اور روتی۔ مدن سنگھ کے غرور خاندان نے محبت پدری کے آگے سر جھکا دیا تھا +

اس طرح ایک سال سے زیادہ گزر گیا۔ مدن سنگھ بار بار سدن کے پاس جانے کا ارادہ کرتے۔ مگر اس ارادہ پر عمل نہ کر سکتے تھے + ایک بار اسباب بندھوا چکے تھے۔ پر تھوڑی دیر کے بعد اُسے کھُلوا دیا۔ ایکبار اسٹیشن سے لوٹ آئے۔ ان کا دل غرور اور محبت کا کھلونا بنا ہُوا تھا +

اب گھر ہستی کے کاموں میں ان کی طبیعت نہ لگتی۔ کھیتوں میں وقت پر پانی نہیں دیا گیا۔ فصل خراب ہو گئی۔ اسامیوں سے لگان کے روپے نہیں وصول کئے گئے۔ وہ بیچارے روپے لے کر آتے۔ لیکن مدن سنگھ کو روپے لیکر رسید دینی مشکل تھی۔ گڑ گھر میں دھرے دھرے پگھل گیا۔ اسے بیچنے کی فکر نہ کی۔ بھاما کچھ کہتی تو جھنجھلا پڑتے "چولھے میں جائے یہ گھر بار۔ جس کے لئے سب کچھ کرتا تھا۔ جب وہی نہیں ہے۔ تو گرہستی میرے کس کام کی ہے + اب انہیں محسوس ہوا۔ کہ میری ساری تمنائیں۔ ساری مال اندیشیاں۔ ساری مذہب پرستی۔ سارا شوق زیست صرف ایک بنیاد پر قائم تھا۔ اور وہ بنیاد سدن تھا +

ادھر کئی مہینوں سے پدم سنگھ بھی مکان پر نہیں آتے تھے۔ ایک مہم عظیم کے بعد دل پر کسل کا جو غلبہ ہو جاتا ہے۔ وہی کیفیت اسوقت پدم سنگھ پر طاری

تھی۔ مدن سنگھ اس کے پاس بھی خطوط نہ بھیجتے تھے۔ ہاں ان کے خطوط آتے تو بڑے شوق سے پڑھتے، لیکن سدن کا کوئی ذکر نہ پا کر دل شکستہ ہو جاتے تھے۔

ایک دن مدن سنگھ دروازے پر بیٹھے ہوئے پریم ساگر پڑھ رہے تھے۔ کرشن کی داستان طفلی میں انہیں بچوں کا سا لطف آتا تھا۔ شام ہو گئی تھی۔ حروف نظر نہ آتے۔ لیکن انکی طبیعت ایسی لگی ہوئی تھی۔ کہ اٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دفعتہً کتوں کے بھونکنے نے کسی نوآیند کی خبر دی۔ مدن سنگھ کی چھاتی دھڑکنے لگی۔ کہیں سدن تو نہیں آ رہا ہے! کتاب بند کر کے اُٹھے تو پدم سنگھ کو آتے دیکھا۔ "پوچھا سب خیریت ہے؟"

پدم۔ جی ہاں۔ سب ایشور کی دیا ہے۔

مدن۔ بھلا اُس بے ایمان کی بھی کچھ کھوج خبر ملی ہے؟

پدم۔ جی ہاں۔ اچھی طرح ہیں۔ دسویں پانچویں میرے یہاں آیا کرتے ہیں میں بھی کبھی خیریت دریافت کرا لیتا ہوں۔ کوئی تردد کی بات نہیں ہے۔

مدن۔ بھلا ظالم کبھی ہم لوگوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یا بالکل مرا سمجھ لیا۔ کیا یہاں آنے کی قسم کھالی ہے۔ ہم لوگ مر جائیں گے۔ تب آئے گا کیا؟ اگر اسکی یہی منشا ہو تو ہم لوگ کہیں کی راہ لیں۔ اپنا گھر بار لے۔ اپنا انتظام کرے۔ سنتا ہوں وہاں مکان بنوا رہا ہے۔ وہ تو اس مکان میں رہے گا۔ اور یہاں کون رہیگا؟ یہ کس کے لئے چھوڑے دیتا ہے؟

پدم۔ جی نہیں۔ مکان وکان تو کہیں نہیں بنواتے۔ یہ آپ سے کسی نے جھوٹ ہی اُڑا دیا۔ ہاں ایک چھپنے کی کل کھڑی کر لی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے

کہ ندی پار تھوڑی سی زمین بھی لینا چاہتے ہیں ۔

مدن ۔ تو اُس سے کہدینا ۔ پہلے یہاں آکر گھر میں آگ لگا جائے ۔ تب وہاں جگہ زمین جو چاہے خریدے ۔

پدم ۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں ۔ وہ محض آپ لوگونکی ناخوشی کے خوف سے یہاں نہیں آتا ۔ آج اُسے معلوم ہو جائے ۔ کہ آپ نے اسکی خطا معاف کردی ۔ تو سر کے بل دوڑا آئے ۔ میرے پاس آتا ہے ۔ تو گھنٹوں آپ ہی کا ذکر کرتا رہتا ہے ۔ آپ کی مرضی ہو تو وہ کل یہاں حاضر ہو جائے ۔

مدن ۔ نہیں میں اُسے بُلاتا نہیں ۔ ہم اس کے کون ہوتے ہیں ۔ کہ وہ یہاں آئے گا ۔ لیکن یہاں آئے ۔ تو کہدینا ذرا اپنی پیٹھ مضبوط کر رکھے ۔ اُسے دیکھتے ہی میرے سر پر شیطان سوار ہو جائے گا ۔ اور میں ڈنڈا لے کر پل پڑوں گا ۔ احمق مجھ سے روٹھنے چلا ہے ۔ تب نہیں روٹھا تھا ۔ جب میرے پوجا کے وقت پوتھی پر رال ٹپکاتا تھا ۔ کھانے کی تھالی کے پاس پیشاب کرتا تھا ۔ اس کے مارے میرے کپڑے صاف نہ رہنے پاتے تھے ۔ اُجلے کپڑوں کو ترس کے رہ جاتا تھا ۔ مجھے صاف کپڑے پہنے دیکھتا تو بدن میں دھول مٹی لپیٹے ہوئے آکر سر پر سوار ہو جاتا ۔ تب کیوں نہیں روٹھا تھا ۔ آج روٹھنے چلا ہے ۔ اسکی ایسی گوشمالی کروں ۔ کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے ۔

دونوں بھائی گھر میں گئے ۔ بھاما بیٹھی ہوئی گائے کو بھوسی کھلا رہی تھی ۔ پدم سنگھ کو دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی ۔ اور بولی " بھلا تمہارے درشن تو ہوئے ۔ چار قدم پر رہتے ہو ۔ لیکن اتنا بھی نہیں ہوتا ۔ کہ مہینہ میں ایکبار تو جاکر دیکھ آئیں ۔

کہ گھر والے مرے یا جیتے ہیں۔ کہو کُشل سے تو ہو؟

پدم سنگھ۔ ہاں سب آپکی دعا ہے۔ کہو کھانا کیا پک رہا ہے۔ مجھے اسوقت کھیر حلوا اور ملائی کھلاؤ تو وہ مژدہ سُناؤں کہ پھڑک جاؤ۔ پوتا مبارک ہو۔

بھاما کے افسردہ چہرہ پر مسرت کی سُرخی چھا گئی۔ اور آنکھوں کی پتلیاں پھول کی طرح کھل گئیں۔ بولی "چلو گھی شکر کے مٹکے میں ڈبا دوں۔ جتنا کھاتے بنے کھاؤ"۔

مدن سنگھ نے مُنہ بنا کر کہا۔ "ارے ایہ تم نے بُری خبر سُنائی۔ کیا ایشور کے دربار میں اُلٹا انصاف ہوتا ہے۔ میرا بیٹا چھن جائے۔ اور اُسے بیٹا مل جائے۔ اب وہ ایک سے دو ہو گیا۔ میں اس سے کیونکر جیت سکوں گا۔ ہارنا پڑا۔ وہ مجھے ضرور کھینچ لے جائے گا۔ میرے تو قدم ابھی سے اُکھڑ گئے۔ سچ مچ ایشور کے یہاں بُرائی کرنے پر بھلائی ہوتی ہے۔ یہ اُلٹی بات یا نہیں؟ اب میں اُلٹی چال چلوں گا۔ آپ ہی روٹھا تھا۔ آپ ہی منانے جاؤں گا۔ کے دن کا ہُوا؟"

پدم آج چوتھا دن ہے۔ مجھے فرصت ہی نہیں ملی۔ ورنہ پہلے ہی دن آتا۔

مدن۔ کوئی مضایقہ نہیں۔ ہم چھٹی تک پہنچ جائیں گے۔ بس کل سویرے چلو۔

بھاما پھولی نہ سماتی تھی۔ جی چاہتا تھا کسے کیا دیدوں۔ کیا لُٹا دوں امنگ ہو رہی تھی۔ کہ گھر میں گانا ہو۔ دروازہ پر شہنائی بجے۔ پڑوسنیں بلائی جائیں۔ نغمۂ طرب سے سارا گاؤں گلزار ہو جائے۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ گویا آج دُنیا میں ایک غیر معمولی واقعہ ہو گیا ہے۔ گویا ساری دُنیا اولاد سے محروم ہے۔ ایک میں ہی بیٹے پوتے والی خوش نصیب ہوں۔

ایک مزدور نے آکر کہا۔ "بھابی دروازے پر ایک سادھو آئے ہیں"+
بھامانے فوراً اتنی جنس بھیج دی۔ جو چار آدمیوں کی خوراک سے بھی زیادہ تھی+
کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد بھاما اپنی دونوں لڑکیوں کو لیکر بیٹھ گئی
اور آدھی رات تک گاتی بجاتی رہی +

(۳۲)

جس طرح کوئی آدمی طمع میں پڑکر کوئی زیور چرا لیتا ہے۔ لیکن بیدار ہونے پر اُسے اس چیز کو دیکھنے سے بھی شرم آتی ہے۔ اسی طرح سدن بھی سمن سے محترز رہتا تھا۔ وہ اُسے ذلیل سمجھتا۔ اور اُسکی توہین کرتا تھا +

دن بھر کام کرنے کے بعد شام کو اسکی طبیعت اس پیشہ سے بیزار ہو جاتی۔ بالخصوص چونے کے کام میں اُسے سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ وہ سوچتا اس سمن کے باعث میں گھر سے جلاوطن ہو رہا ہوں۔ اسی نے مجھے راندۂ درگاہ بنا رکھا ہے۔ کیسے آرام سے مکان پر رہتا تھا۔ چین سے کھاتا تھا۔ اور موج کرتا تھا۔ اسی نے میرے سر پر یہ مصیبت ڈالدی۔ اس کا پکایا ہُوا کھانا کھانے میں بھی اب اُسے عار ہوتا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ کسی طرح اس سے گلا چھوٹ جائے۔ یہ وہی سدن ہے۔ جو سمن پر دیتا تھا۔ اس کے دلاویز تبسم پر۔ اسکی نگاہ شوخ پر۔ اسکی شیریں اداؤں پر نثار ہوتا تھا۔ پر آج سمن اسکی نگاہوں میں اس قدر گر گئی ہے!

سدن نے ادھر برسوں سے لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اور جب سے چونے کی کل لے لی تھی۔ تب سے اسے روزانہ اخبار دیکھنے کی بھی مہلت نہ ملتی تھی + اب وہ

سمجھتا تھا۔ اخبار بینی ان لوگوں کا کام ہے۔ جنہیں اور کوئی کام نہیں ہے۔ جو سارے دن پڑے مکھیاں مارا کرتے ہیں۔ لیکن اپنے بالوں کو سنوارنے کے لئے۔ ہارمونیم بجانے کے لئے۔ نہ جانے کیونکر وقت مل جاتا تھا۔

کبھی کبھی پچھلی باتیں یاد کر کے وہ دل میں کہتا۔ اسوقت میں کیسا اندھا ہو گیا تھا۔ اسی سمن پر لٹو ہو رہا تھا۔ اب وہ اپنی ثقاہت پر ناز کرتا تھا۔ ندی کے کنارے وہ روزانہ ہزاروں عورتوں کو دیکھا کرتا تھا۔ لیکن کبھی اس کے دل میں فاسد خیالات نہ پیدا ہوتے۔ سدن اسے اپنا اخلاقی استحکام سمجھتا تھا۔

لیکن جب شانتا کے وضع حمل کا زمانہ قریب آیا۔ اور وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں مضمحل اور مجہول پڑی رہنے لگی۔ تو سدن کو معلوم ہوا۔ کہ میں بڑے مغالطہ میں پڑا ہوا تھا۔ جسے میں اخلاقی استحکام سمجھتا تھا۔ وہ فی الواقع محض میری خوشنما کی سیری کا نتیجہ تھا۔ اب وہ شام کو کام کر کے واپس آتا تو شانتا کا روئے شگفتہ اسکا خیر مقدم نہ کرتا۔ وہ اپنی چارپائی پر اُداس پڑی رہتی۔ کبھی اس کے سر میں درد ہوتا۔ کبھی جسم میں۔ کبھی بخار ہو جاتا۔ کبھی متلی ہونے لگتی۔ اس کا رُخ روشن زرد ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ جسم میں خون ہی نہیں ہے۔ سدن کو اسکی یہ حالت دیکھ کر رنج ہوتا تھا۔ وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا ہوا اس کا دل بہلایا کرتا تھا۔ لیکن اس کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُسے یہاں بیٹھنا ناگوار گزر رہا ہے۔ وہ کسی نہ کسی بہانہ سے اُٹھ آتا۔ نفس نے پھر سرکشی شروع کی۔ خواہشات میں پھر ہیجان ہونے لگا۔ وہ نوخیز ملاحنوں سے مذاق کرتا۔ گنگا کنارے جاتا تو عورتوں کو پُر اشتیاق نظروں سے دیکھتا۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ تقاضائے نفس سے بیتاب ہو کر

دالمنڈی کی طرف چلا۔ وہ کئی مہینوں سے ادھر نہیں آیا تھا۔ آٹھ بج گئے تھے۔ وہ ایک وارفتگی کے عالم میں قدم بڑھائے چلا جاتا تھا۔ وہ کبھی دو قدم آگے چلتا۔ تب چُپ چاپ کھڑا ہو کر کچھ سوچتا۔ اور پیچھے پھرتا۔ لیکن دو چار قدم چل کر پھر لوٹ پڑتا۔ اسوقت اسکی حالت اس مریض کی سی ہو رہی تھی۔ جو خوان لذت سامنے دیکھکر اسپر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور بدپرہیزی کے انجام کی مطلق فکر نہیں کرتا۔

لیکن جب وہ دالمنڈی میں پہنچا۔ تو وہاں وہ پہلے کی سی رونق نہ دکھائی دی۔ دو چار تمبولیوں کی دُکانیں تھیں۔ لیکن ان پر رنگیں مزاجوں کا ہجوم نہ تھا۔ حلوائیوں اور نانبائیوں کی دُکانیں بند تھیں۔ بالاخانوں پر ماہ رویوں کے جلوے نہ نظر آئے۔ نہ طبلے اور سارنگی کی صدائیں سنائی دیں۔ ساری بستی اُجاڑ ہو گئی تھی۔ اب سدن کو یاد آیا۔ کہ بازار حسن یہاں سے اُٹھ گیا، اسکی طبیعت کچھ منغض ہو گئی۔ لیکن ایک ہی لمحہ کے بعد اُسے ایک عجیب مسرت کا احساس ہوا۔ گویا وہ کسی بے رحم سپاہی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو۔ وہ سپاہی اُسے کشاں کشاں لئے جاتا تھا۔ اس کے پنجہ سے اپنے تئیں چھڑا لینے کی اُس میں قدرت نہ تھی۔ پر تھانہ میں پہنچکر سپاہی نے دیکھا۔ کہ تھانہ بند ہے۔ نہ تھانے دار ہے۔ نہ کوئی کانسٹیبل۔ نہ چوکیدار! سدن کو اب اپنے دل کی کمزوری پر ندامت ہوئی۔ اپنے استحکام پر اُسے جو غرور تھا۔ وہ پاش پاش ہو گیا۔

وہ لوٹنا چاہتا تھا۔ لیکن جی میں آیا۔ کہ جب یہاں تک آیا ہوں۔ تو خوب سیر ہی کیوں نہ کر لوں۔ آگے بڑھا تو وہ مکان نظر آیا۔ جس میں سمن رہتی تھی۔ وہاں ایک نغمہ دلنواز کی صدا اُس کے کانوں میں آئی۔ اُس نے تعجب سے اوپر

دیکھا۔ تو ایک سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ اسپر لکھا ہوا تھا "سنگیت پاٹ سالا۔ سدن اوپر چڑھ گیا۔ اس کمرہ میں اُس نے مہینوں سمن کی ناز برداریاں کی تھیں۔ وہ پچھلی صحبتیں اسکی نظروں میں پھرنے لگیں۔ وہ ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور گانا سننے لگا۔ بیس پچیس آدمی بیٹھے ہوئے گانا بجانا سیکھ رہے تھے۔ کوئی ستار بجاتا تھا۔ کوئی پکھاوج۔ کوئی سرود۔ ایک بوڑھا اُستاد باری باری سے انکی اصلاح کر رہا تھا۔ وہ اس فن میں ماہر تھا۔ سدن کا گانا سننے میں ایسا جی لگا۔ کہ وہ قریب آدھ گھنٹہ تک وہاں بیٹھا رہا۔ اُسے بڑی خواہش ہو رہی تھی۔ کہ میں بھی یہاں گانا سیکھنے آیا کرتا۔ لیکن ایک تو اُس کا مکان دور تھا۔ دوسرے رات کو عورتوں کو تنہا چھوڑ کر یہاں آنا مشکل تھا۔

وہ اُٹھنے ہی والا تھا۔ کہ اتنے میں اسی بوڑھے اُستاد نے ستار پر یہ گیت گانا شروع کیا:-

دیا مئی۔ بھارت کو اپناؤ

اِس پد نے سدن کے دل میں اعلیٰ جذبات کا ایک چشمہ سا کھول دیا۔ فلاح قوم۔ خدمت ملک اور قومی عروج کے ولولے۔ اس کے دل میں جوش مارنے لگے اس کا ساز قلب ان سُروں سے گونج اٹھا۔ ایک دیوی کی روحانی صورت اس کی نگاہ باطن کے روبرو کھڑی ہو گئی۔ ایک لاغر۔ نحیف۔ خستہ حال۔ غمگین بوڑھا عاجزانہ نظروں سے دیوی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور دونوں ہاتھ اُٹھائے دیوی سے الحاج کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

بھارت کو اپناؤ

سدن نے عالم خیال میں اپنے تئیں مفلس کسانوں کی دلجوئی کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ زمیندار کے کارندے سے منت کر رہا تھا۔ کہ ان بیکسوں پر رحم کرو۔ کسان اس کے پیروں پر گرے پڑتے تھے۔ انکی عورتیں اُسے دعائیں دیرہی تھیں۔ وہ خود اس خیال بارات کا دولہا بنا ہوا تھا۔ وہ جب یہاں سے اُٹھا تو قومی خدمت کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ مگر تھوڑی ہی دور چلا تھا۔ کہ اُسے سدربائی کے مکان کے مقابل ایک ہجوم نظر آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا۔ کہ آج یہاں کنور انرودھ سنگھ ایک "کسان سبھا" قائم کرنے والے ہیں۔ سبھا کا مقصد یہ ہوگا۔ کہ کسانوں کو زمینداروں کے دست ظلم سے بچائے۔ سدن کے دل میں ابھی ابھی کسانوں سے جو ہمدردی پیدا ہوگئی وہ سرد پڑ گئی۔ وہ زمیندار تھا۔ اور کسانو پر رحم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے یہ منظور نہ تھا۔ کہ کوئی زمینداروں کو دباکر انہیں رعایتوں پر مجبور کرے۔ اس نے دل میں کہا شاید یہ لوگ زمینداروں کے حقوق کے مخالف ہیں۔ ان کے اختیارات کو مٹانا چاہتے ہیں۔ اس لئے اب ہم کو بھی ہوشیار ہو جانا چاہئے۔ اور اپنی محافظت کی فکر کرنی چاہئے۔ طبع انسانی کو دباؤ سے کتنی نفرت ہے! سدن نے یہاں ٹھیرنا بیکار سمجھا۔ نو بج گئے تھے گھر لوٹ آیا۔



(۳۳)

شام کا وقت ہے۔ آسمان پر شفق چھائی ہوئی ہے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے لہروں کو گدگدا رہے ہیں۔ لہریں مسکراتی ہیں۔ اور کبھی کبھی کھل کھلا کر ہنس

پڑتی ہیں۔ تب ان کے موتی کے سے دانت چمک اُٹھتے ہیں۔ سدن کا خوشنما جھونپڑا آج پھولوں اور لتاؤں سے خوب سجا ہوا ہے۔ دروازے پر ملاحوں کی بھیڑ بھاڑ ہے۔ اندر اُنکی عورتیں بیٹھی ہوئی شادیانے گا رہی ہیں۔ آنگن میں بھٹی کھدی ہوئی ہے۔ اور بڑے بڑے دیگ چڑھے ہوئے۔ آج سدن کے نوزائیدہ بچّے کی چھٹی ہے۔ یہ اُسی کا جشن ہے۔

لیکن سدن بہت غمگین نظر آتا ہے۔ وہ سامنے چبوترے پر بیٹھا ہُوا گنگا کی طرف تاک رہا ہے۔ اس کے دل میں اُنہیں موجوں کی طرح خیال کی لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ نہ! وہ لوگ نہ آئیں گے! آنا ہوتا تو آج چھ دن گزر گئے۔ ابتک آ نہ جاتے۔ اگر میں جانتا کہ وہ نہ آئیں گے۔ تو میں چچا صاحب کو بھی اسکی خبر ندیتا۔ ان لوگوں نے مجھے سمجھ لیا ہے۔ کہ مر گیا۔ وہ مجھ سے کوئی سرکار نہیں رکھنا چاہتے۔ میں جیُوں یا مروں۔ انہیں پروا نہیں ہے۔ لوگ ایسی تقریبوں میں اپنے دشمن کے گھر بھی جاتے ہیں۔ میں دشمن سے بھی بدتر ہوں۔ محبت سے نہ آتے۔ رسماً ہی آتے۔ دکھاوے کے لئے ہی آتے۔ مجھے معلوم ہو جاتا کہ دُنیا میں میرے کوئی ہے۔ اچھا نہ آئیں۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کام سے مہلت پاؤں تو ایکبار میں خود وہاں جاؤں گا۔ اور ہمیشہ کے لئے نپٹارا کر آؤں گا۔ بچّہ کیسا خوب صورت ہے! کیسے لال لال ہونٹ ہیں۔ بالکل مجھی کو پڑا ہے۔ ہاں آنکھیں شانتا کی ہیں۔ میری طرف کیسا ٹکٹکی ٹک تاکتا تھا۔ دادا کو تو میں نہیں کہتا لیکن اماں اُسے دیکھیں تو ایکبار گود میں ضرور لے لیں۔ دفعتہً سدن کے دل میں خیال پیدا ہُوا۔ اگر میں مر جاؤں تو کیا ہو؟ اس لڑکے کی پرورش کون کریگا؟ کوئی نہیں۔ سنسار میں میرے سواء اس کا اَور کوئی نہیں ہے۔ نہیں نہیں دادا کو اس پر ضرور رحم آئیگا۔ وہ

اتنے سخت دل نہیں ہیں۔ ذرا دیکھوں سیونگ بنک میں میرے کتنے روپے ہیں۔ ابھی ایک ہزار بھی پورے نہیں! زیادہ نہیں۔ اگر میں پچاس روپے ماہوار بھی جمع کرتا جاؤں تو سال میں چھ سو ہو جائیں گے۔ جونہی دو ہزار پورے ہوئے میں نے گھر بنوانا شروع کیا۔ دو کمرے باہر۔ پانچ کمرے اندر۔ دروازے پر محرابدار سائبان۔ پٹاؤ کے اوپر دو کمرے۔ جب ایسا مکان بنے تو البتہ کچھ زندگی کا لطف آئے۔ کرسی خوب اونچی دوں گا۔ کم سے کم پانچ فٹ۔ اس سے مکان کی شان دوبالا ہو جائے گی۔

سدن اسی خیالی پلاؤ کے مزے لے رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا تھا۔ کہ ناگاہ اُس نے سڑک کی طرف سے ایک گاڑی آتے ہوئے دیکھی۔ گاڑی کی دونوں بتیاں بلّی کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ کون آ رہا ہے؟ چچا صاحب کے سوا اور کون ہوگا! میرا اور ہے ہی کون؟

اتنے میں گاڑی قریب آگئی۔ اس میں سے مدن سنگھ اُترے۔ اس گاڑی کے پیچھے ایک اور گاڑی تھی۔ سبھدرا اور بھاما اس میں سے اُتریں۔ سدن کی دونوں بہنیں بھی تھیں۔ جیتن کوچ بکس پر سے اُتر کر لالٹین دکھانے لگا۔ سدن نے انہیں دیکھا پر اُن سے ملنے کے لئے دوڑا نہیں۔ وہ موقع گزر چکا تھا۔ جب وہ انہیں منانے جاتا۔ اب اُس کے روٹھنے کی باری تھی۔ وہ چبوترے پر سے اُٹھ کر جھونپڑے میں چلا گیا۔ گویا کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ اُس نے دل میں کہا۔ یہ لوگ سمجھتے ہوں گے۔ کہ اُن کے بغیر میں بے حال ہوا جاتا ہوں۔ لیکن جس طرح اُنہیں میری پروا نہیں۔ اُسی طرح میں بھی اُنکی پروا نہیں کرتا۔

سدن جھونپڑے میں جا کر جھانک رہا تھا۔ کہ دیکھیں یہ لوگ کیا کرتے

ہیں۔ جیتن نے آکر دروازے پر آواز دی۔ کئی ملاح ادھر اُدھر سے دوڑے۔ سدن باہر نکل آیا۔ اور دور ہی سے اپنی ماں کو پرنام کرکے ایک کنارے کھڑا ہو گیا۔

مدن سنگھ بولے "تم تو اس طرح کھڑے ہو۔ گویا مجھے پہچانتے ہی نہیں ہو۔ میرے نہ سہی۔ پر ماں کے قدم چوم کر دعا تو لے لو"۔

سدن نے بیگانہ پن سے کہا "میرے چھونے سے آپ کا دھرم بگڑ جائیگا"۔

مدن سنگھ نے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا "دیکھتے ہو انکی باتیں۔ میں تم سے کہتا نہ تھا۔ کہ وہ ہم لوگوں کو بھول گیا ہوگا۔ لیکن تم خواہ مخواہ کھینچ لائے۔ اپنے ماں باپ کو دروازہ پر کھڑے دیکھ کر بھی اسے درد نہیں آتا"۔

بھاما نے آگے بڑھ کر کہا "بیٹا سدن۔ دادا کے پیروں پر گرو۔ تم سمجھ دار ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو"۔

سدن اس سے زیادہ سرد مہری نہ کر سکا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے باپ کے پیروں پر گر پڑا۔ مدن سنگھ بھی رونے لگے۔ اس کے بعد وہ ماں کے پیروں پر گرا۔ اس نے اُٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔ اور دعائیں دیں۔ شفقت سعادت اور عفو کا کیسا روشن۔ کیسا نشاط انگیز منظر تھا۔ ماں باپ کے دل مسرت سے اُمڈے ہوتے ہیں۔ اور بیٹے کے دل میں حسن ارادت کی موجیں اُٹھ رہی ہیں۔ اس خلوص جذبات سے دل کے تاریک گوشے بھی روشن ہو گئے ہیں۔ غرور باطل اور خوف رسوائی حشرات کی طرح نکل بھاگے ہیں۔ اور وہاں اب حق اور انسانیت کا مسکن ہے۔

خوشی کے مارے سدن کے پیر زمین پر نہیں پڑتے۔ اب وہ ملاحوں کو کوئی نہ کوئی کام کرنے کا حکم دیکر دکھا رہا ہے۔ کہ میرا یہاں کتنا رعب ہے۔ کوئی پیا...

نکالنے جاتا ہے۔ کوئی گنگا جل لانے جا رہا ہے۔ کوئی بازار دوڑا جاتا ہے۔ مدن سنگھ پھولے نہیں سماتے۔ اور اپنے بھائی کے کانوں میں کہتے ہیں "یہ تو بڑا ہوشیار نکلا۔ میں سمجھتا تھا۔ کہ کسی طرح پڑا ہوا دن کاٹ رہا ہوگا۔ لیکن یہاں تو بڑے ٹھاٹ ہیں" +

اُدھر بھاما اور سبھدرا اندر گئیں۔ بھاما حیرت سے چاروں طرف دیکھتی تھی۔ کیسی صفائی ہے۔ سب چیزیں قرینہ سے رکھی ہوئی ہیں۔ اسکی بہن بڑی گُن وان معلوم ہوتی ہے +

دونوں زچہ خانہ میں گئیں۔ شانتا نے دونوں کے قدم چومے۔ بھاما نے بچے کو گود میں لے لیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا۔ گویا یہ کرشن کا اوتار ہے۔ اسکی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے +

تھوڑی دیر میں اُس نے آکر مدن سنگھ سے کہا۔ "اور جو کچھ ہو پر تم نے بہو بڑی سندر پائی ہے۔ گلاب کا پھول ہے۔ اور لڑکا تو بھگوان کا اوتار ہی معلوم ہوتا ہے" +

مدن سنگھ نے کہا "ایسا صاحب اقبال نہ ہوتا تو۔ مدن سنگھ کو کھینچ کیونکر لاتا" +

بھاما۔ بہو بڑی سوشیل معلوم ہوتی ہے +

مدن۔ تبھی تو سدن نے ماں باپ کو تیاگ دیا تھا +

سب کے سب اپنی اپنی دھن میں مگن تھے۔ پر کسی کو خبر نہ تھی۔ کہ اُبھاگنی سمن کہاں ہے +



سمن گنگا کنارے سندھیا کرنے گئی ہوئی تھی۔ لوٹی تو اسے جھونپڑے کے دروازے

پر گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ اس نے پدم سنگھ کو پہچانا۔ سمجھ گئی۔ کہ سدن کے باپ آگئے۔ وہ آگے قدم نہ رکھ سکی۔ اس کے پیروں میں بیڑی سی پڑ گئی۔ اسے معلوم ہوگیا کہ اب میرے لئے وہاں جگہ نہیں ہے۔ اب یہاں سے میرا ناتا ٹوٹتا ہے۔ وہ صورت تصویر کھڑی سوچنے لگی۔ کہ کہاں جاؤں؟

ادھر ایک ماہ سے دونوں بہنوں میں خاصی بدمزگی پیدا ہوگئی تھی۔ وہی شانتا جو بدھوا آشرم میں سوز اور درد اور حلم کی مورت بنی ہوئی تھی۔ اب ہمیشہ سمن کو جلانے اور رلانے پر آمادہ رہتی تھی۔ اُس وقت شانتا کو ہمدرد کی ضرورت تھی۔ وہ ایک غمگسار کی طالب تھی۔ درد الفت نے اسے درد شناس۔ رقیق اور فیاض بنا دیا تھا۔ پر اب اپنا پریم رتن پاکر اس کا دل کسی کوعروج آدمی کی طرح سخت اور خشک ہوگیا تھا۔ اُسے یہ خوف کھائے جاتا تھا۔ کہ کہیں سدن سمن کے دام الفت میں اسیر نہ ہوجائے۔ سمن کی پوجا پاٹ ترک اور زہد کی اُسکی نگاہوں میں کچھ وقعت نہ تھی۔ وہ اسے ریاکاری خیال کرتی تھی۔ سمن سر میں تیل ڈالنے یا صاف کپڑے پہننے کے لئے ترس جاتی تھی۔ شانتا اسے سمجھتی تھی۔ وہ سمن کے طور وطریق کو بڑی تیز نگاہوں سے دیکھا کرتی تھی۔ سدن سے سمن کو جو کچھ کہنا ہوتا وہ شانتا سے کہتی۔ یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی شانتا کسی نہ کسی حیلہ سے رسوئی میں آبیٹھتی تھی۔ وہ وضع حمل کے قبل ہی سمن کو کسی طرح وہاں سے ٹالنا چاہتی تھی۔ کیونکہ زچہ خانہ میں مقید ہوکر وہ سمن کی قرار واقعی دیکھ بھال نہ کرسکے گی۔ اسے اور سب تکلیف منظور تھی۔ لیکن یہ جلن نہ سہی جاتی تھی۔

مگر سمن سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہ دیکھتی تھی۔ سب کچھ سنتے ہوئے بھی کچھ نہ سنتی تھی۔ ندی میں ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح وہ اس سہارے کو چاہے وہ تنکا ہی

کیوں نہ ہو۔ نہ چھوڑ سکتی تھی۔ پر اس وقت سدن کے والدین کو وہاں دیکھ کر اُسے یہ سہارا چھوڑنا پڑا۔ ارادہ جو کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ محل نے کر دکھایا۔ اُس نے ندی میں ڈوبنے کا کا تصفیہ کر لیا۔

وہ پاؤں دباتے ہوئے۔ آہستہ آہستہ جھونپڑے کے پچھواڑے آئی۔ اور کان لگا کر سننے لگی۔ کہ دیکھوں یہ لوگ میرا کچھ چرچا تو نہیں کر رہے ہیں۔ وہ آدھ گھنٹہ تک اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ بھاما اور سبھدرا اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھیں آخر اس نے بھاما کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ کیا اب اسکی بہن یہاں نہیں رہتی کیا؟

سبھدرا۔ رہتی کیوں نہیں۔ وہ کہاں جانے والی ہے؟

بھاما۔ دکھائی نہیں دیتی۔

سبھدرا۔ کہیں گئی ہوگی۔ گھر کا سارا کام وہی سنبھالے ہوئے ہے۔

بھاما۔ آئے تو اُس سے کہہ دینا۔ وہیں باہر لیٹ رہے۔ سدن اسی کا بنایا کھاتا ہوگا؟

شانتا زچہ خانہ کے اندر سے بولی "نہیں ابھی تک تو میں ہی بناتی تھی۔ آج کل وہ اپنے ہاتھ سے بنا لیتے ہیں"۔

بھاما۔ تب بھی گھڑے برتن تو وہ چھوتی ہی ہوگی۔ گھڑے سب پھنکوا دو۔ برتن پھر سے ڈھل جائیں گے۔

سبھدرا۔ باہر کہاں سونے کی جگہ ہے؟

بھاما۔ ہو چاہے نہ ہو لیکن میں تو اسے نہ سونے دونگی۔ ایسی عورت کا کیا اعتبار؟

سبھدرا۔ نہیں بہن وہ اب ایسی نہیں ہے۔ وہ بڑے نیم دھرم سے رہتی ہے۔

بھاما۔ جیو وہ بڑے نیم دھرم سے رہنے والی سات گھاٹ کا پانی پی کے آج نیم والی

بنی ہے۔ وہ اب دیوی ہو جائے تو بھی میں اس کا اعتبار نہ کروں +

سمن کو اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ رہی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے لوہا لال کر کے دل میں چبھا دیا۔ اُلٹے پاؤں لوٹی۔ اور اسی تاریکی میں ایک طرف کو چل کھڑی ہوئی۔ خوب اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ راستہ بھی صاف نہ نظر آتا تھا۔ پر سمن گرتی پڑتی چلی جاتی تھی۔ معلوم نہیں کہاں کدھر۔ وہ اپنے ہوش میں نہ تھی۔ لاٹھی کھا کر تیورائے ہوئے کتے کی طرح وہ بدحواس بھاگی چلی جاتی تھی۔ سنبھلنا چاہتی تھی۔ پر سنبھل نہ سکتی تھی۔ یہانتک کہ اس کے پیر میں ایک بڑا کانٹا چبھ گیا۔ وہ پیر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ چلنے کی طاقت نہ رہی +

غشی کے بعد ہوش میں آنیوالے آدمی کی طرح اُس نے اِدھر اُدھر چونک کر دیکھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ خوب گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ صرف گیدڑ اپنا بے سرا راگ الاپ رہے تھے۔ یہاں میں اکیلی ہوں۔ یہ سوچکر سمن کے رونئیں کھڑے ہو گئے۔ اکیلا پن کسے کہتے ہیں۔ یہ اُسے آج معلوم ہوا۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اکیلی ہوں یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ اُسے اپنے چاروں طرف انواع و اقسام کی مخلوق فضا میں بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ یہانتک کہ اُس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ تنہائی میں وَاہمہ انتہا درجہ صورت کش ہو جاتا ہے +

سمن سوچنے لگی میں کیسی بدنصیب ہوں۔ اور تو اور اپنی ہی سگی بہن اب میری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں نے اُسے کتنا اپنا نا چاہا۔ مگر وہ میری نہ ہوئی۔ میرے ماتھے پر کلنک کا داغ لگ گیا۔ اور وہ اب دھونے سے نہیں دھل سکتا۔ میں اس کو یا کسی غیر کو کیوں الزام دوں یہ سب میرے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ آہ! ایڑی میں کیسا درد ہو رہا ہے۔ یہ کانٹا کیسے نکلے گا۔ اندر اس کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ کیسا ٹیک رہا ہے۔ نہیں میں کسی

کو الزام نہیں دے سکتی۔ کانٹے تو میں نے بوئے ہیں پھل کون کھائے گا۔ میں کیسی اندھی ہو گئی۔ کہ محض نفس کی لذت کے لئے اپنی روح کا خون کر بیٹھی۔ مجھے تکلیف ضرور تھی۔ میں گہنے کپڑے کو ترستی تھی۔ اچھا کھانے کو ترستی تھی۔ پریم کو ترستی تھی۔ اس وقت مجھے اپنی زندگی اجیرن معلوم ہوتی تھی۔ مگر وہ حالت بھی تو میرے پچھلے جنم کے کاموں ہی کا نتیجہ تھی! اور کیا ایسی عورتیں نہیں ہیں۔ جو اس سے کہیں زیادہ مصیبتیں جھیل کر اپنی عصمت کو بچاتی ہیں۔ دمینتی پر کیسی کیسی آفتیں آئیں۔ سیتا جی کو رام چندر نے گھر سے نکال دیا۔ اور وہ برسوں جنگلوں میں طرح طرح کی مصیبتیں اٹھاتی رہیں۔ ساوتری پر کیسے کیسے سانحے گذرے پر وہ ثابت قدم رہیں۔ اتنی دور کیوں جاؤں۔ میرے ہی پڑوس میں کتنی عورتیں رو رو کر دن کاٹ رہی تھیں۔ امولا میں وہ بچاری اہیرن کیسی کڑیاں جھیل رہی تھی شوہر برسوں پردیس سے نہ آتا تھا۔ بچاری فاقے کر کے پڑ رہتی تھی! ہائے اسی حسن نے میری مٹی خراب کی! اپنے حسن کے غرور نے میری یہ حالت کی!

ایشور! تم پھول کے ساتھ کانٹا کیوں رکھ دیتے ہو؟ حسن دے کر من کو چنچل کیوں بنا دیتے ہو۔ میں نے حسین عورتوں کو اکثر چنچل ہی پایا شاید ایشور اس حکمت سے ہماری آزمائش کرتے ہیں۔ روح کو حسن کی آگ میں ڈال کر اسے چمکانا چاہتے ہیں۔ پر افسوس! نفسانیت ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ ہم اس آگ میں چمکنے کے بدلے جل جاتی ہیں!

یہ ٹپک کیسے بند ہو۔ جانے کس چیز کا کانٹا تھا۔ جو کوئی آ کے مجھے پکڑ لے تو کیا ہو۔ یہاں چلاؤں بھی تو کون سنے گا؟ ارے! یہ پتیاں کیوں کھڑکھڑا رہی ہیں؟ کوئی جانور تو نہیں آتا؟ نہیں ضرور کوئی نہ کوئی آ رہا ہے +

سمن کھڑی ہو گئی۔ اس کا جگر مضبوط تھا۔ وہ خوف پر غالب آگئی تھی +

رات بھیگ چکی تھی بسنت کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سمن نے ساڑی سمیٹ لی اور گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔ اُسے وہ دن یاد آیا۔ جب اسی موسم میں۔ اسی وقت وہ اپنے شوہر کے دروازہ پر بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی۔ کہ کہاں جاؤں۔ اسوقت وہ خواہشات کے جھکولے کھا رہی تھی۔ آج اس پر سکون باطن غالب تھا۔

یکایک اسکی آنکھیں جھپک گئیں۔ اس نے دیکھا۔ کہ سوامی گیانند مرگ چھالا اوڑھے میرے سامنے کھڑے میری طرف نگاہ رحم سے دیکھ رہے ہیں۔ سمن اُن کے قدموں پر گر پڑی۔ اور عاجزی سے بولی "سوامی! مجھے بچایئے"۔

سمن نے دیکھا۔ کہ سوامی نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بولے۔ "ایشور نے اسی لئے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ بولو کیا چاہتی ہو؟ دولت؟"

سمن۔ نہیں مہاراج دولت کی ہوس نہیں۔

سوامی۔ عزت؟

سمن۔ نہیں مہاراج۔ اسکی بھی خواہش نہیں۔

سوامی۔ اچھا تو سنو۔ ستیہ جگ میں آدمیوں کی مکتی گیان سے ہوتی ہے۔ دواپر میں بھگتی سے۔ ترتیا میں ستیہ سے۔ پر اس کلجگ میں اس کا صرف ایک راستہ ہے۔ اور وہ سیوا ہے۔ اس راستہ پر چلو گی۔ تو تمہاری مکتی ہو جائیگی۔ جو لوگ تم سے بھی بیکس۔ دکھی مصیبتوں کے مارے ہیں۔ اُن کی خبر لو۔ اور انکی دعائیں تمہارے آڑے آئیں گی"۔

سمن کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے یقین تھا۔ کہ میں جاگ رہی تھی۔ اتنی جلد سوامی جی کہاں غائب ہو گئے۔ دفعتہً اسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ سوامی جی درختوں کے سایہ میں لالٹین لئے کھڑے ہیں۔ وہ اٹھکر لنگڑاتی ہوئی انکی

طرف چلی۔ اس نے اندازہ کیا تھا۔ کہ سوامی جی مجھ سے ایک سو قدم کے فاصلے پر ہونگے پر وہ ایک سو کے بدلے دو سو تین سو چار سو قدم چلی گئی۔ اور وہ درختوں کا کُنج اور ان کے سایہ میں سوامی جی لالٹین لئے اتنی ہی دور کھڑے تھے!

سمن کو شبہ ہوا۔ کہ میں سو تو نہیں رہی ہوں۔ یہ خواب ہرگز نہیں ہے۔ اس نے زور سے چلا کر کہا۔ "مہاراج میں آتی ہوں۔ آپ ذرا ٹھہر جائیے"۔

اس کے کانوں میں آواز آئی۔ "چلی آؤ۔ میں کھڑا ہوں"۔

سمن پھر چلی۔ پر در سو قدم چلنے پر وہ تھک کر بیٹھ گئی۔ درختوں کا کُنج اور سوامی جی جوں کے توں اس سے ایک سو گز کے فاصلے پر نظر آتے تھے۔

دہشت کے مارے سمن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کا سینہ دھڑکنے لگا۔ اور پیر تھر تھر کانپنے لگے۔ اس نے چلانا چاہا پر مُنہ سے آواز نہ نکلی۔

سمن نے ہوش سنبھال کر خیال کرنا چاہا۔ کہ یہ کیا راز ہے۔ میں کوئی بھوتوں کا تماشہ تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔ لیکن کوئی دستِ غیب اسے اُسی طرف کھینچے لئے جاتا تھا۔

وہ پھر آگے چلی۔ اب وہ شہر کے قریب آ گئی تھی۔ اسے نظر آیا۔ کہ سوامی جی ایک کُٹی میں چلے گئے۔ درختوں کا کنج غائب ہو گیا۔ سمن نے سمجھا یہی سوامی جی کی کُٹی ہے۔ اسے اطمینان ہوا۔ اب سوامی جی سے ضرور ملاقات ہو گی۔ انہیں سے یہ حقیقت کھلے گی۔

اُس نے کُٹی کے دروازے پر جا کر کہا۔ "سوامی جی۔ میں ہوں سمن"۔

یہ کُٹی گجانند ہی کی تھی۔ پر وہ سوئے ہوئے تھے۔ سمن کو کوئی جواب نہ ملا۔

سمن نے کُٹی میں جھانکا۔ آگ جل رہی تھی۔ اور گجانند کمبل اوڑھے پڑے تھے۔

سمن کو حیرت ہوئی۔ کہ یہ تو ابھی چلے آرہے ہیں۔ اتنی جلد سو کیونکر گئے۔ اور وہ لالٹین کہاں چلی گئی۔ زور سے پکارا۔ "سوامی جی!"

سوامی جی اُٹھ بیٹھے اور تعجب سے سمن کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کون سمن؟"

سمن۔ ہاں مہاراج میں ہی ہوں +

گجانند۔ میں ابھی تمہیں خواب میں دیکھ رہا تھا +

سمن نے چکرا کر کہا۔ "آپ تو ابھی ابھی کُٹی میں آتے ہیں" +

گجانند۔ نہیں تو۔ مجھے سوتے بہت دیر ہوئی۔ میں تو کُٹی سے نکلا ہی نہیں۔ ابھی تمہارا ہی سپنا دیکھ رہا تھا +

سمن۔ اور میں آپ ہی کے پیچھے پیچھے گنگا کنارے سے چلی آرہی ہوں۔ آپ لالٹین لئے میرے سامنے چلے آتے تھے +

گجانند نے مسکرا کر کہا۔ "نہیں دھوکا ہوا" +

سمن۔ دھوکا ہوتا تو میں بلا دیکھے سنے یہاں کیسے پہنچ جاتی +

یہ کہکر سمن نے اس وقت کا ماجرا کہہ سنایا +

گجانند۔ ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو۔ ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے +

سمن۔ کوئی دیوتا تو نہیں تھے۔ جو آپ کی صورت بدلکر مجھے آپ کے پاس لائے ہوں +

گجانند۔ یہ بھی ممکن ہے۔ تم نے جو کچھ کہا۔ وہی میں ابھی خواب میں دیکھ رہا تھا۔ اور تمہیں سیوا دھرم کا اُپدیش کر رہا تھا۔ سمن۔ تم مجھے خوب جانتی ہو۔ میرے ہاتھوں تم نے بہت تکلیفیں جھیلی ہیں۔ تم جانتی ہو میں کتنی کمینہ طبیعت کا آدمی تھا۔ اب اُن بیرحمیوں کو یاد کرتا ہوں۔ تو چھاتی پر سانپ سا لوٹنے لگتا ہے۔ تم عزت کے قابل تھیں میں نے

تمہارے ساتھ ظلم کیا یہی ہماری مصیبتوں کا خاص سبب تھا۔ ایشور وہ دن کب لائیں گے کہ یہاں عورتوں کی قدر ہو گی۔ عورت میلے کچیلے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہن کر۔ آدھے پیٹ روکھی روٹی کھا کر۔ جھونپڑے میں رہ کر۔ محنت مزدوری کر کے۔ سب طرح کی مصیبتیں جھیلکر آرام سے زندگی بسر کر سکتی ہے۔ صرف گھر میں اسکی قدر ہونی چاہئے۔ اُس سے پریم ہونی چاہئے۔ عزت اور پریم کے بغیر کوئی عورت محلوں میں بھی سُکھ سے نہیں رہ سکتی لیکن اس وقت میری آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ تمہارے چلے آنے کے بعد جب سادھو مہاتماؤں کی صحبت سے میری آنکھیں کھلیں۔ تب مجھے اپنی عاقبت کی فکر ہوئی میرے پاس نہ گیان تھا۔ نہ علم تھا اس لئے میں نے اپنے بھائیوں کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہی راستہ میرے لئے سب سے آسان تھا۔ تب سے میں اسی راستہ پر چلنے کی کوشش کر رہا ہوں اس راستہ پر چلکر میرے دل کو راحت ملی ہے۔ اور میں تمہارے لئے بھی یہی راستہ سب سے بہتر سمجھتا ہوں۔ میں نے تمہیں بدھوا آشرم میں دیکھا۔ سدن کے گھر میں دیکھا۔ تم دل وجان سے خدمت کرنے میں مصروف تھیں۔ تمہارے دل میں رحم ہے۔ پریم ہے ہمدردی ہے۔ اور اس راستہ پر چلنے کے بھی یہی لوازمات ہیں۔ تمہارے لئے خدمت کا دروازہ کھلا ہے۔ وہ تمہیں اپنی طرف بُلا رہی ہے اس میں قدم رکھو۔ ایشور تمہارا کلیان کریں گے"۔

سمن کو گجانند کے چہرہ پر ایک روحانی جلال کا جلوہ نظر آیا۔ اس کے دل میں اُن سے باطنی ارادت پیدا ہوئی۔ بولی۔ "مہاراج میں آپ ہی کو اپنا گرو مانتی ہوں۔ میں اپنے تئیں آپ ہی کے سپرد کرتی ہوں۔ یہی عہد آپ سے میں نے ایکبار پہلے بھی کیا تھا۔ لیکن اپنی نادانی کے باعث اُسے پورا نہ کر سکی۔ وہ عہد میرے دل سے نہ نکلا تھا

آج میں سچے دل سے یہ عہد کرتی ہوں ۔

گجانند کو اس وقت سمن کے چہرہ پر خلوص باطن کی روشنی دکھائی دی۔ وہ بیتاب ہو گئے۔ وہ جذبات جنہیں وہ برسوں سے فنا کر رہے تھے۔ پیدا ہونے لگے۔ زندگی کی دلفریبیوں کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ انہیں اپنی موجودہ زندگی خشک۔ بے مزہ۔ ویران معلوم ہونے لگی۔ وہ ان ترغیبات سے کانپ اُٹھے۔ انہیں خدشہ ہوا۔ کہ اگر یہ خیالات میرے دل میں جاگزیں ہو گئے۔ تو میری برسوں کی عبادت اور عزلت دم زدن میں خاک میں مل جائے گی۔ وہ بول اُٹھے "تمہیں معلوم ہے۔ کہ یہاں ایک یتیم خانہ کھولا گیا ہے؟"

سمن۔ ہاں اس کا چرچا سنا تھا ۔

گجانند۔ اس یتیم خانہ میں زیادہ تر وہی لڑکیاں ہیں۔ جنہیں طوائفوں نے ہمارے سپرد کیا ہے۔ کوئی پچاس لڑکیاں ہونگی ۔

سمن۔ یہ سب آپ ہی کے اُپدیش کا نتیجہ ہے ۔

گجانند۔ نہیں۔ یہ پنڈت پدم سنگھ کی کارگزاری ہے۔ میں تو محض ان کا ادنٰی خادم ہوں۔ اس یتیم خانہ کے لئے ہمیں ایک سچے دل کی ضرورت ہے۔ اور وہ تمہیں میں ہے میں نے بہت تلاش کی۔ لیکن کوئی ایسی عورت نہ ملی۔ جسے اس کام سے سچا عشق ہو۔ جو ماں کی طرح لڑکیوں کی پرورش کرے۔ جو اپنی محبت سے انکی ماں بن جائے۔ وہ بیمار پڑیں تو انکی خدمت کرے۔ اُنکے پھوڑے پھنسیاں دیکھکر نفرت نہ کرے۔ اور اپنے حسن سلوک سے انکی ایسی اصلاح کرے۔ کہ انکی پُرانی ناہمواریاں مٹ جائیں۔ ایشور نے تمہیں فہم اور فراست دی ہے۔ تمہارے دل میں درد اور ایثار ہے۔ اور تمہیں

اس قرض کا بوجھ اُٹھا سکتی ہو۔ میری یہ عرض قبول کرو گی؟
سمن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ سوامی گجانند میری نسبت ایسا حسن ظن رکھتے ہیں اس خیال سے اس کا دل سرشار ہو گیا۔ اُسے خواب میں بھی امید نہ تھی۔ کہ مجھ پر اتنا اعتماد کیا جائے گا۔ اور میں ایسی عظیم الشان خدمت بجا لانے کے قابل سمجھی جاؤنگی۔ اُسے یقین ہو گیا۔ کہ پرماتما نے گجانند کی زبان سے یہ تحریک کی ہے۔ ابھی ایک لمحہ پہلے اگر وہ کسی لڑکے کو کیچڑ میں لپٹا ہوا دیکھتی تو اس کے قریب نہ جاتی لیکن گجانند نے اس پر اعتماد کرکے اس کے حس انکراہ کو مسخر کر لیا تھا ہم اپنے اوپر اعتماد کرنیوالوں کو مایوس کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ اور اکثر ایسے بوجھ اُٹھانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جنہیں ہم پہلے ناقابل برداشت سمجھتے تھے۔ اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔
سمن نے عاجزی سے کہا۔ "آپ لوگ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں۔ یہ میری عین خوش نصیبی ہے۔ میں کسی کے کچھ کام آسکوں۔ کسی کی کچھ خدمت کر سکوں۔ یہ میری دلی تمنا تھی۔ آپ کے معیار تک پہنچنا میرے لئے غیر ممکن ہے۔ لیکن میں اپنے مقدور بھر آپکے حکم کی تعمیل کرونگی"۔
یہ کہتے کہتے سمن کا سر جھک گیا۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسکی زبان سے جو کچھ نہ ہو سکا۔ وہ اس کے انداز نے ظاہر کر دیا۔ گویا وہ کہہ رہی تھی یہ آپکی شفقت ہے جو مجھ پر اتنا اعتماد رکھتے ہیں۔ کہاں مجھ جیسی گری ہوئی عورت اور کہاں یہ پاک خدمت! پرایشور نے چاہا تو آپ کو اس انتخاب کے لئے پچھتانا نہ پڑے گا۔
گجانند بولے۔ "مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی"۔
یہ کہکر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پو پھٹ رہی تھی۔ پپیہے کی رسیلی صدا کانوں میں

آرہی تھی۔ انہوں نے اپنا کمنڈل اُٹھایا اور گنگا اشنان کرنے چلے گئے +
سمن نے کُٹی سے باہر نکلکر دیکھا۔ جیسے نیند سے جاگ کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں۔ موسم کتنا سہاتا ہے۔ کتنا پرسکوں۔ کتنا فرحت انگیز! کیا اسکی آیندہ زندگی میں بھی سحر نمودار ہوگی۔ اس میں بھی کبھی صبح کی تنویر نظر آئیگی۔ کبھی آفتاب کی زریں شعاعیں چمکینگی؟

(۳۵)

ایک سال گزر گیا۔ پنڈت مدن سنگھ پہلے تیرتھ جاترا پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ سدن کے گھر آتے ہی وہ ایک دن بھی نہ ٹھہریں گے۔ سیدھے بدری ناتھ پہنچکر دم لیں گے۔ پر جب سے سدن گھر آگیا ہے۔ انہوں نے کبھی بھولکر بھی تیرتھ جاترا کا نام نہیں لیا۔ پوتے کو گود میں لئے آسامیوں کا حساب کرتے ہیں۔ کھیتوں کی نگرانی کرتے جاتے ہیں۔ ہوس نے اور بھی جکڑ لیا ہے۔ ہاں گھر میں بھاما کے سر سے اب فکر کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا ہے۔ اب اُسے پڑوسنوں کے ساتھ تبادلہ خیالات کرنے کے زیادہ موقعے ملتے ہیں۔ گھر کا کاروبار شانتا انجام دیتی ہے +

پنڈت پدم سنگھ نے وکالت چھوڑ دی۔ اب وہ میونسپلٹی کے چیرمین ہیں۔ اس کام سے انہیں طبعی مناسبت ہے شہر روز بروز ترقی کر رہا ہے۔ سال کے اندر ہی اندر کئی نئی سڑکیں نکل گئی ہیں۔ اور تین نئے باغ تیار ہو گئے ہیں۔ اب انکا ارادہ ہے۔ کہ یکہ اور گاڑی والوں کے لئے شہر کے باہر ایک محلہ بنوا دیں۔ شرما جی کے کئی پہلے کے دوست اب ان کے مخالف ہو گئے۔ اور کئی سابق کے مخالفین اب دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ مگر مہاشے بٹھل داس پر انکی عقیدت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ وہ

بہت چاہتے ہیں۔ کہ مہاشے جی کو میونسپلٹی میں کوئی منصب دیں۔ پر ٹھل داس اس پر راضی نہیں ہوتے۔ وہ بیغرض خدمت کے عہد کو توڑنا نہیں چاہتے۔ ان کا خیال ہے کہ صاحب منصب ہو کر میں شہر کی اتنی خدمت نہیں کر سکتا۔ جتنی الگ رہ کر۔ اُن کا بدھوا آشرم آج کل فروغ پر ہے۔ اور میونسپلٹی سے اُسے معقول امداد ملتی ہے۔ آج کل وہ مزارعین کی امداد کے لئے ایک فنڈ کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس سے کسانوں کو بیج وغیرہ کے لئے برائے نام سود پر روپیہ قرض دیا جائے۔ اس کار خیر میں سدن ان کا داہنا بازو بنا ہوا ہے +

سدن کی طبیعت اپنے گاؤں میں نہیں لگتی۔ وہ شانتا کو مکان پر چھوڑ کر پھر گنگا کنارے اپنے جھونپڑے میں آگیا ہے۔ اور اپنے کاروبار کو پھیلا رہا ہے۔ اس کے پاس اب پانچ کشتیاں ہیں۔ اور سیکڑوں روپیہ ماہوار نفع ہوتا ہے۔ اب وہ ایک اسٹیمر مول لینے کا ارادہ کر رہا ہے +

سوامی گجانند زیادہ تر دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ انہوں نے غربا کی لڑکیوں کی حمایت پر اپنے تئیں وقف کر دیا ہے۔ شہر میں آتے ہیں۔ تو دو چار دن سے زیادہ نہیں ٹھہرتے +

کاتک کا مہینہ تھا۔ پدم سنگھ سبھدرا کو گنگا اشنان کرانے لے گئے تھے۔ لوٹتی بار وہ علی پور کی طرف سے چلے آتے تھے۔ سبھدرا گاڑی کے جھروکوں سے جھانک رہی تھی کہ یہاں ایسے سناٹے میں کوئی کیونکر رہتا ہوگا۔ ان کا جی کیسے لگتا ہوگا۔ دفعتہً اسے ایک عالی شان عمارت نظر آئی۔ جس کے دروازہ پر جلی حروف میں یہ سائن بورڈ لٹک رہا تھا

"سیوا سدن"

سبھدرا نے شرماجی سے پوچھا "کیا یہی سمن بائی کا سیوا سدن ہے"؟

شرماجی نے انداز فکر سے کہا "ہاں" وہ پچھتا رہے تھے۔ کہ ناحق اس راستہ سے آیا سبھدرا اب ضرور یتیم خانہ دیکھنے جائے گی۔ مجھے بھی اس کے ساتھ جانا پڑے گا۔ بڑا پھنسا۔ شرماجی نے اب تک ایک بار بھی سیوا سدن کا معائنہ نہیں کیا تھا۔ گجانند نے بارہا چاہا۔ کہ انہیں یہاں کھینچ لائیں۔ پر وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی حیلہ کر کے ٹالدیا کرتے تھے۔ وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔ پر سمن سے دو بدو ہونا ان کے لئے غائت درجہ مشکل تھا۔ انہیں سمن کی وہ باتیں کبھی نہ بھولتی تھیں۔ جو اُس نے انہیں کنگن دیتے وقت پارک میں کہی تھیں۔ ان کے دل سے کبھی یہ خیال نہ دور ہوتا تھا۔ کہ ایسی پاک باطن نیک سیرت عورت میری ہی حماقت کے باعث گمراہ ہوئی۔ میں نے ہی اُسے کنوئیں میں گرایا۔

سبھدرا نے کہا "ذرا گاڑی رکواؤ۔ میں اسے دیکھونگی"۔

شرماجی۔ آج بہت دیر ہوگئی۔ پھر کبھی آجانا۔

سبھدرا۔ سال بھر سے تو آرہی ہوں۔ پر کبھی نہ آسکی۔ اب دروازہ پر آگئی ہوں تو دیکھ ہی کیوں نہ لوں۔

پدم سنگھ۔ تم خود نہیں آئیں۔ کوئی روکتا تھا۔

سبھدرا۔ بھلا جب نہیں آئی تب نہیں آئی۔ اب تو آئی ہوں۔ اب کیوں نہیں چلتے؟

پدم سنگھ۔ چلنے سے مجھے انکار تھوڑے ہی ہے۔ صرف دیر ہوجانیکا خوف ہے۔ نو بجتے ہونگے۔

سبھدرا۔ یہاں کون بہت دیر لگے گی۔ دس منٹ میں تو لوٹ آئیں گے۔

پدم سنگھ۔ تمہاری ضد کرنیکی بُری عادت ہے۔ کہدیا۔ کہ اس وقت مجھے دیر ہوگی لیکن

مانتی نہیں ہو +

سبھدرا۔ ذرا گھوڑا تیز کر دینا۔ کسر پوری ہو جائیگی +

پدم سنگھ۔ اچھا تو تم جاؤ۔ اب سے شام تک جب جی چاہے لوٹنا۔ میں چلتا ہوں۔ راستہ میں کوئی سواری کرایہ کر لوں گا +

سبھدرا۔ اسکی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم یہیں بیٹھے رہو۔ میں ابھی چلی آتی ہوں +

پدم سنگھ گاڑی سے اترتے ہوئے بولے۔ میں چلتا ہوں۔ تمہارا جب جی چاہے آنا +

سبھدرا اس ٹال مٹول کا باعث سمجھ گئی۔ اُس نے "جگت" میں کتنی بار "سیوا سدن" کی تعریف دیکھی تھی۔ پنڈت پربھاکر راؤ کی سیوا سدن پر خاص نظر عنایت تھی۔ اس لئے سبھدرا کو اس یتیم خانہ سے ایک تعلق خاطر ہو گیا تھا۔ اور دل میں وہ سمن کا بہت احترام کرنے لگی تھی۔ وہ سمن کو اس نئی حالت میں دیکھنا چاہتی۔ اُسے تعجب ہوتا تھا کہ سمن اتنی نیچے گر کر کیونکر روشن دل ہو گئی۔ کہ اخباروں میں اسکی تعریفیں چھپتی ہیں۔ گاڑی سے اُتر کر آشرم میں داخل ہوئی +

وہ جونہی برامدہ میں پہنچی۔ کہ ایک عورت نے اندر جا کر سمن کو اُس کے آنیکی اطلاع دی۔ اور ایک لمحہ میں سبھدرا نے سمن کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اس سادہ پوش سمن کو دیکھکر حیرت میں آگئی۔ اس میں نہ وہ نزاکت تھی۔ نہ وہ شوخی۔ نہ وہ عنابی۔ نہ وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ نہ وہ ہنستے ہوئے ہونٹ ملاحت اور شوخی کی جگہ متانت اور نفاست جھلک رہی تھی +

سمن قریب آکر سبھدرا کے پیروں پر گر پڑی۔ اور بہ چشم پُر آب بولی۔ "بہو جی آج میرے دھن بھاگ ہیں۔ کہ تمہیں یہاں دیکھ رہی ہوں" +

سبھدرا کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ اُس نے فوراً سمن کو اُٹھاکر سینہ سے لگالیا۔ اور رقت آمیز لہجہ میں بولی" باتی جی۔ آنے کو تو بہت جی چاہتا تھا۔ لیکن فرصت ہی نہ ملتی تھی"۔

سمن۔ شرما جی بھی ہیں یا اکیلے آئی ہو؟

سبھدرا۔ ساتھ تو تھے۔ پر انہیں دیر ہو رہی تھی۔ ایک دوسری گاڑی کرایہ کر کے چلے گئے"۔

سمن نے اداس ہو کر کہا" دیر کیا ہوتی تھی۔ انکی یہاں آنے کی طبیعت ہی نہیں تھی۔ میری بدنصیبی۔ افسوس صرف یہی ہے۔ کہ جس یتیم خانہ کے وہ خود بانی ہیں۔ اُس سے انہیں میرے ہی باعث نفرت ہے۔ میری دلی تمنا تھی۔ کہ ایک بار تم اور وہ دونوں یہاں آتے۔ آدھی تو آج پوری ہو گئی۔ دوسری آدھی نہ جانے کب پوری ہوگی۔ وہ میری زندگی کا مبارک دن ہوگا"۔

یہ کہکر سمن نے سبھدرا کو یتیم خانہ کی سیر کرانی شروع کی۔ عمارت میں پانچ بڑے کمرے تھے۔ پہلے کمرے میں کوئی پچیس تیس لڑکیاں فرش پر بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ اتالیقہ نے سبھدرا کو دیکھکر مصافحہ کیا۔ سمن نے دونوں کا تعارف کرایا۔ سبھدرا کو یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی۔ کہ یہ خاتون مسٹر رستم بھائی بیرسٹر کی بیوی ہیں۔ وہ روزانہ دو گھنٹے کے لئے یتیم خانہ میں لڑکیوں کو پڑھانے آیا کرتی تھیں۔

دوسرے کمرے میں بھی اتنی ہی لڑکیاں تھیں۔ انکی عمر آٹھ سے بارہ سال تک تھی۔ اس میں کوئی کپڑے کاٹتی تھی۔ کوئی سیتی تھی۔ اور کوئی اپنی قریب کی لڑکی کو چٹکیاں کاٹ رہی تھی۔ یہاں مدرسہ کے بجائے ایک بوڑھا درزی بیٹھا ہوا تھا۔ سمن نے لڑکیوں کے بنائے ہوئے کُرتے جاکٹ وغیرہ سبھدرا کو دکھائے۔

تیسرے کمرے میں پندرہ بیس چھوٹی چھوٹی لڑکیاں تھیں۔ پانچ سال سے

زیادہ کسی کی عمر نہ تھی۔ اُن میں کوئی گڑیاں کھیلتی تھی۔ کوئی دیوار پر لگی ہوئی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ سمن خود اس درجہ کی معلّمہ تھی +

اس کے بعد سمن نے اُسے باغیچہ کی سیر کرائی۔ یہاں کے گل بوٹے لڑکیوں ہی نے لگائے تھے۔ کئی لڑکیاں وہاں آلو گوبھی کی کیاریوں میں پانی دے رہی تھیں۔ انہوں نے سبھدرا کو ایک خوب صورت گلدستہ پیش کیا +

باورچی خانہ میں کتنی لڑکیاں بیٹھی کھانا پکا رہی تھیں۔ سمن نے سبھدرا کو ان لڑکیوں کے بنائے ہوئے اچار۔ مُربّے۔ سموسے وغیرہ دکھائے +

سبھدرا کو یہاں کا حسن انتظام۔ ترتیب۔ اور لڑکیوں کا سلیقہ اور اخلاق دیکھکر بڑی مسرت ہوئی۔ اس نے دل میں سوچا۔ سمن اتنے بڑے یتیم خانہ کا کیونکر انتظام کرتی ہے۔ مجھ سے تو ہرگز نہ ہو۔ کوئی لڑکی میلی یا غمگین نہیں نظر آتی +

سمن بولی "میں نے یہ بوجھ اپنے سر لے تو لیا۔ پر مجھ میں اس کے سنبھالنے کی قوت نہیں ہے۔ لوگ جو صلاح مشورے دیتے ہیں۔ اُنہیں پر عمل کرتی ہوں۔ آپ کو بھی جو کچھ عیب یا کمی نظر آئے۔ وہ بتا دیجئے۔ اس سے یتیم خانہ کی بھلائی ہوگی" +

سبھدرا نے ہنسکر کہا "بائی جی۔ مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں نے تو جو کچھ دیکھا ہے۔ اُسی پر حیراں ہوں۔ تمہیں کیا صلاح دونگی۔ بس اتنا ہی کہہ سکتی ہوں۔ کہ ایسا اچھا انتظام بدھوا آشرم میں بھی نہیں ہے" +

سمن۔ آپ تکلف کر رہی ہیں +

سبھدرا۔ نہیں سچ کہتی ہوں۔ میں نے جیسی اسکی تعریف سُنی تھی۔ اُس سے کہیں بڑھ کر پایا۔ ہاں یہ تو بتلاؤ۔ ان لڑکیوں کی مائیں کبھی انہیں دیکھنے بھی آتی ہیں؟

سمن۔ آتی ہیں۔ پر میں زیادہ آمدورفت نہیں ہونے دیتی ؎

سبھدرا۔ اچھا انکی شادیاں کہاں ہونگی؟

سمن۔ یہی تو بڑھی کھبر ہے۔ ہمارا فرض یہی ہے۔ کہ ان لڑکیوں کو خانہ داری کے قابل بنا دیں۔ قوم انکی قدر کریگی یا نہیں۔ یہ میں نہیں کہہ سکتی ؎

سبھدرا۔ بیرسٹر صاحب کی بیوی کو اس کام سے بہت پریم ہے کیا؟

سمن۔ یہ کہئے۔ کہ وہی اس یتیم خانہ کی روح ہیں۔ میں تو صرف اُن کے حکم کی تعمیل کرتی ہوں ؎

سبھدرا۔ کیا کہوں میں کسی قابل نہیں۔ ورنہ میں بھی یہاں کچھ کام کیا کرتی ؎

سمن۔ آتے آتے تو آپ آج آئی ہیں۔ اس پر شرما جی کو ناراض کر کے۔ شرما جی اب پھر آپکو اِدھر آنے ہی نہ دیں گے ؎

سبھدرا۔ نہیں ابکے اتوار کے دن میں اُنہیں ضرور لاؤنگی۔ بس میں لڑکیون کو پان بنانا اور کھا کر سونا سکھلایا کرونگی ؎

سمن (ہنس کر) اس کام میں آپ کتنی ہی لڑکیوں کو اپنے سے ہوشیار پائیں گی ؎

اتنے میں دس بارہ لڑکیاں خوشنما کپڑے پہنے ہوئے آئیں اور سبھدرا کے سامنے کھڑی ہو کر خوش الحانی سے گانے لگیں :-

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔ ہم بلبلیں ہیں اسکی وہ بوستاں ہمارا ؎
گودی میں کھیلتی ہیں جسکی ہزاروں ندیاں۔ گلشن ہے جسکے دم سے رشکِ جہاں ہمارا ؎

سبھدرا یہ نغمہ وطن سُن کر بہت محظوظ ہوئی۔ اور پانچ روپے لڑکیوں کو انعام دیئے ؎

جب وہ چلنے لگی تو سمن نے دردناک لہجہ میں کہا "میں اِس اتوار کو آپ کی راہ دیکھوں گی" ؎

سبھدرا۔ میں ضرور آؤں گی +

سمن۔ شانتا تو خیریت سے ہے ؟

سبھدرا۔ ہاں۔ خط آیا تھا۔ وہاں سب خیریت ہے۔ سدن تو یہاں نہیں آئے تھے ؟

سمن۔ وہ آئے تو نہیں۔ لیکن دو روپیہ ماہوار چندہ بھیجدیا کرتے ہیں +

سبھدرا۔ اب آپ بیٹھئے۔ میں چلتی ہوں +

سمن۔ آپ نے یہاں آکر مجھ پر بڑا احسان کیا +

سبھدرا۔ اور میں تو آپ کے درشنوں سے ترگئی۔ آپ کی سرگرمی۔ آپ کا حسنِ انتظام۔ آپ کی مروت اور اخلاق۔ کس کس کی تعریف کروں۔ آپ واقعی اپنی جنس کا سنگار ہیں +

سمن نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا۔ "میں تو اپنے تئیں آپ کی وہی لونڈی سمجھتی ہوں۔ میں جب تک جیونگی آپ لوگوں کا جس گاتی رہونگی۔ آپ لوگوں نے میری بانہہ پکڑ کر بچا نہ لیا ہوتا۔ تو اب تک میں کب کی ڈوب گئی ہوتی۔ پرماتما آپ لوگوں کو سدا خوش و خرم رکھیں" +

تمت بالخیر